دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں
ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی
APRIL
2013
PDFBOOKSFREE.PK
حیاتِ غالب
اندرونی صفحات پر
اس شمارے میں
☆ زندہ کہانی' آپ بیتیاں' جگ بیتیاں' جیتی جاگتی کہانیاں
☆ ''آتشِ جنوں'' سلیم فاروقی کے قلم سے
☆ ایک نیا ناقابلِ فراموش سلسلہ ''مکھنی'' ارشد علی ارشد کے قلم سے
☆ ''مسئلہ یہ ہے'' قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل

7 آگ — ناصر رضا

9 احوال — منزہ سہام مرزا

29 حیاتِ غالب — راجہ محمود

45 ماہِ گرفتہ — میجر (ر) امتیاز حسین

59 جس سے آتی ہو بوئے لہو — جاوید عثمان زندانی

73 شہید کی ڈائری — منزہ سہام

74 ردی والا — نسیم سحر

77 آتشِ جنوں — سلیم فاروقی

91 سِنو مین — تسنیم کوثر چیمہ

100 دو بوند پیاس — تمثیلہ زاہد

106 میرا مہربان رب — انیلہ امام بخش

109 ہوسِ زر — ممتاز احمد

119 وہ ایک بوجھ — نزہت جبیں ضیاء

124 خود پرستی سے جو نکلے — سید محمد ابو آزاد

131 دھوپ کے بعد چھاؤں — ام عادل

141 گھر کی بات — ثمرین ادریس

145 مجھے اونچا اڑنا ہے — شیخ معظم الٰہی

148 ماں تجھے سلام — محمد سلیم اختر

151 جن آنکھوں میں خواب..... — فاطمہ بلگرامی

168 گر کوئی عبرت پکڑے — وقاص حسین

178 مُردے کا ہاتھ — شازلی سعید مغل

182 سمندر کا کنارہ اور وہ — رابعہ بصری

187 اس گھر کو آگ — ارم زہرا

194 اک قیامت تھی وہ — محمد اقبال زمان

197 ذکر جل پری کا — قمر علی عباسی

208 جب تھک کے سو جاتی ہے ماں — نگہت اعظمی

212 مکھنی — ارشد علی ارشد

227 مسئلہ یہ ہے — ادارہ

235 MINI MAG — ادارہ

000 متفرقات — ادارہ/قارئین

# آگ

اِن دنوں ہماری زندگی فرقہ واریت اور دہشت گردی کی آگ میں بہت بری طرح سے جل کر بھسم ہو رہی ہے..... اس آگ نے سب کچھ جلا کر راکھ کر دیا ہے..... چہار سُو جلنے والوں کی فریاد و چیخیں اور بچ جانے والوں کے اپنے بچھڑ جانے والے پیاروں کے لیے بین اور آنسو ہیں۔

نجانے یہ کسی کی بددعا ہے یا پھر اوپر والے کا عذاب کہ..... ہم ''آگ'' لگانے والے بن گئے ہیں..... کسی بھی مسئلے پر احتجاج سے لے کر گھر میں ناراضگی تک کے معاملے میں سامنے آنے والی ہر شے کو آگ لگا دیتے ہیں، کچھ نہیں چھوڑتے، سب کچھ جلا دیتے ہیں.....!

کاش! اے کاش..... ان ''آگ'' لگانے والوں، ہر قسم کی ''آگ'' لگانے والوں کو کوئی یہ سمجھا دے کہ..... اس زندگی، اس جہاں کے بعد، آخرت میں بھی ایک آگ موجود ہے جسے 'جہنم' کہتے ہیں..... اور یہ آگ معصوم لوگوں پر ظلم کرنے والوں، قتل کرنے والوں کے لیے بھی بنائی گئی ہے!!

ناصر رضا

# احوال

## مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام قارئین کے درمیان

احوالیو! سچ پوچھیے' دل تو ایک عرصے سے بجھا ہوا' ہوا ہے..... انفرادی خوشیاں اجتماعی دکھوں کے سامنے ہیچ محسوس ہوتی ہیں..... زندگی کیونکہ انسان کے اپنے اختیار میں نہیں' شاید اسی لیے جیے چلے جا رہے ہیں۔ زخموں سے چُور تو میرا پورا پاکستان ہے مگر جو چرکہ 3 مارچ کو سانحۂ عباس ٹاؤن کی شکل میں لگا' وہ بہت تکلیف دہ ہے۔ ابھی تو سانحۂ کوئٹہ کے زخم ہی مندمل نہیں ہوئے تھے..... کہ یہ ایک اور زخم..... پہلے خط کی طرف بڑھنے سے پہلے ایک بار ضرور اُن تمام شہداء کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھیں جنہیں سفاک اور ظالم دہشت گردوں نے ہم سے دور کر دیا.....

اور اَب آغازِ ''احوال''.....

✉ عبدالعزیز جی آ' چکوال سے۔ ''اچھی ایڈیٹر صاحبہ! بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں اِگنور کیا۔ اللہ آپ کو اور توفیق دے اور مجھے صبر' آمین!''

☙ بھائی جی آ! آپ نے کیسے سوچ لیا کہ ہم اپنے اتنے پرانے احوالی کو اِگنور کریں گے۔ اصل میں آپ لوگوں کے کہنے پر ہم سچی کہانیاں کی طباعت کی تاریخ Reschedule کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ شمارہ آپ تک بروقت پہنچے لہٰذا خط ہم تک پہنچانے کی آخری تاریخ ہر ماہ کی 6 رکھ لیجیے۔ ہماری تو کوشش پوری ہے' اب یہ شہر پرامن رہے تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔

✉ سلیم اختر' راولپنڈی سے۔ ''عزیز منزہ بہن' آداب! خدا کرے آپ بہ خیریت ہوں۔ ''ماں جی'' کے حوالے سے ایک نظم اور ایک تحریر بھیج رہا ہوں۔ اگر مارچ کے شمارے میں شائع ہو جائیں تو بہتر ہے ورنہ اپریل میں سہی۔ دیگر خیریت ہے۔ 24 تاریخ کو ماں جی کا چہلم ہوگا۔ دعاؤں کا طالب! گاؤں سے واپسی پر فون کروں گا۔ سب کو سلام اور دعائیں۔''

☙ بھائی سلیم! سب خیریت ہے اور اللہ کرے' آپ بھی اچھے ہوں..... نظم اور تحریر دونوں شمارے میں شامل ہیں۔

✉ خلیل جبار' حیدرآباد سے۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ' السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ مارچ کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل پر پراسراریت نظر نہیں آئی' صرف کونے پر پراسرار کہانی نمبر لکھا ہوا تھا۔ کوشش کیا کریں کہ ٹائٹل پر کچھ ایسی چیز بھی لگا دیا کریں کہ قاری چونکے بنا نہ رہے اور جو سچی کہانیاں نہیں پڑھتے' وہ بھی

ٹائیٹل دیکھ کر پرچہ خریدنے پر مجبور ہو جائیں۔ اداریہ میں ناصر رضا صاحب نے انتہائی مختصر اداریہ لکھا ہے لیکن اس میں بہت بڑی بات کر دی ہے۔ سمندر کو کوزے میں بند کرنے والی بات کر دی ہے۔ بہت خوب ناصر صاحب' زندہ کہانی میں راجا محمود نے پیرانِ پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے زندگی کے واقعات کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ مضمون کے ساتھ اقوال بھی اچھے رہے۔ بشریٰ سعید احمد کی ''فلیٹ نمبر 104'' اچھی کاوش تھی۔ آخر تک سسپنس سے پُر رہی۔ آخر میں ہی یہ راز کھلا کہ مریم نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ روح اپنے اوپر سے خودکشی کا الزام غلط ثابت کرنے میں کامیاب رہی۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ نے ''شہید کی ڈائری'' میں اس بار بھی اچھا پیغام دیا ہے کہ ڈرتے رہنے سے بہتر ہے کہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے۔ گاؤں کے لوگوں نے ہمت کی اور جنگلی سوروں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ''دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر'' میں مینا تاج نے اس بار سڑکوں پر بیٹھے جعلی جادوگروں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ سادہ لوح انسانوں کو کس طرح سے بے وقوف بناتے ہیں۔ سلسلے وار ناول ''آتشِ جنوں'' کی قسط بھی اچھی رہی۔ 'ایک رات کی کہانی' نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ 'ہائے میری آنی' چوراہے کا صدقہ' حیاتِ ابدی' وہ کرشمہ ساز ہے اور خواب کی پکار زبردستی کی پراسرار کہانیاں بنائی گئی ہیں اس لیے ان کہانیوں نے مزا نہیں دیا۔ ''ہم رقص'' آصفہ ضیاء احمد کی اچھی تحریر تھی۔ ''یک جان' دو قالب'' سسپنس سے پُر اچھی کہانی تھی جس میں اپنے شوہر سے محبت کرنے والی بیوی جو حادثے میں ہلاک ہونے پر بھی شوہر کی تیمارداری اور اُسے کھلانے پلانے اس کی روح اسپتال آتی رہتی ہے جب اس کے شوہر پر یہ راز کھلتا ہے کہ اس کی بیوی مر چکی ہے تو وہ بھی انتقال کر جاتا ہے۔ ''جنگل کی بدروح'' کو ملک صفدر عباس اعوان نے تحریر کیا تھا۔ یہ کہانی ایک باہمت نوجوان کی کہانی ہے جو اپنے دوست کی لاش کو بدروح کے ہاتھوں سے بچالیتا ہے جو لاش کو کھانا چاہتی ہے۔ ''انتقام کی رات'' جسے کنول عمران خان نے تحریر کیا تھا' یہ ایک ایسی روح کی کہانی تھی جس نے اپنے قاتل کو ہلاک کر کے اپنا انتقام بالآخر لے ہی لیا۔ کاشی چوہان کی کہانی ''چاند اور خوشبو'' ایک اچھی تحریر تھی اور اینڈ بھی جاندار رہا' خاص کر آخری جملہ ''میں آ گیا ایک نئے روپ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنے کے لیے۔'' مون شاہ کی ''پرستان سے آئی ہم جولی'' ایک پری زاد کی کہانی تھی جو ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار تھی اور اُسے ناگ سے بچانے کو اپنی جان دے دیتی ہے۔ اس کی قربانی سے شیریں بچ جاتی ہے۔ یہ ایک انوکھی اور منفرد کہانی تھی اور اچھوتا خیال تھا۔ ''یہ بھی موجود ہیں'' علی صبا کی کہانی تھی جو ایک پراسرار حویلی کے متعلق کہانی تھی جس میں ایک چڑیل کا بسیرا تھا۔ ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' کی قسط بھی اچھی رہی۔ ''روح بھٹک رہی ہے'' میں اس بار ارم زہرا نے کالج کے ماحول کے حوالے سے کہانی لکھی ہے جو کالج کے موجودہ ماحول کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔ کہانی پراسراریت لیے ہوئی تھی۔ سر علیم اور سجاول کی روح کالج میں بھٹک رہی تھی۔ میرے شہر کی کہانی میں محمد اقبال زمان نے ''اسرار بھرا ہے یہ جہاں'' میں قبرستان سے متعلق اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ قبرستانوں میں اکثر ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں جنہیں عقل اور ذہن ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ ''ذکر جل پری کا'' قمر علی عباسی کے سفرنامے کی قسط نے دل خوش کر دیا۔ ''گماں بھی نہ تھا کہ وہ'' اس میں شانی خامان نے اپنی پیاری بہن ہوا خامان کے حوالے سے یادیں تحریر کی تھیں' یہ ان کے دل کی آواز تھی۔ ''تاشون'' اپنے اختتام کو بالآخر پہنچ گیا۔ شازلی سعید مغل اپنی کوشش میں کامیاب رہیں اور قارئین کو ایک اچھا ناول پڑھنے کو ملا۔ ان کی نئی تحریر کا انتظار رہے گا۔ عکاشہ سحر کی تحریر ''یاد کے

گہرے ساگر میں حبیب جالب'' اچھی رہی۔ محترم سہام مرزا صاحب کا اداریہ ''خواب'' اچھا اور آج کے دور کا بھرپور عکاس ثابت ہو رہا تھا۔ آج بھی وہی ہو رہا ہے جو 1996ء میں ہو رہا تھا۔ یہ اداریہ ہمیں سوچنے پر مجبور کر رہا ہے کہ ہم نے پاکستان کے قیام سے پہلے جو خواب دیکھا تھا' کیا یہی وہ پاکستان ہے؟؟''

خلیل بھائی! آپ کا پورا خط بنا کسی قطع و برید کے شائع کر رہے ہیں تاکہ لکھاریوں کو بھی اندازہ ہو کہ وہ کہاں تک کامیاب ہیں..... محفل میں آتے رہیے' بس ذرا آپ نئی تاریخوں کا خیال رکھیے گا۔

سنبل' کراچی سے۔ ''ڈیئر منزہ' اور پیارے ناصر بھائی' السلام علیکم! بفضل خدا' ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت کے لیے خدا تعالیٰ سے دعا گو ہوں اور سنائیں' آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کراچی کے حالات تو بہت خراب چل رہے ہیں' دل اور دلی کے حال کے مانند۔ خدا ہم پر رحم و کرم کریں' آمین! ایک پراسرار کہانی بھیج رہی ہوں' ٹھیک لگے تو لگا دیجیے گا۔ مہربانی ہوگی۔ ایک اس سے پہلے بھی بھیجی تھی اس کا کیا بنا؟ سنا ہے ایوارڈ کی تقریب ہونے والی ہے کب تک متوقع ہے؟ آپ آج کل دوشیزہ میں کچھ نہیں لکھ رہے کیوں؟ بھابی نے بھی ایک بڑا شاندار افسانہ دوشیزہ کو دیا تھا انہوں نے پھر کیوں نہیں لکھا۔ ان سے بھی کہیں کہ وہ لکھیں۔ اب اجازت دیں۔ اپنا خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔''

ڈیئر سنبل! یقیناً ہم کراچی والے جانتے ہیں کہ ہم کس کرب سے گزر رہے ہیں۔ تمہاری تحریر پراسرار نمبر ۱۱ میں لگے گی۔ کوشش پوری ہے کہ جولائی میں تقریب کر سکیں۔ حالات تو سب کے سامنے ہیں..... بھابی تم امی کو کہہ رہی ہو؟

مریم شاہ' سرگودھا سے۔ ''منزہ سہام صاحبہ' السلام علیکم! خدا تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ سوہنا پروردگار آپ پر ہمیشہ اپنے فضل و کرم اور رحمتوں کا نزول رکھے اور آپ کے من گھروندے کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے' آمین! مارچ 2013ء کا شمارہ اپنی تمام تر دلکشی اور خوب صورتی کے ساتھ ہمارے گھر وارد ہوا جس کی آمد نے سب کے چہروں پر رونق اور مسکراہٹ بکھیری اشتہارات کی رنگین خوب صورت وادیوں سے گزرتے ہوئے انکل ناصر کے اداریے پہ آن رکے اور چند لمحے یونہی ساکت رہ گئی۔ ہمارے چہرے پر جامد خاموشی اور گہرے سناٹے دیکھ کر کسی نے گھبرا کر جھنجھوڑ ڈالا۔ اسے کیا ہوا؟ آں ہاں' ہم چونک گئے' کچھ نہیں' بس ان لفظوں کی گہرائی میں اتر گئے تھے۔ اچھا تو پھر کیا سمجھ آیا؟ دوبارہ سوال ہوا..... یہی کہ خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی' نہ ہو جسے آپ خیال اپنی حالت کے بدلنے کا.....!! (اگر شعر غلط ہو تو معذرت)۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں پر ویسے ہی حکمران مسلط کرتے ہیں جس طرح کے وہ خود ہوں اور میرے خیال میں ہم لوگ جب تک خود کو نہ بدلیں گے' اپنے اخلاق و کردار کو اسلامی تعلیمات میں نہ ڈھالیں گے' تب تک یہ عذاب ہم پر مسلط رہے گا اور ہماری پستی و ذلت کا سفر جاری رہے گا۔ اب عوام کو ہوش آ گیا ہوگا ورنہ!! زندہ کہانی میں راجہ محمود صاحب غوثِ اعظم دستگیرؒ کی مختصر مگر جامع داستانِ حیات لے کر آئے' بہت اچھا لگا۔ ''شہید وطن'' بہت زبردست سلسلہ ہے اور یقیناً ''سچی کہانیاں'' اس کے بغیر نامکمل ہے' اب بات ہو جائے کہانیوں کی تو جناب' تقریباً سب کہانیاں اچھی ہیں۔ سندیسے سب ہی اچھے تھے۔ شفق شیکی جی' آپ کی دعاؤں کے پھول پہنچ گئے' بہت شکریہ اور ایسے ہی دعاؤں سے مہکنے کے لیے پھول آپ تک پہنچیں۔ سلیم انکل! آپ کی والدہ کے انتقال کی خبر پڑھی' بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو اس سانحہ کو برداشت کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے'

آمین! محسن سلیم انکل خدا تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی اور لمبی عمر عطا فرمائے' آمین! باقی سب احوالیوں کو بھی سلام اور ڈھیروں دعائیں۔ منزہ جی' میں نے دو عدد کہانیاں ارسال کی ہیں۔ کیا آپ کو مل گئی ہیں؟ میں نے آپ کو ایک نظم بھی بھیجی تھی' وہ قابلِ اشاعت ہے کہ نہیں؟ ناصر چاچو سے پوچھ کر بتائیے گا پلیز..... محترمہ رخسانہ سہام مرزا اور ناصر چاچو کی خدمت میں سلام بھی عرض کر دیجیے گا۔ اب اجازت دیں۔ اپنا خیال رکھیے گا اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا ہمیشہ خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں۔ اللہ نگہبان!''

بہت ہی سویٹ مریم! تمہاری کہانیاں اور شاعری جلد شائع ہو گی۔ جلدی جلدی اور کہانیاں ارسال کرو۔

✉ محمد اسلم آزاد لہڑی' بلوچستان سے۔ ''محترمہ باجی منزہ صاحبہ' سدا خوش رہو' آمین! السلام علیکم! بعد از خیریت احوال یہ ہے کہ تقریباً ایک سال کی غیر حاضری کے بعد آپ کے حال احوال اور ''سچی کہانیاں'' میں شامل ہونے کے لیے قلم اٹھا رہا ہوں جبکہ اس دوران میری پرانی کہانیاں شائع ہوئی یا نہیں؟ وہ تو میں نہیں جانتا البتہ میرے سامنے فروری 2013ء کا بہت خوب صورت شمارہ ہے۔ جس کی خوب صورتی اور دلکشی نے مجھے ایک بار پھر قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے اور میری آزاد نظم جو آپ نے بڑے اچھے انداز سے شائع کی تھی' اس کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنے اوپر واجب سمجھا کہ آپ نے اتنے عرصے کے بعد بھی ہمیں نہیں بھلایا اور ہماری غیر حاضری کے بعد جو آپ نے اور آپ کے اسٹاف نے سچی کہانیاں کو نئی جدت اور رونق بخشی ہے' وہ بھی قابلِ غور اور قابلِ تعریف ہے اور جن لکھاریوں کی کہانیاں شائع ہوئی ہیں' ان میں مینا تاج کی تحریر ''بے نام و نشان'' نازلی سحر صاحبہ کی ''دنیائے مزدور'' ریحانہ تنویر کی ''اندھی مامتا'' فاطمہ بلگرامی کی تحریر ''جن آنکھوں میں خواب'' بہت اچھی لگیں۔ ہمارے صوبہ بلوچستان کے بہت اچھے رائٹر ساحل ابڑو کی کہانی ''اس دوراہے پر'' بہت خوب صورت تحریر تھی۔ اس شمارے میں محترم جناب سلیم اختر کی کمی محسوس ہوئی جو پاکستان کے بہت ہی اچھے رائٹر ادیب ہیں۔ آخر میں ایک گزارش کرتا چلوں گا کہ ہمارا شہر ٹی سی ایس وغیرہ کی سہولت سے بے نیاز ہے اور اکثر اوقات ڈاک ڈیرہ اللہ یار' جیکب آباد یا کوئٹہ سے ٹی سی ایس کرنی پڑتی ہے اور وہاں سے ہی ڈائجسٹ منگوانا پڑتا ہے اس لیے فوری طور پر مارچ کے شمارے حال احوال میں شاید حاضر نہ ہو سکوں گا اس لیے ماہِ اپریل میں ضرور حاضری کا شرف دیں اور سالہا سالوں سے محبت پر کہانیاں افسانے' غزلیں لکھی جا رہی ہیں۔ اس مرتبہ محبت کی اپنی درد بھری کہانی ایک سچی کہانی کے حوالے سے ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ محبت کے اس دکھ درد سے بخوبی آگاہ ہوں گی جو اس تحریر میں عیاں ہے اور اس کو عام تحریر یا افسانہ سمجھ کر ٹھکرانے کی بجائے سچی کہانیاں کی زینت بخشیں گی۔''

بھائی اسلم! خوش آمدید۔ یہ آپ کی اپنی محفل ہے' جلدی جلدی آیا کریں۔ اتنے طویل وقفے اچھے نہیں ہوتے..... آپ کی تحریر ادارتی بورڈ کے پاس ہے' جلد اس پر فیصلہ ہو جائے گا۔ آپ اچھی امید رکھیے' سچی کہانیاں آپ کا اپنا ہی رسالہ ہے اور آپ کی کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔

✉ ساحل ابڑو' ڈیرہ اللہ یار' بلوچستان سے۔ ''باجی منزہ' السلام علیکم! باجی' یہاں ہر شاعر' ادیب' رائٹر اپنی دل کی بات کو کاغذ پر لکھ کر اسے امر کر دینے کے لیے مختلف رسالوں' ڈائجسٹوں' کتابوں تک پہنچا کر ایک سکون محسوس کرتے ہیں اور ہر قاری ان کی درد دل کی تحریر پڑھتا ہے اور اسے محسوس بھی کرتا ہے۔ ''سچی کہانیاں'' بھی ایک ایسا ادبی رسالہ ہے جس میں بہت سے بہترین لکھاری حضرات اپنے درد دل کی بات قارئین تک پہنچاتے

ہیں۔ میں کبھی کبھی ان حضرات کے احساسات جذبات کو اپنا ہی سمجھ بیٹھتا ہوں کیونکہ ان کی تحریروں میں حقیقی درد اور چاہت کا رنگ شامل ہوتا ہے۔ باجی منزہ اگر اِدھر اُدھر جھانک کر دیکھا جائے تو یقیناً ادب کی دنیا میں روشناس ہونے کے لیے سچی کہانیاں کی صورت میں ہر لکھاری کے لیے دروازہ کھلا ہے جس میں نئے لکھاری بھی روز بروز ''سچی کہانیاں'' میں حصہ لینے لگے ہیں۔ یہ وہ واحد ادارہ ہے جو ہر اچھی تحریر کا معیار شائع ہونے کے بعد قارئینِ کرام سے حتمی فیصلہ رائے سے ان رائٹرز کی تحریروں کو انعام کا حقدار ٹھہراتی ہے تو سچی کہانیاں ان کے دروازے پر دستک دے کر انہیں انعام سے نوازتا ہے جو ان کے لیے اعزاز کی بات ہے اور حوصلہ افزائی بھی۔ باجی منزہ، آپ کی اس طرح حوصلہ افزائی کے بعد نئے لکھاریوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا ہوتا ہے جس میں انہیں اپنی جھجک کو ختم کرنے کا ایک بہترین موقع میسر ہوتا ہے اور آگے چل کر یہی لکھاری اپنے معاشرے میں موجود بہت سی سماجی برائیوں، حالات اور اردگرد کی صورت حال پر ہمہ وقت اپنا کردار ادا کر کے سماج کی ذہنی و اخلاقی اقدار کو بلند کرنے میں حصہ دار بن جاتا ہے اور پھر دنیا دیکھتی ہے کہ وہ ایک مکمل انسان کے سانچے میں ڈھل کر ایک قابلِ تقلید مثال بن جاتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ جیسے ادارے کی مرہونِ منت ہوتا ہے۔ باجی منزہ! آج جمعۃ المبارک، یکم مارچ 2013ء کا تازہ شمارہ پراسرار کہانی نمبر سچی کہانیاں میرے ہاتھ میں ہے۔ خوب صورت ٹائٹل اور جگمگاتے ہوئے احوال میں پہنچا تو ماشاء اللہ یہاں کافی رائٹر خوش خوش نظر آرہے تھے اور خوش بھی کیسے نہ ہوتے جب ہمارے درمیان احوال میں جواب دینے والی باجی منزہ ہیں۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ زندگی تا حیات ہنستی مسکراتی رہے، ان کے سائے تک دکھ نہ آئے، آمین! سب سے پہلے احوال میں اپنا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی مگر خط کے نیچے دیئے گئے جواب کو پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ سلیم اختر صاحب کی والدہ جہاں حقیقی سے جا ملی ہیں تو اس غریب دل سے یہ دعا نکلی یا اللہ! اس ماں کو جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ یا اللہ! یہ وہ ماں ہیں جو ایک اچھے ادیب کو جنم دیا ہے، اس بیٹے کی انگلی پکڑ کر شفاف راستہ دکھایا، برائی کیا ہے، اچھائی کا سبق دیا، اسلام کی پہچان دی، یا اللہ! اس ماں کے بیٹے کو وہ خوشی دینا جو اسے اپنی ماں کی کمی محسوس نہ ہو۔ احوال کے بعد کہانیوں کی دنیا میں قدم رکھا تو سب سے پہلے راجہ محمود کا مضمون ''غوث اعظمؒ'' پڑھ کر دل کو راحت و سکون ملا کیونکہ یہ وہ ہستی ہیں سید عبدالقادر شاہ جیلانیؒ جن کی شان میں ساری زندگی تحقیق کر کے تحریر تخلیق کی جائے پھر بھی کم ہے۔ راجہ محمود، آپ کے خیالات بہت ہی اچھے ہیں جو نوجوان نسل کو ان بزرگانِ دین کی حیاتِ روشن سے آگاہ کرتے ہیں۔ بشریٰ سعید احمد کی تحریر ''فلیٹ نمبر 104'' بھی بہت اچھی لگی۔ منزہ سہام مرزا ''شہید کی ڈائری'' کو میں نے تین مرتبہ پڑھا، تب جا کے سمجھ میں آیا کہ منزہ سہام کیا کہنا چاہتی ہے۔ یقیناً ہمارے اندر ایسا جذبہ ہونا چاہیے جو ہماری نسل بہ نسل اس ملک و قوم کی آبرو کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس گندگی و برائی کے ڈھیر کو ہٹانے کی کوشش کرے تاکہ ان کی بدبو سے باقی معاشرے کو داغ نہ لگ جائے۔ مینا تاج ''دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر'' کہانی کے اندر بہت ہی اچھے کردار خوفناک انداز میں دھوکہ دیتے پڑھنے کو ملے۔ سلیم فاروقی ''آتش جنوں'' اس کہانی پر تو میں تبصرہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ گیارہ سال سچی کہانیاں سے دور رہا جو ''آتشِ جنوں'' کی دس قسط نہ پڑھ سکا۔ انشاء اللہ، کہیں نہ کہیں سے باقی قسط مل جائے گی تو پڑھ کر تبصرہ لکھنے کا لطف آئے گا۔ شمیمہ معین ''ایک رات کی کہانی'' مجھے زبردست اچھی لگی۔ حمیرہ فریدی ''ہائے میری آنی'' یہ بھی بہت دلکش دل کو بھائی گئی۔ عارف شین روہیلہ ''وہ ایک رات'' عنوان بھی خوب صورت اور کہانی کے اندر خوفناک منظر عارف شین میری

طرف سے اچھی کہانی لکھنے پر مبارک باد ہو۔ سیدہ تبسم زہرا رضوی ''چوراہے کا صدقہ'' جو بہت ہی مختصر سبق آموز کہانی تھی۔ فیض عالم نے وہ کام کر کے دکھایا جو اس ملک کے مچلتے ہوئے نوجوان کو کرنا چاہیے تھا۔ فیض عالم نے اپنی پوری زندگی غریبی مفلسی میں گزار کر وہ رقم جمع کی تھی کہ اسے دیدارِ مصطفیٰ ہو جائے لیکن فیض عالم کے دل میں ایک بات ہلچل مچا رہی تھی کہ کیوں نا' اس رقم سے یہ پل تعمیر کیا جائے جس کی وجہ سے ہزاروں افراد کی جانیں رائیگاں ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فیض عالم کے من کے اندر کی بات کو پسند کر لیا اور اسے دیدارِ مصطفیٰ ﷺ کی سعادت کی توفیق دی اور ان کی زندگی امر ہو گئی مگر یہ تو خواب تھا لیکن اللہ کی قسم اگر انسان حقیقی آرزوؤں کو اپنے دل کے اندر رکھ لے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ ان کا صلہ اسے ضرور ملے گا۔ سلیم اختر' آپ کی کہانی کا جو آخری پہلو تھا' مجھے بہت اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی پروازِ تحریر کو اور بلند کرے۔ سائرہ اکبر ''وہ کرشمہ ساز ہے'' اور صدف آصف ''خواب کی پکار'' بھی بہت اچھی کاوش تھی۔ آصفہ ضیاء احمد ''ہم رقص''، نسیم سحر ''یک جان دو قالب''، بہترین خیالات پڑھنے کو ملے۔ ملک صفدر عباس اعوان کی ''جنگل کی بدروح'' میں کافی خوف ناک واقعات سے آگاہ کیا گیا۔ یقیناً یہ کہانی مجھے بہت پسند آئی۔ کنول عمران خان' کاشی چوہان' مون شاہ' علی صبا کی بھی بہترین کہانی تھی۔ فاطمہ بلگرامی ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' سلسلہ وار کہانی کی میں بہت کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے اس کی بات سمجھ میں آجائے کیونکہ کافی قسط میری نظروں سے نہیں گزری۔ خلیل جبار کا تو میں فین ہوں' اپن کا دوست ہے' تو نہال۔ ارم زہرا' محمد اقبال' قمر علی عباسی' شانی خامان' شازلی سعید مغل کی تحریریں بھی بہت معیار پر تھیں۔ کہانیوں سے فارغ ہو کر جیسے ہی اوراق پلٹے تو ماہِ ربیع ثانی کا صفحہ پڑھ کر ایمان تازہ کیا۔ حبیب جالب کے بارے میں پڑھ کر کافی علم میں اضافہ ہوا۔ آپ کی ڈائری اور سلسلے بھی بہت اچھے چل رہے ہیں۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سچی کہانیاں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے اور پورے اسٹاف پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمیشہ برستی رہے۔ باجی منزہ' آپ کی خدمت میں ایک افسانہ ارسال کیا تھا اور آج احوال کے ساتھ ایک غزل بھیج رہا ہوں' اسے قریبی اشاعت میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں۔ اگر زندگی نے ساتھ دیا انشاء اللہ' احوال میں باتیں کرتے رہیں گے۔''

بھائی ساحل! کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ جو پیغام میں دینا چاہتی تھی وہ آپ نے سمجھا۔ ہم احوال میں ہمیشہ آپ کے منتظر رہیں گے۔

حافظہ مون شاہ' سرگودھا سے۔ ''محترمہ منزہ سہام' السلام علیکم! مالکِ کائنات سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ہمیشہ شاداں و مسرور رکھے آمین۔ پراسرار کہانی نمبر جاذبِ نظر سرورق اور زبردست سرپرائز کے ہمراہ موصول ہوا۔ اپنی کہانی شاملِ اشاعت پا کر بہت خوشی ہوئی اور بے ساختہ انکل ناصر رضا کے لیے تہہ دل سے دعائیں نکلیں۔ میں ان کی بے حد مشکور ہوں بس میں یاددہانی کے طور پر عرض کروں گی کہ انکل' میری صرف تین حصوں پر مشتمل کہانی کی اشاعت فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ مجھے شدت کے ساتھ انتظار رہے گا۔ گزارش ہے کہ اس کہانی کا عنوان نہ بدلا جائے۔ اب ذرا شمارے پر تبصرہ ہو جائے۔ انکل ناصر کا اداریہ بہت اچھا تھا جیسے کوزے میں دریا بند کر دیا جائے اس قدر مختصر مگر پراثر اداریہ تھا کہ دل نے حرف بہ حرف کی سچائی کی گواہی دی۔ راجہ محمود صاحب کے مضمون کو عقیدت کے ساتھ پڑھا۔ پیرانِ پیر غوث اعظمؒ کے حالاتِ زندگی نے قلب و جاں کو منور کر دیا بلاشبہ اولیاء کے قرب و ذکر میں بڑی سعادتیں اور رحمتیں ہیں۔ کہانیوں میں آصفہ ضیاء احمد اور ملک صفدر عباس کی

کہانیوں نے متاثر کیا حیاتِ ابدی محترم محمد سلیم اختر کی بہت خوب صورت کاوش تھی۔ کاشی چوہان، خلیل جبار، ارم زہرا، محمد اقبال زمان، عارف شین روہیلہ، صدف آصف، سائرہ اکبر، مینا تاج، حمیرا فریدی، سیدہ تبسم زہرا، علی صبا، نسیم سحر، ثمینہ معین نے بہت عمدہ اور دلکش لکھا۔ بھئی، مجھے تو سب ہی کی کہانیاں اس بار زبردست لگیں۔ ''شہید کی ڈائری'' تو شروع سے ہی قابلِ تعریف ہے۔ محمد سلیم اختر کی والدہ کی رحلت کا پڑھ کر دلی رنج ہوا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین! ہوا خامان کے بارے میں جان کر اچھا لگا لیکن ان کی ناگہانی موت کا دکھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر ہمیشہ اپنی رحمتیں نازل فرمائے، آمین۔ آخر میں بھائی ممتاز احمد اور محترم عبدالعزیز جی آسے فرمائش ہے کہ کوئی کہانی ہی لکھ ڈالیے اور ''سچی کہانیاں'' کی رونق میں اضافہ فرمائیں۔ میں آپ کو اپنی اسلامی شاعری بھیج رہی ہوں مہربانی فرما کر اسے شائع ضرور کیجیے گا۔''

بیاری حافظہ مون! خط لکھنے کا شکریہ۔ ناصر بھائی سے تمہاری طرف سے درخواست کردی ہے کہ تمہاری کہانی کا عنوان نہ بدلا جائے۔

سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے۔ ''قابلِ احترام آنٹی جان منزہ سہام، السلام علیکم! اسی امید کے ساتھ محفل میں آئی ہوں کہ ''سچی کہانیاں'' سے وابستہ ہر فرد اللہ کے فضل و کرم کے ساتھ بالکل ٹھیک اور خوش و خرم ہو گا۔ مارچ کا پراسرار نمبر ملا۔ ماڈل گرل کی آنکھیں پراسراریت کی اور بھی تائید کررہی تھیں۔ انکل ناصر رضا کا اداریہ ''المیہ'' حقیقت پر مبنی لگا۔ احوال میں تمام لوگوں کے خطوط پسند آئے، بالخصوص خلیل جبار بھیا اور انکل محمد سلیم اختر کے۔ زندہ کہانی میں راجہ محمود انکل، غوثِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی زیست کا احوال لے کر آئے، دل خوش ہوگیا۔ ایسی کہانیاں پڑھ کر روح سرشار ہوگئی۔ بشریٰ سعید کی ''فلیٹ نمبر 104'' بہت پسند آئی۔ قتل کبھی بھی چھپا نہیں رہتا۔ دو ماہ کے شدید انتظار کے بعد ''شہید کی ڈائری'' پڑھنے کو ملی، بہت اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو غازی کی زندگی اور شہادت کی موت عطا فرمائے، آمین۔ سڑک کہانی میں مینا تاج کی ''دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر'' پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ایسے لوگوں کی ذہنیت پر۔ انکل سلیم فاروقی کی ''آتش جنوں''، شمارے کی جان ہے۔ میں کیسے کروں اس کی تعریف؟ ثمینہ معین کی ''ایک رات کی کہانی'' پسند آئی۔ حمیرا فریدی کی ''ہائے میری آنی'' عارف کی ''وہ ایک رات''، سیدہ تبسم کی ''چوراہے کا صدقہ''، انکل سلیم کی ''حیاتِ ابدی''، سائرہ اکبر کی ''وہ کرشمہ ساز ہے''، صدف آصف کی ''خواب کی پکار''، آصفہ احمد کی ''ہم رقص''، نسیم سحر کی ''یک جان، دو قالب'' لاجواب تحریریں تھیں۔ ملک صفدر عباس کی ''جنگل کی بددعا'' پڑھ کر روح تک کانپ اٹھی۔ کنول عمران خان کی ''انتقام کی رات'' جو کرتا ہے، وہ بھرتا ضرور ہے۔ کاشی چوہان کی ''چاند اور خوشبو'' بہت پسند آئی۔ مون شاہ کی ''پرستان سے آئی ہم جولی'' پہلے انعام کی حقدار ہے۔ موبائل کہانیاں میں خلیل بھیا کی ''محبت کی ماری'' ویل ڈن خلیل بھیا! ارم زہرا کی ''روح بھٹک رہی ہے'' اچھی لگی۔ شازلی سعید مغل کی ''تاشون'' جہاں اپنے اختتام کو پہنچی، وہیں دل میں ایک گہری اداسی چھا گئی، ویل ڈن شازلی جی، چھوٹی لڑکی، بڑا کام۔ ''پسند اپنی اپنی'' میں سب ہی کے اشعار پسند آئے۔ ''خیال آرائی'' میں سب لوگوں نے اچھا لکھا۔ شانی خامان کی ''میری کہانی، میری زبانی'' پڑھ کر اچھا لگا۔ انکل عبدالعزیز، خلیل جبار، مور شاہد حسین بھیا، ممتاز احمد، آنٹی شگفتہ شفیق، صفیہ سجل شاہ، انکل محمد سلیم اختر، صائمہ سحر، رضوانہ کوثر، رابیل خان عطاری، صدام حسین کو بہت بہت سلام۔ تمام پڑھنے والوں کو دعا۔ محمد سلیم اختر کی والدہ کو اللہ جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ جو لوگ اس دنیا سے ناطہ توڑ گئے، اللہ ان کی بخشش فرمائے آمین۔ آنٹی،

میں نے پراسرار کہانی ارسال کی تھی' کیا وہ آپ کو مل گئی؟ اپنا خیال رکھیے گا' زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

ڈیئر سدرہ! سب سے پہلے تو شہید کی ڈائری پسند کرنے کا شکریہ..... کہانی مل گئی ہے' اب دیکھو کب باری آتی ہے۔ تمہیں کہانیاں اچھی لگیں' تمہاری مبارک باد احوال کے ذریعے لکھاریوں تک پہنچا رہے ہیں۔ خوش رہو۔

سلمٰی غزل' کراچی سے۔ ''محترم ناصر بھائی السلام علیکم! آپ سے فون پر بات کر کے ہمیشہ ہی خوشی ہوتی ہے سو آج بھی اچھا لگا۔ اللہ آپ جیسے مخلص اور خوش مزاج لوگوں کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان کے ساتھ ساتھ دین و دنیا کی دولت سے مالا مال کرے اور دین و دنیا کی تمام آسائشیں آپ کو میسر ہوں۔ افسانہ تو جلدی ہی بھیجوں گی ایک غزل حاضر خدمت ہے مناسب لگے تو جلدی لگا دیجیے گا۔ ناصر بھائی! آپ کے کہنے پر عنقریب ایک کہانی ارسال کروں گی مگر میں سوچتی ہوں' دو پہلے بھیج چکی ہوں' آپ زیر بار ہو جائیں گے اور میں بار بار آپ کو فون کر کے پوچھتی رہوں گی۔ بہر حال جلدی جلدی اسی لیے بھیج رہی ہوں کہ پتہ نہیں کب رختِ سفر باندھ لوں اور اپنے بیٹوں کے پاس چلی جاؤں امریکہ فی الحال تو ارادہ نہیں مگر ہم کیا اور ہمارے ارادے کیا۔ سب کچھ رب کریم پر منحصر ہے۔ منزہ سہام کو ڈھیر ساری دعائیں' ان کے بچے ماشاء اللہ بڑے ہو گئے ہیں' میں نے ایک مرتبہ ان کے آفس میں ملاقات کی تھی جب چھوٹے تھے' غالباً یہ 2007ء کی بات ہے اور اب گزشتہ کسی میگزین میں اب دیکھا تو ماشاء اللہ' خوب قد و قامت نکالا ہے۔ اب اجازت دیجیے ان دعاؤں کے ساتھ کہ اللہ آپ کے صاحبزادوں کو زندگی اور صحت عطا فرمائے اور دنیا کی ہر آفت و بلا سے محفوظ رکھے۔''

بہت ہی پیاری سلمٰی! آپ کی بھیجی گئی دعائیں میں نے اپنے پلو میں باندھ لی ہیں۔ یہ وہ خزانہ ہے جو نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔ آپ کی ارسال کردہ کہانیاں جلد شائع کی جائیں گی۔

نسیم سحر' کراچی سے۔ ''محترم ناصر رضا صاحب' السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے گو کہ آپ کے حلقہ اپنائیت میں شامل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر آپ سے ایک دو دفعہ فون پر بات کر کے ایسا لگا کہ بہت عرصے سے آپ سے واقف ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ آج کے دور میں اتنی محبت اور اپنائیت کسی میں موجود ہے بہر حال ایک کہانی پیش خدمت ہے امید کرتی ہوں پسند آئے گی اور شمارے میں جگہ پائے گی۔ آپ کے علاوہ کسی ٹیم ممبر سے واقف نہیں پھر بھی آپ اور آپ کے شمارے کے سب ہی افراد کے لیے صحت اور زندگی کے ساتھ ڈھیروں خوشیوں کی دعائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے' آمین۔''

سوئیٹ سحر! خط تم نے ناصر بھائی کو لکھا تھا لہٰذا جواب بھی انہی سے پوچھ کر دے رہی ہوں' کہانی اچھی ہے' انشاء اللہ' جلد شائع ہو گی۔

تحسین جونیجو' بورڈی خیر پور ناتھن شاہ سے۔ ''پیاری آپی جان منزہ' السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بمع اسٹاف خیریت سے ہوں گی۔ اداریہ ''المیہ'' بالکل صحیح ہے۔ آپی! ذرا اپنی فینچی صاحبہ کو آرام فرمانے دیں ناں' تب تک ہم کچھ باتیں شیئر کر لیں۔ آخر کیوں اپنا خون جلاتی ہو' یہ امی کی آواز ہوتی ہے جو ہر ماہ میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ اس ماہ خط نہیں لکھو گی تو کیا کھانا ہضم نہیں ہو گا' یہ آپی کی آواز ہوتی ہے مگر میں بھی ڈھیٹ کی ڈھیٹ ہوں۔ خط تو میرا اگلے جہاں سے بھی آیا کرے گا' اس کا جواب ہے کسی کے پاس؟ گزشتہ ماہ کتنے ارمانوں سے خط لکھا لیکن جب مارچ کا شمارہ جلد ہی ہاتھوں میں آ گیا یعنی 25 فروری کو جس تو مجھے تھا ہی کہ کہیں میرا نام و

نشان تو غائب نہیں ہو گیا' جلدی آنے کی وجہ سے یقین کریں گی اس وقت پلکیں بھیگ گئی تھیں' کتنی محبت و محنت سے لکھا جو کہ شاید محکمۂ ڈاک والوں کو پسند آ گیا ہوگا۔ اپنی محبت تو وہی ہے اور اپنے سچی کہانیاں پر بھی اعتماد ہے کہ اس کی محبت بھی کم نہیں پڑے گی' یقیناً کوئی مجبوری رہی ہوگی ورنہ یہ اتنے سنگدل نہیں ہو سکتے ناں۔ اب بات شمارے کی۔ ویلکم بیک آپی! اور کہانیوں میں اس بار راجہ محمود لے کر آئے پیرانِ پیر دستگیر بادشاہ پیر حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کی شان میں ہمارا عقیدت بھرا سلام۔ عشرۂ غوث پاک کی مناسبت سے۔ ان کی تعریف احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ آصفہ ضیاء احمد کی ''ہم رقص'' ہوا سے رقص کرتی ہوئی تتلیاں جیسی بے حد خوب صورت لگی۔ ''پرستان سے آئی ہجولی'' مون شاہ نے تو حقیقتاً پرستان کی سیر کروا دی۔ واپسی میں کچھ وقت تو لگے گا ناں۔ واہ جی' خواب نگر سے لوٹتے ہیں۔ انتہائی حسین خواب مزہ آ گیا۔ شیریں اور ماروی دونوں ایک کردار ٹھہرے مگر حقیقت میں بھی ایسے کرداروں سے واسطہ پڑا ہے۔ ''یک جاں دو قالب''، نسیم سحر کی احتشام اور نبیلہ کی سچی محبت بہت افسردہ کر گئی۔ ''جدائی تو مقدر ہے'' ایسی لازوال محبت پر رونا آیا۔ سائرہ اکبر کی ''وہ کرشمہ ساز ہے'' ایک مسحور کر دینے والی لاجواب تحریر جیسے وقت ٹھہر جائے۔ احمد علی بہت نیک انسان کہ ایسے لوگ کم ہی ملتے ہیں۔ شمیمہ معین کی ''ایک رات کی کہانی'' تازگی بخشنے والی دل فریب کہانی نے بہت لطف دیا۔ بشریٰ سعید کی خاص کہانی ''فلیٹ نمبر 104'' واقعی خاص رہی۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی۔ مزیدار کہانی رہی۔ حمیرا فریدی کی ''ہائے میری آنی'' اس میں شبہ نہیں کہ جنات انسانوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ دل سوز کہانی رہی۔ ''وہ ایک رات'' عارف شین روہیلہ کی جنات کے وجود کے متعلق یہ یاد دہانی کروائی گئی کہ جنات کا وجود رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ پیاری تحریر رہی۔ محمد سلیم اختر انکل کی ''حیات ابدی'' ایک روح پرور ساکت کر دینے والے لمحات ٹھہرے۔ خلیل جبار کی ''محبت کی ماری'' تجسس بھری سبق آموز کہانی رہی۔ کاشی بھائی کی ''چاند اور خوشبو'' بھی ایک اچھوتی کہانی رہی۔ ''گماں بھی نہ تھا'' شانی خامان ''کچھ یادیں'' لے کر آئی۔ ہوا خامان کی ''جو آنکھیں نم کر گئی'' زندگی کے دورخ ایسے بھی ہیں۔ انسان بھی کیا چیز ہے یا تو اندر کا بچہ مر جاتا ہے یا انسان خود..... ''چوراہے کا صدقہ'' سیدہ تبسم زہرا رضوی کی بھی سبق آموز کہانی اچھی لگی۔ شازلی سعید مغل ''تاشون'' کے مکمل ہونے پر مبارک باد۔ اچھی آپی شگفتہ شفیق' آپ سے بات کر کے بہت خوشی ہوئی۔ دعا کی عادت میں آپ کا نام بھی سرفہرست ہے۔ اللہ پاک آپ کو جلد صحت یاب فرمائے' آمین۔ وفا صدام حسین غازی تینو بہت شکریہ ویسے آپ کے نام میں سے کچھ کم نہیں ہو سکتا۔ کافی طویل ہے؟ کوثر سعید آپی! اب طبیعت کیسی ہے؟ دعاؤں کے خزانوں میں آپ بھی شامل رہتی ہیں۔ محسن سلیم انکل کے لیے صحت یابی کی دعا۔ سلیم اختر انکل' اللہ پاک آپ کی والدہ کی مغفرت فرمائے' آمین۔ اچھا آپی' اب اجازت۔''

بھ ڈیئر حسین! دیکھو تمہارے کہنے کی دیر تھی اور ہم نے قینچی کو مکمل آرام دے دیا۔ کہانیوں پر مفصل تبصرہ اچھا لگا۔ کوشش کر رہے ہیں کہ سچی کہانیاں ہر ماہ کی 12 تاریخ تک مارکیٹ ہو جائے۔ یعنی خط لکھنے کی آخری تاریخ 6 اور 7 قرار پائی..... مگر افسوس ہے کہ کراچی شہر کے حالات مقصد میں کامیابی سے دور کر دیتے ہیں..... دعا کرو ہمارے ملک کے معاملات اچھے رہیں..... بہت بڑی نعمت ہے جس کی شاید ہم قدر نہیں کر رہے ہیں۔ ہڑتالیں' احتجاج' سوگ' فائرنگ' جنازے ان سب کے بعد انسان کے لیے جیے اور پھر خوش بھی رہے..... بس اللہ ہم سب پر رحم فرمائے' آمین۔

✉ عمران مظہر' ژوب سے۔ ''محترمہ منزہ آپی' اینڈ سوئیٹ سر ناصر رضا' السلام علیکم! امید ہے کہ آپ دونوں اور رسالے کا تمام اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ میں کسی کام کے سلسلے میں ڈی آئی خان گیا ہوا تھا تو وہاں سچی کہانیاں مل گیا۔ سوچا' اس بار حاضری لگوائی جاسکتی ہے' سو فوراً خرید لیا اور واپسی کے سفر میں سارا رسالہ چاٹ ڈالا۔ سرورق پر اسرار کہانی نمبر کی تھیم کا ٹھیک نمونہ تھا۔ اداریہ میں ناصر سر نے ایک شعر کی مدد سے ہمارا المیہ اچھے طریقے سے بیان کیا یقین کریں' احوال مجھے بہت پھیکا پھیکا لگتا ہے کم از کم احوال میں تھوڑا بہت تڑکا تو ضرور ہونا چاہیے۔ ارے! میری کہانی پہ انعام..... مجھے امید تو نہیں تھی لیکن بس اب جلدی سے بھیجیں۔ انتظار رہے گا۔ مجھے اس نمبر میں جو کہانیاں بہترین لگیں وہ ہیں غوث اعظمؒ۔ راجہ محمود' پرستان سے آئی ہم جولی۔ مون شاہ' چاند اور خوشبو۔ کاشی بھائی اور حیاتِ ابدی۔ محمد سلیم اختر۔ اس کے علاوہ ''فلیٹ نمبر 104'' بشریٰ سعید بھی فلمی انداز لیے اچھی کہانی تھی۔ مون شاہ کی کہانی افسانوی لگی لیکن انہوں نے رومانٹک تھیم کا استعمال بہت زبردست کیا۔ وہ ایک رات' عارف شین روہیلہ' ہم رقص' آصفہ ضیاء اور جنگل کی بدروح' ملک صفدر عباس اعوان' یہ تین کہانیاں حقیقت سے بہت دور لگیں۔ 'اسرار بھرا ہے یہ جہاں' اقبال زمان' ان کی گزشتہ تحریروں سے بہتر رہی جبکہ 'روح بھٹک رہی ہے' (ارم زہرا)' اور 'دیتے ہیں دھوکہ یہ' (مینا تاج) زیادہ متاثر نہ کرسکیں۔ اس کے علاوہ باقی تین کہانیاں کچھ نہ کچھ حقیقت سے قریب لگیں۔ تمام لکھنے والوں کی کوشش اچھی رہی۔ پسند' ناپسند میری ذاتی رائے ہے۔ شانی خامان کو ایک عرصے بعد دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ شانی صاحبہ' اب آتی رہیے گا۔ ہوا خامان کے واقعے میں کچھ تشنگی رہ گئی۔ مستقل سلسلے سارے بہترین ہیں سوائے خیال آرائی کے۔ پتا نہیں' وہ میں کیوں نہیں پڑھتا؟ سچی کہانیاں پڑھنے والے قارئین سے ایک درخواست تھی کہ اگر کسی کے پاس سچی کہانیاں کے وہ پرانے شمارے موجود ہوں جن میں ماریہ عرفان صاحبہ کی تحریریں تھیں تو ناصر سر کی معرفت مجھ سے رابطہ کریں' مجھے ان شماروں کی ضرورت ہے۔ آخر میں سب سے یہ کہنا ہے کہ پلیز' صدقہ وغیرہ کیا کریں' اس سے بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ ناصر سر کو خصوصی سلام کہیے گا۔ ان کی محبتوں کے قرض ہم کبھی نہیں چکا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی والدہ کو صحت عطا کرے۔ آمین! ہر بیمار کے لیے دعا کیجیے گا۔ کاشی بھائی' راجہ محمود اور قیوم صاحب کو بھی سلام کہیے گا۔ لکھائی خراب ہو رہی ہے کیونکہ جلدی میں لکھ رہا ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔''

بھ بھائی عمران! آپ کی تو خراب لکھائی بھی بہت اچھی ہے۔ پھر اچھی لکھائی کیسی ہوگی؟ کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ..... آپ کا سلام سب تک پہنچا دیا گیا ہے اپنا خیال رکھیے گا۔

✉ نازیہ بتول رضا' کراچی سے۔ ''محترم ناصر رضا اور منزہ جی' السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ ہمارا شہر کراچی جس آگ میں جل رہا ہے' وہ آگ ہمارے دلوں کو جلا رہی ہے۔ ہر دن کا نیا سورج بھی سہما سہما کانپتے ہوئے طلوع ہوتا ہے کہ نہ جانے آج میری روشنی میں کتنے گھروں کے چراغ بجھنے والے ہیں۔ نہ جانے کتنے معصوم بچے یتیم ہونے والے ہیں۔ نہ جانے کتنی سہاگنوں کے سہاگ اُجڑنے والے ہیں۔ مائیں ڈرتے دل کے ساتھ لبوں پر دعائیں سجائے اپنے بیٹوں کو رخصت کرتی ہیں۔ نہ جانے شام کو دوبارہ زندہ سلامت دیکھ پائیں گی کہ نہیں؟ آہ! یہ روشنیوں کے شہر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ یہ برقی قمقموں سے روشن شہر اب آگ سے روشن رہنے لگا ہے۔ اس کے باسی کیوں ہر دم سہمے سہمے رہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب نہ آپ کے پاس ہے اور نہ ہی میرے پاس۔ ہاں لیکن سچے دل سے نکلتی دعائیں ہیں جو آپ اور ہم ہر دم اپنے وطنِ عزیز کے

لیے مانگتے ہیں۔ یارب! ہم بہت گناہ گار سہی لیکن تو تو غفار ہے۔ رحمٰن ہے۔ رحیم ہے۔ ہم پر رحم فرما اور ہمارے وطنِ عزیز کو امن کا گہوارہ بنا' آمین۔ ''احوال'' میں کافی عرصے سے شرکت نہیں کر سکی لیکن ''سچی کہانیاں'' سے جو رشتہ استوار ہے وہ قائم رہا۔ مارچ کا شمارہ آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ساری کہانیاں زبردست تھیں۔ میری ایک کہانی آپ کے پاس موجود ہے اور دوسری ارسال کر رہی ہوں۔ اس کے علاوہ ملک کے حالات پر ایک شاعری بھی بھیج رہی ہوں۔ پسند آئے تو شائع کر دیجیے گا۔ آپ سے اور تمام قارئین سے التماس ہے میری صحت و تندرستی کے لیے دعا کریں۔ اللہ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے' آمین۔''

نازیہ! ہر دردمند دل موجودہ حالات میں دکھی ہے..... پریشان ہے..... خوف زدہ ہے..... مایوسی کفر ہے لہٰذا اپنے رب سے ہم سب مل کر دعا کرتے ہیں اللہ ہم پر اور ہمارے وطن پر رحم فرمائے..... کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ..... تمہاری ارسال کردہ کہانی اور نظم مل گئی ہے۔ محفل میں پابندی سے حاضری لگوایا کرو۔

## خصوصی خط

عبدالرؤف تاجور' کراچی سے۔ ''ڈیئر آپا جان! پراسرار کہانی نمبر خاصا دلچسپ ثابت ہوا۔ شروع کیا تو بس پڑھتا ہی چلا گیا۔ مبارک باد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اگلا شمارہ اس سے بھی بہتر ثابت ہوگا۔ اب ایک تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ غور کر لیجیے شاید کہ پسند آجائے۔ جب بھی پراسرار کہانی نمبر نکالنے کا ارادہ ہو تو اردو کے سدا بہار کلاسیکل خزانے سے ایک کہانی تبرکاً ضرور شامل کر لیا کیجیے گا۔ گزشتہ صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں مسز عبدالقادر کی پراسرار کہانیوں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کی کتاب ''لاشوں کا شہر'' آپ کی نظر سے بھی گزری ہوگی۔ اسی طرح طلسم ہوشربا' قصہ چہار درویش اور انشاء جی مرحوم کی ترجمہ کی ہوئی اور ہنری کی کہانیوں میں سے کوئی ایک! اس تجویز کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے نئے لکھنے والوں کو پتہ چل سکے کہ ان سے پہلے پراسرار کہانی لکھنے کا ٹرینڈ کیا تھا۔ آخر میں ایک گزارش ہے کہ پراسرار کہانی نمبر میں شامل ہونے کے لیے میں نے بھی ایک کہانی ''پانچواں کلہڑ'' بذریعہ رجسٹری بھیجی تھی' براہِ کرم صرف اتنا بتا دیجیے کہ یہ کہانی کیوں نہیں چھپی۔ بے حد ممنون ہوں گا۔

بھیا رؤف! آپ کو کہانیاں اچھی لگیں یعنی محنت وصول ہوئی..... آپ کے مشورے کے حوالے سے یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم لیڈی عبدالقادر کی تقریباً تمام ہی کہانیاں گزشتہ سالوں میں شائع ہونے والے پراسرار نمبرز میں شائع کر چکے ہیں اور ہاں! آپ کی کہانی ''سچی کہانیاں'' کے پراسرار نمبر II میں شامل ہوگی۔

پھر ملیں گے گر خدا لایا

منزہ سہام

راجہ محمود

# حیاتِ غالب

مرزا غالب کا خیال

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

**شاعرِ بے مثال' سخن ور باکمال مرزا اسد اللہ خاں غالب کی زیست کے چند اوراق**

گیارہ برس کی عمر بھی بھلا کوئی عمر ہوتی ہے' یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب بچہ شعور کی ابتدائی منزلوں میں قدم رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلنا شروع ہوتی ہیں' وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے آشنا ہونے لگتا ہے۔ ایک نئی' عجیب اور رنگین دنیا کے مظاہر اس کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں اور وہ ان رنگینیوں میں گم ہو کر خود سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ سوچ' فکر اور خیالات سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا مگر اس گیارہ سالہ بچے نے خیالات کی دنیا میں گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے تھے۔ وہ شعر کہنے لگا تھا اور وہ بھی اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ سعدیؒ عمر و خیام کی زبان فارسی میں! اس نے چند شعر فارسی میں موزوں کیے اور اپنے استاد کے سامنے رکھ دیئے۔ شعروں میں ''کہ چہ'' کی ردیف استعمال کی گئی تھی۔ استاد بھی

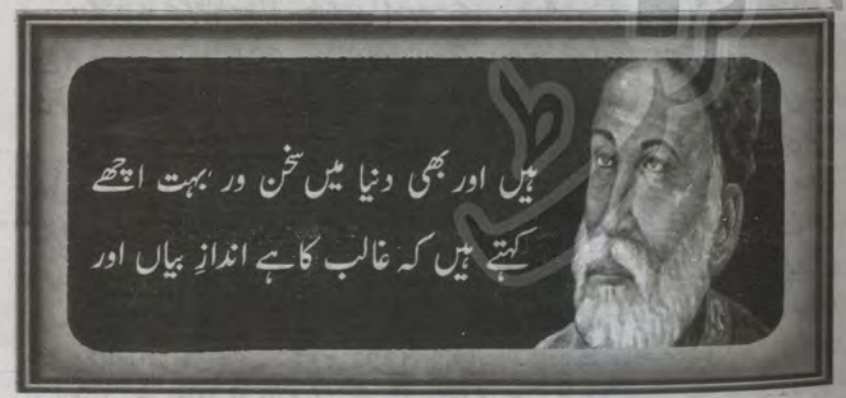

کوئی معمولی شخصیت نہیں تھے۔ آگرے کے نامی گرامی معلموں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ استاد شیخ معظم نے اپنے اس کم سِن شاگرد کے شعر سنے اور قدرے ناگواری سے کہا۔

''یہ کیا مہمل ردیف استعمال کی ہے؟ بہتر ہے' ایسے بے معنی شعر نہ کہو' اس سے کچھ فائدہ نہیں۔''

استاد کی بات پر وہ بچہ خاموش رہا۔ ایک روز وہ اس وقت کے معروف شاعر ملا ظہوری کے کلام کا مطالعہ کر رہا تھا کہ چونک پڑا اور پھر دوڑا دوڑا استاد کے پاس پہنچا اور انہیں وہ شعر دکھایا جس میں شاعر نے ''کہ چہ'' کی ردیف استعمال کی تھی جو ''یعنی چہ'' کے معنی میں استعمال ہوئی تھی۔ استاد شعر دیکھ کر حیران رہ گئے اور کچھ لمحے کے توقف کے بعد شاگرد سے گویا ہوئے۔

''تم کو فارسی زبان میں خداداد صلاحیت ہے' تم ضرور شعر کہا کرو۔ اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو قطعی پروانہ کرو۔''

استاد کی حوصلہ افزائی ملی تو بچے میں شعر گوئی کا شوق جلا پانے لگا۔ یہی وہ بچہ تھا جس کے اشعار سن کر ایک بار خدائے سخن میر تقی میر جیسے شاعر نے کہا تھا۔

''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اُس نے اس کی درست رہنمائی کی تو ایک دن یہ لاجواب شاعر بنے گا ورنہ مہمل اور لایعنی شعر بکنے لگے گا۔''

میر کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ یہ بچہ واقعی ایسے لاجواب شاعر کے روپ میں ابھرا کہ دنیا اسے ''غالب'' کے نام سے جانتی ہے۔ اس کی شاعری کا سحر آج دو صدیوں بعد بھی اسی طرح ایک عالم پر چھایا ہوا ہے۔

مرزا اسداللہ خاں غالب 27 دسمبر 1797ء بمطابق ماہِ رجب ۱۲۱۶ھ ہجری کو عبداللہ بیگ کے گھر پیدا ہوئے۔ مرزا کے آباؤ اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور سپہ گری ان کا آبائی پیشہ تھا۔ ترکوں کی یہ قدیم روایت تھی کہ باپ کی جائیداد میں سے بیٹے کو صرف تلوار ملتی تھی جبکہ تمام مال و اسباب بیٹی کے حصے میں آتا تھا۔ مرزا کے دادا' شاہ عالم کے زمانے میں ثمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کی زبان ترک تھی۔ انہیں ہندوستان کی زبان بہت کم آتی تھی' تاہم انہیں شاہ عالم کی سلطنت میں عمدہ منصب مل گیا۔ ان کے دو بیٹے تھے' ایک مرزا کے باپ عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا اور دوسرے نصراللہ بیگ خاں۔ عبداللہ بیگ کی شادی خواجہ غلام حسین کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ مرزا کے والد نے بطور گھر داماد تمام عمر سسرال میں گزاری۔ ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ مرزا کے ایک بھائی مرزا یوسف خاں تھے جو عالمِ شباب میں ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے اور دیوانے سے ہو گئے تھے۔ مرزا کے والد عبداللہ بیگ پہلے لکھنؤ میں آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے پھر حیدر آباد دکن جا کر سرکارِ آصفی میں کئی سال تک ملازم رہے مگر یہ نوکری ایک خانہ جنگی کے نتیجے میں ختم ہو گئی چنانچہ آگرہ چلے آئے اور پھر الور روانہ ہو گئے جہاں راجہ بختاور سنگھ کی نوکری اختیار کیے ہوئے ابھی چند دن ہوئے تھے کہ ان ہی دنوں ایک زمیندار نے راجہ سے بغاوت کر دی۔ راجہ نے جو فوج اس زمیندار کی سرکوبی کے لیے بھیجی' اس میں مرزا عبداللہ بیگ بھی شامل تھے۔ اس لڑائی میں مرزا کے والد کے گولی لگی اور ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ راج گڑھ میں ہی دفن ہوئے۔ راجہ بختاور سنگھ نے اس قربانی کے صلے میں مرزا عبداللہ کے لڑکوں کی پرورش کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا جو ایک مدت تک جاری رہا۔ والد کی وفات کے بعد مرزا کی پرورش کی ذمہ داری چچا نے سنبھالی۔



مرزا کا بچپن انتہائی آرام اور عیش و عشرت میں گزرا۔ ان کی نخیال بہت آسودہ حال تھی۔ اس آسودہ حالی سے مرزا اور ان کے بھائی نے خوب فائدہ اٹھایا۔ مرزا کا بچپن اور جوانی جن تعیشات کے ساتھ گزرا' اس ماحول کو دیکھتے ہوئے ان کا شعر و شغف کی جانب راغب ہونا کسی اچنبھے سے کم نہیں لگتا' یقیناً شاعری ان کی فطرت کا حصہ تھی جب ہی ایسے عیش و آرام میں بھی شعری فکر کا سامان ہوتا رہا۔ مرزا نے ابتدا اُردو شعروں سے کی تھی' تاہم فارسی کا رنگ مرزا کی بول چال اور تخلیات پر چڑھتا چلا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فارسی شاعر بیدل کا کلام زیادہ پڑھتے تھے چنانچہ بیدل کی راہ پر ہی مرزا نے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تھا۔ بہت کم عمری سے ہی مرزا کو مشکل شعر پسند تھے۔ سیدھے سادے آسان شعروں پر ان کی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اسی مشکل پسندی نے ان کے شعری ذوق کو متاثر کیا تھا۔ وہ اسی انداز میں شعر کہنے لگے تھے جو بیدل کا تھا' تاہم اس طرزِ خیال میں جو مشکل انہیں درپیش آئی' انہوں نے اپنے اس شعر میں اس کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں' قیامت ہے

والد کے انتقال کے وقت مرزا کی عمر پانچ برس تھی۔ سن شعور تک وہ اپنے بھائی کے ساتھ آگرے ہی میں رہے۔ ان کے چچا فوج میں ملازم تھے اور ان کا رشتہ نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا۔ چچا کا انتقال ہوا تو مرزا نو برس کے تھے۔ فیروز پور جھرکہ کی ریاست نے ان کے وارثوں اور متعلقین کے لیے پنشن مقرر کر دی تھی جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو اپریل 1857ء تک برابر ملتا رہا۔

تیرہ برس کی عمر میں مرزا کی شادی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی صاحب زادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ ہجری کو مرزا کا نکاح ہوا۔

مرزا سات برس کی عمر سے دہلی آتے جاتے رہتے تھے لیکن شادی کے بعد بھی ان کی سکونت آگرے ہی میں رہی۔ ابتدائی تعلیم شیخ معظم سے حاصل کی جو آگرے کے نامی گرامی معلموں میں سے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی اعظم علی اعظم سے بھی علمی فیض حاصل کیا۔ ایک اور استاد کا بھی مرزا کی زندگی میں بڑا عمل دخل رہا ہے' ان کا نام عبدالصمد تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آگرے کی سیاحت کرنے آئے تھے اور دو سال تک پہلے آگرہ میں مرزا کے استاد رہے۔ بعد میں دلی میں بھی مرزا کے ساتھ مقیم رہے۔ مرزا نے عبدالصمد سے فارسی میں کسی قدر مہارت حاصل کی تھی۔ مرزا نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ عبدالصمد کی شاگردی پر فخر کیا ہے اور انہیں ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے۔ اگرچہ مرزا کی زبانی کبھی کبھار یہ بھی سنا گیا کہ عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے کیونکہ مجھ کو لوگ 'بے استادہ' کہتے تھے' ان کا منہ بند کرنے کے لیے میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا۔ مرزا کی یہ بات اس وقت درست معلوم ہوتی ہے جب اس قسم کے سوالوں کا جواب نہیں ملتا کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی یا کتنی مدت وہ مرزا کے ساتھ رہا؟ ان سوالوں کے باوجود بھی یہ امر اپنی جگہ ثابت ہے کہ ملا عبدالصمد' مرزا کے استاد رہے ہیں اور ان کی وجہ سے مرزا کو فارسی پر ایسا کمال حاصل ہوا کہ مرزا نے غدر کے دوران ''قاطع برہان'' جیسی مایہ ناز کتاب میں اصلاحیات کیں۔ ملا عبدالصمد کا استاد ہونا اس خط سے بھی ثابت ہے جو ملا نے مرزا کو جانے کے بعد لکھا تھا۔

مرزا کی جوانی دلی میں گزری بلکہ زندگی کے قریباً پچاس برس دلی میں قیام رہا۔ جن لوگوں نے مرزا کی جوانی دیکھی ہے' وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ مرزا دورِ

شباب میں بے حد خوبرو تھے بلکہ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ دلی کے خوبصورت ترین جوانوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ مولانا حالی نے تو انہیں زمانۂ پیری میں دیکھا تھا لیکن مرزا کی خوبصورتی کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے مگر آخر عمر میں قلتِ خوراک اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و نزار ہو گئے تھے لیکن چونکہ ہاڑ (ڈھانچہ) بہت چکلا' قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے' اس حالت میں بھی وہ ایک نوواردِ تورانی معلوم ہوتے تھے۔"

ظاہری خوبصورتی سے قطع نظر مرزا اخلاق کے بھی خوبصورت تھے۔ ہر ایک سے کشادہ پیشانی سے ملتے جو ایک بار ان سے مل لیتا' دوبارہ ملنے کا مشتاق رہتا تھا۔ دوستوں کے دوست تھے اور انہیں دیکھ کر خوشی سے باغ باغ ہو جاتے تھے۔ دوستوں کی غمی و خوشی میں شریک ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوستوں کی فہرست میں ہر مذہب و ملت کے افراد شامل تھے۔ ہندوستان بھر میں ان کے احباب تھے جو باقاعدگی سے مرزا کو مکتوب لکھا کرتے تھے اور ان سے غزلوں کی اصلاح لینے کے علاوہ طرح طرح کی فرمائشیں بھی کیا کرتے تھے اور مرزا ان کی فرمائشوں سے عاجز آنے کی بجائے انہیں پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لوگ انہیں "بیرنگ" خط بھی بھیجتے تھے مگر وہ کبھی کبیدہ خاطر نہیں ہوئے۔ اگر کوئی لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیج دیتا تو ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ مروت اور لحاظ ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ عالم یہ تھا کہ آخر عمر میں جب وہ بیماری کے باعث بہت کمزور ہو گئے تھے' اس وقت بھی دوستوں کے اشعار یا غزلوں کی اصلاح کر دیا کرتے تھے حالانکہ طبیعت اس مشقت کی اجازت نہ دیتی تھی۔

اس کا اندازہ مرزا کے ایک مراسلے سے ہوتا ہے' لکھتے ہیں۔

"جہاں تک ہو سکا' احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمتِ اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں' خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت ہو سکے گا' لکھ دیا کروں گا۔"

اس کے باوجود لوگ انہیں ستاتے رہتے تھے مگر مرزا کے حوصلے کا بھی جواب نہیں تھا' کسی کو اپنی ذات سے مایوس نہیں کرتے تھے۔ اخلاق کے ساتھ ساتھ مرزا کا ہاتھ بھی کھلا تھا اگرچہ ان کی آمدنی بہت تھوڑی تھی مگر پھر بھی بہت کم ایسا ہوتا کہ کوئی سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ واپس جاتا تھا۔ ان کے مکان کے سامنے اندھے' لولے' لنگڑے' اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی بہت کم ہو گئی تھی مگر عسرت کے ان ایام میں بھی غریبوں اور محتاجوں کی امداد اپنی بساط کے مطابق کرتے تھے۔ خود تنگ رہتے تھے مگر دوسروں کا بھلا کر دیتے۔ اپنے ان دوستوں کی بھی حتی المقدور امداد کرتے تھے جن کے حالات گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے۔ مرزا کے ایک دوست کی مالی حالت بہت دگرگوں ہو گئی تھی۔ ایک روز وہ صاحب مرزا سے ملنے آئے تو چھینٹ کے فرغل میں ملبوس تھے۔ مرزا نے انہیں ہمیشہ اعلیٰ اور قیمتی لباس میں دیکھا تھا' چنانچہ جب انہیں "چھینٹ" کے ادنیٰ لباس میں دیکھا تو مرزا کا دل بھر آیا۔

فوراً پوچھا۔ "حضرت' یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے یہ بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں۔"



انہوں نے کہا۔ "اگر آپ کو پسند ہے تو لے لیں۔"

"جی تو چاہتا ہے کہ ابھی آپ سے چھین لوں مگر جاڑا شدت کا ہے' آپ کیا پہن کر جائیں گے؟"

یہ کہہ کر مرزا نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کھونٹی پر سے اپنا نیا چغہ جو اعلیٰ کپڑے کا تھا' اتار کر اپنے دوست کو دے دیا۔ اس طرح دوست کی مدد بھی ہو گئی اور اس کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہوئی۔ مرزا چاہتے تھے کہ دنیا سے غربت و افلاس نامی بلا بھاگ جائے اور کوئی ضرورت مند نہ رہے۔ انہوں نے اپنے ان جذبات کا اظہار اپنے ایک خط میں کچھ یوں کیا ہے۔

"اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں' اُس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے جو کسی کو بھیک مانگتا نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے' وہ میں ہوں۔"

مرزا کا حافظہ بھی کمال کا تھا جو چیز ایک بار پڑھ لیتے' ہمیشہ ان کے ذہن میں رہتی تھی۔ مرزا کے حوالے سے ایک کمال کی بات یہ ہے کہ باوجود تمام عمر قلم و قرطاس سے جڑے ہونے کے' انہوں نے کبھی کوئی کتاب خرید کر نہیں پڑھی' ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا کر پڑھتے تھے۔ ایک شخص یہی کام کرتا تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کتاب کرائے پر لا کر دیا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی ہمیشہ اُسی سے کتابیں منگواتے اور پڑھ کر واپس کر دیا کرتے مگر کتاب میں جو کام کی بات ہوتی' وہ جیسے مرزا کے ذہن و دل پر نقش ہو جایا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اُن پر شعروں کی آمد ایسے وقت میں ہوتی جب وہ بستر پر آرام کر رہے ہوتے' ایسے موقع پر جب کوئی شعر اترتا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیا کرتے' دوسرا شعر ہوتا تو دوسری گرہ' اس طرح سونے سے پہلے ان کے کمر بند میں آٹھ دس گرہیں لگ جاتی تھیں۔ صبح اٹھ کر ان گرہوں کو کھولتے جاتے اور شعروں کو قلم بند کرتے جاتے۔

دلی میں مرزا نے زندگی کے پچاس برس گزارے مگر ان پچاس برسوں میں انہوں نے کوئی مکان نہیں خریدا' ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے البتہ مکان بدلتے رہتے تھے۔ ایک مکان سے دل بھر جاتا یا اکتا جاتا تو دوسرے میں منتقل ہو جاتے' تاہم دلی میں قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اس کے اریب قریب کے علاقے کے سوا کہیں نہ جاتے۔ آخر میں جس مکان میں مرزا کا انتقال ہوا' وہ حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے کے ساتھ ایک مسجد کے عقب میں تھا جس کے متعلق ایک بار انہوں نے کہا۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

مرزا گفتگو میں بھی کمال رکھتے تھے اسی لیے لوگ ان سے ملنا اور ان کی باتیں سننا پسند کرتے تھے۔ اگرچہ وہ زیادہ نہ بولتے تھے مگر جتنا بھی بولتے تھے' کمال ہوتا تھا۔ گفتگو میں شگفتگی اور ظرافت کا رنگ نمایاں تھا۔ گردشِ دوراں کے کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں' ان کی باتوں میں شوخی کا عنصر نمایاں رہتا تھا۔

ایک بار وہ شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں شامی کباب تھے۔ مولانا حالی اُن کے سامنے بیٹھے رومال سے مکھیاں جھل رہے تھے۔ مرزا نے کہا۔

"آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں' میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔"

ایک روز اُن کے دوست سید سردار مرزا شام میں آئے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ جانے لگے تو مرزا ہاتھ میں شمع دان لے کر کھسکتے ہوئے دروازے تک آئے۔ انہوں نے فرمایا۔ "قبلہ و کعبہ' آپ نے کیوں تکلیف کی' میں خود اپنا جوتا پہن لیتا۔"

غالب کی شخصیت اور فن پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں خواجہ الطاف حسین حالی کی ''یادگارِ غالب'' سرِ فہرست ہے۔ تاہم ان کتابوں سے صرف پڑھا لکھا طبقہ یا وہ لوگ استفادہ کر سکتے ہیں جنہیں علم و ادب سے لگاؤ ہے جبکہ عام افراد اور اَن پڑھ لوگوں سے غالب کو متعارف کروانے میں فلموں، ڈراموں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاک و ہند میں غالب پر بہت سے اسٹیج، ٹی وی ڈرامے اور فلمیں بنائی گئیں۔ معروف ہندوستانی مصنف و شاعر گلزار کی ڈرامہ سیریل ''مرزا غالب'' اُن میں سے ایک ہے۔ اس ڈرامے کو گلزار نے تحریر کیا تھا اور پیشکش بھی ان ہی کی تھی جبکہ آرٹ فلموں کے مشہور فن کار نصیر الدین شاہ نے مرزا غالب کا کردار ادا کیا تھا اور غالب کی بیوی امراؤ بیگم کے کردار میں تنوی اعظمی جلوہ گر ہوئیں۔ اس ڈرامے میں جگجیت سنگھ اور چترا سنگھ نے نہ صرف غالب کی غزلوں کو اپنی دلکش آوازوں سے سجایا تھا بلکہ ان کا میوزک بھی خود ہی کمپوز کیا تھا۔ یہ ڈرامہ 1988ء میں دوردرشن سے آن ایئر گیا تھا۔ اس ڈرامے نے عام طبقے میں بے حد مقبولیت حاصل کی تھی اور ایک عام آدمی کو غالب کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا تھا۔ پاکستان میں بھی خواجہ محی الدین نے ''مرزا غالب بندر روڈ پر'' اسٹیج پر پیش کر کے پسندیدگی کی سند حاصل کی تھی۔

مرزا نے کہا۔ میں اس لیے شمع دان لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔''

شراب کے بارے میں بھی مرزا کی شوخیانہ باتیں بے حد مشہور ہیں۔ کسی نے ان کے سامنے شراب کی مذمت کرتے ہوئے کہا۔ ''شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔''

مرزا نے کہا۔ ''بھائی، جس کو شراب میسر ہو، اس کو اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا مانگے؟''

مرزا اپنی شوخی سے کبھی بھی اور کسی کے سامنے نہیں چوکتے تھے۔ مرزا کے خسر ایک رُوحانی شخصیت تھے اور سلسلے کے گدی نشین بھی تھے۔ لوگ اُن کے مرید ہوا کرتے تھے۔ جب اُن کے بہت سے مرید ہو جاتے تو وہ اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھوا کر ایک ایک کاپی ہر مرید کو دے دیتے۔ ایک بار انہوں نے مرزا کو شجرہ دیا کہ اسے نقل کر دو۔ مرزا نے شجرہ اس طرح لکھا کہ ایک نام لکھا تو دوسرا حذف کر دیا۔ تیسرا لکھا تو چوتھا غائب کر دیا، یوں بہت سے نام شجرہ سے حذف ہو گئے۔ جب شجرۂ مذکور سسر صاحب نے دیکھا تو بہت ناراض ہوئے۔

مرزا نے کہا۔ ''حضرت، اس کا کچھ خیال نہ کریں۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے۔ اگر زینہ کی ایک ایک سیڑھی بیچ میں سے نکال دی جائے تو بندہ اچک اچک کر بھی اوپر جا سکتا ہے۔''

سسر صاحب نے مرزا کی بات سن کر بہت پیچ و تاب کھایا اور نقل پھاڑ ڈالی پھر کسی اور سے شجرہ لکھوایا، یوں مرزا کی اس کام سے جاں بخشی ہوئی جوان پر گراں تھا۔

مرزا اپنے احباب کو پابندی سے مکتوب لکھا کرتے تھے اور دوستوں کے بھی خطوط باقاعدگی سے آتے تھے' تاہم ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان کے پاس گمنام خط بھی آنے لگے تھے جن میں مرزا کی شراب نوشی اور بدمذہبی پر سخت لعن طعن کی جاتی تھی حتیٰ کہ اُن خطوط میں شرم ناک گالیاں بھی ہوتی تھیں جن سے مرزا کا مزاج مکدر ہو جاتا تھا۔ ایک بار مرزا کھانا تناول فرما رہے تھے کہ چٹھی رساں نے لفافہ لا کر دیا' لفافہ وہاں موجود مرزا کے شاگرد مولانا حالی نے وصول کیا۔ مرزا نے انہیں ہدایت کی کہ اسے پڑھو۔ حالی نے جو خط پڑھا تو وہ گالیوں اور دشنام طرازیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی ہمت نہ ہوئی کہ استاد کو خط پڑھ کر سنائیں۔ مرزا نے فوراً بھانپ لیا کہ خط کس نوعیت کا ہے' انہوں نے خط جھپٹ کر لیا اور اسے پڑھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

''اس الوکو گالی بھی دینی نہیں آتی' بڈھے یا ادھیڑ عمر آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کیونکہ وہ ماں سے بے حد محبت کرتا ہے اور یہ احمق مجھ بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے' اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا۔''

غرض مرزا کی زندگی شوخی و ظرافت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ان کی شاعری میں بھی شوخی جا بجا نظر آتی ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

مرزا کی خانگی زندگی عام سی رہی۔ بیوی سے تعلقات خوشگوار رہے گو کہ بیوی اور مرزا کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مرزا جتنا مذہبی معاملات سے بے بہرہ تھے' بیوی اتنی ہی متقی' پرہیزگار اور نماز' روزے کی سخت پابند تھیں۔ مرزا مے نوش تھے لہٰذا اسی سبب مرزا کے کھانے پینے کے برتن الگ اور بیوی کے الگ تھے۔ تاہم بیگم صاحبہ' مرزا کی خدمت گزاری میں کوئی کوتاہی نہ برتتی تھیں۔ مرزا زیادہ تر مردانے میں رہتے تھے اور مقررہ وقت پر گھر میں آتے تھے۔ وہ' بیوی اور اُن کے رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا کرتے تھے اور بیوی کی ضروریات کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے گو کہ وہ بیوی سے حد درجہ محبت کرتے تھے مگر اپنی شوخ طبیعت کے باعث اکثر اُن کی زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے وہ اپنی خانگی زندگی سے خوش نہ ہوں حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔

ایک بار کسی نے خط میں مرزا کے کسی شاگرد کی دوسری بیوی کے مرنے کا احوال لکھا کہ اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' اب وہ غریب تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے تاکہ بچوں کی پرورش کے لیے گھر میں کوئی عورت ہو۔ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

''اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ! اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندہ ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی' تیرے بچے میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟''

ایک دفعہ سردی کا موسم تھا' سامنے طوطے کا پنجرہ رکھا تھا۔ طوطا شدید سردی کے باعث پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا۔

''میاں مٹھو.....! نہ تمہارے جورو نہ بچے' تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو؟''

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان دیکھا' اس کا دیوان خانہ تو پسند آ گیا محل سرا نہ دیکھ سکے۔ گھر آئے اور بیوی کو مکان دیکھنے کے لیے بھیجا۔

وہ مکان دیکھ کر واپس آئیں اور کہا۔ ''مکان تو ٹھیک ہے لیکن لوگ کہتے ہیں' اس میں بلا ہے۔''

مرزا نے کہا۔ ''کیا دنیا میں آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے؟''

اولاد کے معاملے میں مرزا صاحب کی زندگی دکھوں سے معمور رہی' ان کے سات بچے ہوئے مگر وہ سب کم عمری میں ہی انتقال کر گئے۔ ایک مدت تک مرزا اور اُن کی بیوی نے تنہا زندگی بسر کی' تاہم غدر سے چند سال پہلے اُن کی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہوا تو اُن کے دو بیٹے رہ گئے۔ مرزا اور اُن کی بیوی نے چھوٹے لڑکے کو اپنے زیرِ سایہ لے لیا۔ اُس بچے کو دونوں میاں بیوی حد سے زیادہ چاہتے تھے' اس کی ہر خواہش پوری کرتے اور کبھی اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتے تھے۔ بعد میں جب اس لڑکے کی حقیقی ماں کا انتقال ہوا تو مرزا نے اُن کے بڑے لڑکے کو بھی اپنے پاس رکھ لیا۔ بعد میں یہ دونوں بچے بھی وقفے وقفے سے جوان عمری ہی میں چل بسے۔ دونوں کو سخت صدمہ پہنچا چنانچہ مرزا نے اُن بچوں کی یاد میں ایک نوحہ لکھا۔

مرزا کو مشاعرے پڑھنے سے رغبت نہیں تھی' زندگی میں چند ایک مشاعروں میں شرکت کی تھی لیکن اُن کی شعر گوئی کا انداز بہت زبردست تھا۔ ایک بار مشاعرے میں صبح ہو گئی تھی' ان کی باری سب سے آخر میں آئی۔

مرزا نے کہا۔ ''صاحبو.....! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں۔''

پھر ایک غزل اپنی پُردرد اور دلکش آواز میں پڑھی۔ ان کی غزل گوئی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جیسے محفل میں ان کی قدردانی کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایک مشاعرہ میں مرزا نے فارسی قصیدہ کچھ اس رقت انگیز انداز میں پڑھا کہ لوگ سنتے رہے اور برابر روتے رہے۔

1850ء میں بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے مرزا کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب سے نوازا اور دربارِ عام میں انہیں خلعت مرحمت فرمائی۔ بادشاہ نے مرزا کو خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام بھی سونپا جس کے لیے مرزا کا پچاس روپے ماہوار مقرر کیا گیا۔ طے یہ پایا کہ احترام الدولہ حکیم احسن خان مختلف تاریخوں سے مضامین نکال کے



مرزا کے حوالے کیا کریں گے اور مرزا ان واقعات کو اپنے خاص انداز میں فارسی نثر میں لکھیں گے۔ مرزا نے اس کتاب کا نام ''پرتو ستان'' رکھا۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا' پہلے حصہ میں تیمور سے نصیر الدین ہمایوں کے آخر زمانہ تک کے حالات درج کیے جانے تھے جبکہ دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر سے بہادر شاہ ظفر کے زمانہ تک کے تمام واقعات کو درج کیا جانا تھا۔ مرزا نے خاصی محنت سے کتاب کا پہلا حصہ مکمل کیا۔ ابھی دوسرے حصے کا کام ہونا باقی تھا کہ غدر کا ہنگامہ ہو گیا اور کتاب ادھوری رہ گئی۔

مرزا بلا کے مے نوش تھے' اگرچہ شاعری میں انہوں نے اس ام الخبائث کی بہت تعریف کی ہے مگر وہ شراب خانہ خراب کو دل سے برا جانتے تھے جس میں ڈوب کر کوئی نہیں ابھرتا۔ وہ مے نوشی بھی کرتے تھے مگر اپنے اس فعلِ پر نادم بھی تھے لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنے اس فعل کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ شراب کے متعلق ان کے اشعار زبان زدِ عام ہیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو' مدرسہ ہو' کوئی خانقاہ ہو

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

گو ہاتھ میں جنبش نہیں' آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مرزا کی شخصیت میں ایک بڑی خوبی ان کا راست گو ہونا تھا۔ قول و قرار اور وعدے کے معاملے میں کھرے اور سچے تھے' جو دل میں ہوتا' وہی زبان پر ہوتا۔ جو شخص ان کے وعدے کا یقین نہ کرتا' اس سے ناراض ہو جاتے۔ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے جیسے خلوت میں' ویسے ہی جلوت میں ہوتے تھے' گویا ان میں جو بھی عیب یا محاسن تھے' سب کے سامنے تھے۔

بہادر شاہ ظفر بھی شاعری کرتے تھے' ان کے اشعار کی اصلاح شیخ ابراہیم ذوق کرتے تھے۔ جب ذوق کا انتقال ہوا تو بادشاہ کے اشعار کی اصلاح کا کام بھی مرزا کے ذمہ لگا دیا گیا۔ وہ اصلاح کا کام تو کرتے مگر اس کام سے مطمئن نہ تھے اور بہ امرِ مجبوری اسے نبھایا کرتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کے کلام کی اصلاح کرتے وقت ذہن پر زیادہ زور نہیں ڈالتے تھے۔

ویسے تو مرزا کی زندگی کا زیادہ حصہ دلی میں گزرا ہے البتہ دو برس انہوں نے کلکتے میں بھی گزارے۔ کلکتہ جانے کا سبب معاشی تنگی تھا۔ ان کی ضروریات بڑھ گئی تھیں۔ چچا کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ خاندانی جاگیر کا جھگڑا پیدا ہو گیا تھا۔ مفلسی و تنگدستی نے گھر میں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ ایسے میں مرزا کے ذہن میں خیال آیا کہ جو پنشن انہیں انگریز سرکار کی طرف سے ملتی ہے' وہ پوری ان تک نہیں پہنچتی لہٰذا اپنی مقررہ پنشن کے دعوے کے لیے کلکتہ کا قصد کیا۔ اس وقت حالات اتنے دگرگوں تھے کہ قرض خواہوں نے جینا دوبھر کیا ہوا تھا اور بھائی بھی پاگل ہو گیا تھا۔ ان نامساعد حالات میں وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے' اس وقت مرزا کی عمر چالیس برس تھی۔ کلکتے میں لوگوں نے ان کی خوب خاطر مدارات کی اور انہیں پنشن کی امید دلائی۔ ان امیدوں کے سہارے مرزا

کلکتہ میں دو سال رہے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ سرکاری عہدے داروں نے مرزا کے دعوے کو غلط قرار دیا تھا۔ مرزا ناچار مایوس لوٹ آئے۔

1842ء میں دہلی کالج کو نئے اصول پر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں سیکریٹری حکومتِ ہند مسٹر ٹامسن مدرسین کے امتحان کے لیے دلی آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح عربی کے لیے کالج میں ایک مدرس موجود ہے اُسی طرح فارسی کا مدرس بھی ہونا چاہیے۔ فارسی کے استاد کے لیے لوگوں نے مرزا اور مومن خان اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار سیکریٹری صاحب کے آفس پہنچے۔ انہوں نے اندر بلایا مگر مرزا اس انتظار میں باہر پالکی میں بیٹھے رہے کہ سیکریٹری صاحب خود انہیں لینے آئیں گے۔ جب کچھ وقت گزر گیا اور مسٹر ٹامسن کو معلوم ہوا کہ مرزا اس وجہ سے نہیں آرہے تو وہ خود باہر آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربارِ گورنری میں آئیں گے تو آپ کا استقبال آپ کی شایانِ شان کیا جائے گا لیکن اس وقت نوکری کے لیے آئے ہیں لہٰذا اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا۔

مرزا نے فرمایا۔ ''گورنمنٹ کی نوکری کا ارادہ اس لیے کیا تھا کہ اعزاز یہ میں اضافہ ہو نہ کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔'' یوں مرزا نے سو روپے ماہوار کی نوکری کو ٹھکرا دیا۔

مرزا کو ایک بار تین ماہ کی قید بھی بھگتنا پڑی۔ اس قید کی وجہ شطرنج اور چوسر بنے تھے۔ مرزا یہ دونوں کھیل بہت شوق سے کھیلتے تھے۔ کبھی کبھار بازی بھی لگا لیا کرتے تھے' بس چوسر میں بازی لگانے کے الزام میں انہیں دھر لیا گیا۔ اس جرم میں انہیں چھ ماہ کی سزا ہوئی تھی جسے بعد میں تین ماہ کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو مرزا صاحب کی زندگی میں کسی طور بھی خوشگوار نہیں کہا جاسکتا گو کہ قید خانے میں انہیں گھر جیسا آرام تھا۔ کھانا اور کپڑا وغیرہ گھر سے آتا تھا۔ دوست احباب بھی ملنے آتے تھے۔ قید کیا تھی' بس ایک طرح سے نظر بندی تھی مگر مرزا اس سزا سے بے حد مکدر ہوئے تھے کیونکہ اُس وقت تک شہر کے شرفاء و معززین کے ساتھ کبھی ایسا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ خود کے ساتھ ہونے والے اس عمل کو وہ بہت ہتک آمیز سمجھتے تھے جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک خط میں یوں کیا ہے۔

''کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف' فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ اگرچہ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ دیکھیے' وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے' نجات پاؤں۔''

مرزا کو لوگ بدمذہب اور مے نوش سمیت ایک بے عمل مسلمان کہتے تھے مگر حقیقت میں مرزا اسلام کی حقیقی روح سے واقف تھے۔ توحیدِ الٰہی پر ان کا کامل ایمان تھا گو کہ نہ تو وہ پنج وقتہ نمازی تھے نہ روزے رکھا کرتے تھے لیکن ان کے دل میں اپنے رَب پر ایمان اور اہلِ بیعت کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن بظاہر ان کی زندگی ایسے واقعات سے معمور ہے جن سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ انہیں اسلام کی حقیقت پر پختہ یقین نہیں تھا۔ وہ احکامِ ظاہری کے پابند نہیں تھے مگر مسلمانوں کی حالتِ زار پر سخت رنجیدہ ہوجاتے تھے اور اپنے اس امر پر حیرت کا اظہار بھی کرتے ہوئے کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانوں والی نہیں ہے پھر میں نہیں جانتا



کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو رنج کیوں ہوتا ہے؟ ہنگامۂ غدر کے بعد جب ان کی پنشن انگریز حکومت نے بند کی تو مرزا صاحب نے کہا۔

''تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گناہ گار پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا؟''

مرزا کے زیرِ نظر بند میں فلسفۂ توحید بھرپور طریقے سے موجود ہے۔

ہیں موحد بخدا' شرک ہے دل سے مفقود
ہم معبد ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود
روبقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہے مقصود
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ایک دفعہ رمضان کا مہینہ گزرنے کے بعد مرزا قلعے میں گئے تو بادشاہ نے پوچھا۔ ''مرزا' تم نے کتنے روزے رکھے؟''

عرض کیا۔ ''پیر و مرشد' ایک نہیں رکھا۔''

عمر کے آخری ایام میں جب مرزا بے حد علیل تھے اور ان سے اٹھا بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا' باتیں بھی لکھ کر کیا کرتے تھے کہ ایک دن ان کے شاگرد حالی کو جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے استاد کو واعظ کی طرح نصیحت کرتے ہوئے ایک کاغذ استاد کے ہاتھ میں تھمایا جس میں کہا تھا کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا پھر اشاروں سے جس طرح ہو سکے' نمازِ پنج گانہ کی پابندی کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز نہ ترک ہو۔ مرزا کو یہ نصیحت سخت ناگوار گزری۔

انہوں نے کہا۔ ''ساری عمر فسق و فجور میں گزری' نہ کبھی نماز پڑھی نہ کوئی روزہ رکھا نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں' اب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیوں کر ہو سکے گی؟ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں' میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں اور کوؤں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارہ کریں۔)' چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں' ہمیشہ تنہائی میں میری زبان پر یہ کلمات جاری رہتے ہیں۔

لا الٰہ الا اللّٰہ لا موجود الا اللّٰہ موثر
فی الوجود الا اللّٰہ''

استاد کی یہ باتیں سن کر حالی کا سر جھک گیا اور انہیں اپنی نصیحت پر شرم آنے لگی۔ مرزا کے ان الفاظ سے عقل والے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ بدمذہب تھے یا راسخ مسلمان۔ مرزا باعمل مسلمان نہیں تھے مگر اس پر سخت نادم بھی تھے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب؟
شرم تم کو مگر نہیں آتی

حقائق و معرفت کی کتابیں اکثر مرزا کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ وہ ان کتابوں کو بغور خوب سمجھ کر پڑھتے تھے۔ اگر اس موضوع کے حوالے سے کوئی دقیق مسئلہ پوچھا جاتا تو مرزا ایسی وضاحت سے بیان کرتے کہ پوچھنے والا مطمئن ہو جاتا' شاید ان ہی کتابوں کا اثر تھا کہ مرزا کی شاعری میں جابجا تصوف کا رنگ نظر آتا ہے۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

مرزا کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ دادِ سخن دینے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ہر ایک شعر پر ''واہ واہ'' نہیں کرتے تھے جیسے کہ معاشرے کا چلن ہے کہ خواہ شعر داد کے قابل ہو یا نہ ہو لیکن برابر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں جبکہ مرزا کو جب کوئی شعر پسند نہ آتا تو قطعی تعریف نہ کرتے' ان کی اس عادت سے ہم عصر ناراض ہو جاتے تھے مگر مرزا کو ان کی ناراضگی کی کوئی پروا نہیں ہوتی' تاہم جو شعر ان کے دل کو لگتا تھا' اس کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے' خواہ وہ شعر ان کے کسی مخالف کا ہی کیوں نہ ہو۔ دربار سے تعلق کی وجہ سے ذوق اور مرزا میں اکثر نوک جھونک رہتی تھی جسے فنکارانہ رقابت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مرزا کا یہ شعر دراصل ذوق پر طنز تھا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ایک روز مرزا شطرنج کی بازی میں مصروف تھے کہ کسی نے ذوق کا یہ شعر پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

شعر سن کر مرزا چونک پڑے اور پوچھا کہ کس کا شعر ہے؟ پڑھنے والے نے بتایا۔ ''ذوق کا شعر ہے۔'' مرزا کو بہت تعجب ہوا پھر مرزا بار بار یہ شعر پڑھواتے تھے اور سر دُھنتے تھے۔ مرزا کے مکتوبات میں جا بجا اس شعر کا استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح مومن خاں مومن کا یہ شعر بھی مرزا کو حد درجہ پسند تھا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کے حوالے سے مرزا تعریف کرتے ہوئے کہتے تھے۔ ''کاش' مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔'' اس شعر کو بھی انہوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ مرزا کو داغ دہلوی کا یہ شعر بھی بہت پسند تھا۔ وہ اس پر جھوما کرتے تھے۔

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

بعض اوقات اپنے شاگردوں کے کلام کی بھی دل کھول کر تعریف کرتے تھے اور اس حد تک کرتے تھے کہ مبالغہ آرائی کا گماں ہوتا تھا۔

مرزا خوش خوراک تو نہ تھے البتہ کھانے میں انہیں گوشت بہت پسند تھا۔ وہ گوشت کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے حتیٰ کہ عسرت کے دنوں میں بھی انہوں نے کبھی کھچڑی وغیرہ نہیں کھائی۔ زندگی کے آخری ایام میں بیماری کے باعث ان کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی۔ دن میں جو کھانا ان کے لیے گھر سے بیگم بھیجتیں' اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا' ایک پیالے میں بوٹیاں اور دوسرے میں شوربہ۔ ایک پیالی میں پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔ کبھی ایک پیالی میں انڈے کی زردی بھی ہوتی۔ تھوڑا سا دہی ہوتا جبکہ شام کے کھانے میں تھوڑے بہت شامی کباب یا سیخ کے کباب ہوتے تھے' بس یہی ان کی خوراک تھی۔ ایک روز گھر سے دوپہر کا کھانا آیا۔ دسترخوان بچھا' برتن تو بہت تھے مگر کھانا بہت تھوڑا' یہ دیکھ کر مرزا نے کہا۔

''اگر برتنوں کو دیکھو تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان ہے۔ اگر کھانے کی مقدار کو دیکھو تو بایزید کا۔''

پھلوں میں مرزا کو سب سے زیادہ آم پسند تھا۔ احباب کو یہ بات معلوم تھی اس لیے وہ انہیں تحفتاً آم بھیجا کرتے تھے یا وہ فرمائش کر کے بھی دوستوں سے



آم منگواتے تھے۔ ان کے ایک فارسی خط میں بھی آم کا ذکر آیا ہے جس میں انہوں نے ایک صاحب سے آموں کا تقاضہ کیا ہے۔ ایک روز بادشاہ بہادر شاہ ظفر' مصاحبوں کے ساتھ باغِ حیات بخش میں ٹہل رہے تھے۔ مرزا بھی ہمراہ تھے۔ باغ میں ہر طرف درخت آموں سے لدے ہوئے تھے۔ اُس باغ کے آم صرف بادشاہ یا سلاطین کی بیگمات کے لیے ہی مخصوص تھے۔ مرزا بار بار آموں کو دیکھتے اور پھر نظریں جھکا لیتے۔ بادشاہ نے اُن کی یہ حرکت دیکھی تو پوچھا۔

''مرزا.....! اتنی غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟''

مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ ''حضرت' بزرگوں سے سنا ہے' دانے دانے پر لکھا ہوتا ہے کھانے والے کا نام۔ میں اسی لیے آموں کو بغور دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرے یا میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں؟''

مرزا کی بات پر بادشاہ مسکرایا اور اُسی روز عمدہ آموں کا ایک ٹوکرا مرزا کے گھر بھجوا دیا۔

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے دوست تھے' انہیں آم پسند نہیں تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے کوٹھے پر بیٹھے تھے' سامنے گلی کا منظر تھا جہاں سے ایک گدھے والا اپنے گدھوں کے ساتھ گزر رہا تھا۔ گلی میں آم کے چھلکے پڑے تھے۔ ایک گدھا چلتے چلتے رکا اور آم کے چھلکے کو سونگھ کر آگے بڑھ گیا۔ یہ دیکھ کر حکیم صاحب بولے۔

''دیکھیے حضرت! آم ایسی چیز ہے کہ گدھا بھی نہیں کھاتا۔''

مرزا نے کہا۔ ''بے شک گدھا نہیں کھاتا۔''

مرزا کو آم اس قدر مرغوب تھے کہ اُن کی نیت نہیں بھرتی تھی۔ ایک بار دوستوں کی محفل میں آموں کا ذکر چل رہا تھا' سب ہی اس پھل کی خوبیاں بیان کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ مرزا! آپ بھی آموں کے بارے میں کچھ کہیے۔

مرزا بولے۔ ''بھئی' میرے نزدیک تو آم میں دو خوبیاں ہونی چاہئیں' میٹھا اور بہت ہو۔'' مرزا کی بات پر سب ہنس پڑے۔

یوں تو مرزا کی تمام عمر سوائے بچپن اور عنفوانِ شباب کے' عسرت و تنگدستی میں گزری۔ انگریز حکومت کی پنشن اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ملنے والے ماہانہ وظیفہ سے غالب اپنی زندگی کی گاڑی بمشکل گھسیٹتے رہے لیکن جب 1857ء میں غدر مچا تو مرزا مصائب میں گھر گئے۔ غدر کے ہنگاموں میں مرزا گھر میں بند ہو کر رہ گئے۔ دلی شہر میں بغاوت کا فتنہ چہار سو پھیلا ہوا تھا' ایسے میں مرزا نے گوشۂ تنہائی کو ترجیح دی لیکن وہ گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہے بلکہ غدر کے واقعات رقم کرتے رہے۔ مرزا نے وہ تمام خونیں مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے جو فتح دلی کے بعد شب و روز کا حصہ بن گئے تھے اور ان چیخوں کو اپنے کانوں سے سنا جو دلی کی گلی کوچوں میں گونجا کرتی تھیں۔ ان سڑکوں پر شاہی خون بہتا دیکھا جہاں سے کبھی شاہی سواری مخصوص شان و شوکت کے ساتھ گزرا کرتی تھی۔ شاہی قلعہ میں جو بربادیاں ہوئیں' اس پر انسانیت جتنا ماتم کرے' کم ہے۔ وہ شاہی بیگمات جو تیمور اور بابر کی یادگار اور اکبر اعظم کے لہو کی نشانیاں تھیں' وہ چوروں ڈاکوؤں کی طرح دلی کی گلیوں میں ماری گئیں۔ یہ سب دیکھنے کے باوجود مرزا زندہ تھے مگر اُن کا دل پارہ پارہ تھا۔ ان ستم ظریفیوں سے مرزا بھی محفوظ نہ رہے۔ انگریز نے باغیوں کی مدد کے الزام میں ان کا وظیفہ بند کر دیا۔ مرزا کے لیے یہ حالات بہت سخت تھے۔ غدر کے بعد دلی شہر مسلمانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ اُن دنوں میں مرزا

کے ہندو دوست باقاعدگی سے آتے تھے اور اُن کی غم خواری کرتے تھے۔ فتح دہلی کے بعد مہاراجہ پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں اور اُن کے ہمسایوں کے مکان پر جس میں ایک مرزا کا مکان بھی تھا، پہرہ بٹھا دیا تھا اس لیے مرزا کا گھر فاتح سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہا۔ غدر کے ان ہنگاموں کے دوران مرزا کے مجنوں بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہوا تو حالت

مزارِ غالب..... یہاں غالب محوِ استراحت ہیں

یہ تھی کہ نہ کفن کے لیے کپڑا بازار سے مل سکتا تھا نہ غسال اور گورکن کا کہیں پتہ تھا۔ مرزا یوسف کا مکان کچھ فاصلے پر تھا۔ چنانچہ مرزا کے مکان سے دو سفید چادریں لے جا کر ان کے بھائی کی میت کو کفنایا گیا اور انہیں قریبی مسجد کے صحن میں دفنا دیا گیا۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

جیسا کہ بتایا گیا کہ مرزا کی آمدنی کے دو ہی ذریعے تھے، سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ اور یہ دونوں ذریعے بند ہو چکے تھے۔ مرزا نے اس تنگدستی میں بھی نوکروں کو جواب نہیں دیا جو حالت اُن پر گزری، اس میں اُن کے نوکر بھی شامل رہے۔ غدر کے دوران ہی مرزا نے اپنی بیوی کا زیور وغیرہ کسی جگہ گاڑنے کے لیے بھیج دیا تھا مگر وہاں بھی وہ محفوظ نہ رہ سکا اور فاتح فوج وہاں سے نکال کر لے گئی۔

مرزا عسرت کے اس وقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا اور اوڑھنا بچھونا گھر میں تھا، سب بیچ بیچ کر کھا گیا، گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔ جو حالت اس وقت درپیش ہے، ظاہر ہے کہ اس کا انجام یا موت ہے یا بھیک مانگنا..... قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا اور نہ ملی تو، تو کام ہی تمام ہے۔ اس شہر کی آب و ہوا اب خستہ دلوں کو راس آتی معلوم نہیں ہوتی، ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جا کر بسر آرام کرنا پڑے گا۔''

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

غدر کے دو برس بعد تک مرزا کا یہی حال رہا پھر نواب یوسف علی خاں نے سو روپیہ ماہانہ تا عمر مرزا کے لیے مقرر کر دیا۔ غدر کے تین برس بعد مرزا باغیوں کی مدد کے الزام سے بری ہوئے تو سرکاری پنشن بھی جاری ہوئی۔ ان تین برسوں میں مرزا نے گوشۂ تنہائی میں ''دستنبو'' لکھی اور ''قاطع برہان'' کی اصلاح کی۔ گویا کہ تنہائی میں بھی انجمن سجائے رہے۔



ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

مرزا کی تمام عمر مصائب و آلام میں گزری، شاید اسی وجہ سے آخر عمر میں وہ موت کی آرزو کیا کرتے تھے۔ موت کی ایسی تمنا ہوگئی تھی کہ ہر سال اپنی وفات کی تاریخیں نکالتے تھے کہ اس سال ضرور مر جاؤں گا۔ ایک بار شہر میں وبا پھیلی جس میں سینکڑوں افراد لقمۂ اجل بنے۔ دوسرے شہر سے میر مہدی حسین مجروح نے ایک خط میں پوچھا کہ حضرت، وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک تباہی مچا رہی ہے؟ جواب میں مرزا نے لکھا۔

''بھئی، کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف بریں وبا۔''

اس نوعیت کی بہت سی باتیں مرزا سے منسوب ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی سے کتنے عاجز آ گئے تھے اور ہر پل موت کی آرزو میں کاٹا کرتے تھے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے، پر نہیں آتی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

مرنے سے کئی برس پہلے وہ چارپائی سے لگ گئے تھے۔ چلنا پھرنا ختم ہو چکا تھا۔ ہمہ وقت پلنگ پر پڑے رہتے۔ رفع حاجت بھی پلنگ کے ساتھ ہی رکھی چوکی پر کرتے تھے۔ جب حاجت ہوتی تو پردہ ہو جاتا اور آپ بغیر کسی نوکر کی مدد کے کھسکتے کھسکتے چوکی تک پہنچتے۔ پلنگ سے چوکی تک جانا اور رفع حاجت کے بعد پلنگ تک واپس آنا جوئے شیر لانے کے برابر ہوتا تھا۔

کاوِ کاوِ سخت جانی، ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں اعتدال کہاں

بھوک بالکل ختم سی ہو گئی تھی، کئی کئی دن اجابت نہیں ہوتی تھی مگر اس حالت میں بھی احباب کے خطوں کے جواب برابر دیتے تھے۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے خط لکھتے یا کسی سے لکھواتے تھے۔ موت سے چند روز پہلے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے، زیادہ تر وقت بے گانگی کی حالت میں گزرتا تھا، بس پہر، دو پہر کے لیے ہوش آتا تھا۔ جس روز انتقال ہوا، اس سے ایک روز پیشتر ان کے شاگرد مولانا حالی عیادت کے لیے گئے۔ اُس دن طبیعت قدرے بہتر تھی۔ وہ نواب علاؤالدین احمد خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ نواب صاحب نے شاید حال پوچھا تھا جس کے جواب میں مرزا نے فقرہ لکھوایا۔

''میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
اک مرگِ ناگہانی اور ہے

آخری ایام میں یہ شعر اکثر اُن کی زبان پر رہتا تھا۔

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو.....! اب اللہ ہی اللہ ہے

پھر وہ دن بھی آ گیا جس کی آرزو شب و روز ورد زباں تھی۔ 15 فروری 1869ء بمطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری کو 73 برس اور چار ماہ کی عمر میں یہ شاعرِ بے مثال اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

جان دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دبئی میں مقیم منفرد لب و لہجے کے معروف شاعر

## سحر تاب رومانی

کا دوسرا مجموعہ کلام شائع ہو گیا ہے

کتاب کے لیے آج ہی رابطہ کریں:

**03008202093**

## علی زبیر پبلی کیشنز

435 خرم آباد لانڈھی نمبر ا کراچی

دوشیزہ ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے
50% رعایتی قیمت =/150


ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

•.....•.....•

ہوس کو نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

مرزا کی نمازِ جنازہ دلی دروازہ کے باہر پڑھی گئی جس میں شہر کے عمائد، معززین اور ممتاز لوگ شامل تھے۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی میں
ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

اُن کی تجہیز و تدفین کی تمام رسومات مسلکِ اہلِ سنت کے مطابق ادا کی گئیں اور انہیں درگاہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کے احاطے میں اُن کے سسر کے پہلو میں تہہ خاک کیا گیا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مرزا کے شاگرد جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے، اُن میں سے بھی بیشتر مرزا کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے آئے تھے۔

مرزا غالب کو اِس جہانِ فانی سے گزرے قریب قریب ڈیڑھ سو برس ہو چکے ہیں مگر آج بھی ایک عالم میں اُن کی فسوں گر شاعری کا غلبہ ہے۔ اُن کے کلام کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں مگر اُن کی فکری گہرائی کو اب تک پوری طرح ناپا نہیں جا سکا۔



## 2 خصوصی کہانیاں اپنے موضوع اور خیال کے اعتبار سے منفرد اور مختلف سچی کہانیاں

میجر (ر) امتیاز حسین ملک

# ماہِ گرفتہ

الماس روحی کا خیال

عجب تجربے زندگی نے دیے
نصیحت، طبیعت پہ اِک بار تھی

**ایک ایسی ماہ جبیں کا قصہ، رشتوں پر سے جس کا اعتبار اٹھ گیا تھا**

''السلام علیکم!'' کی آواز پر میں چونکا۔ آواز زنانہ تھی اور تھی بھی قریب کی اور تھی بھی اتنی بلند اور واضح جیسے خاص طور پر سنائی گئی ہو۔ اردگرد نظر دوڑائی' ایک محترمہ کے سوا جو ابھی پاس ہی سے گزری تھیں' اتنا نزدیک کوئی نہ تھا لیکن یہ مجھے کیوں سلام کرنے لگیں؟ نہ جان نہ پہچان پھر کچھ دور جا کر اس نے مڑ کر دیکھا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ اس روٹ کی روز کی مسافر تھیں۔ روز ہی تقریباً اسی وقت اور اسی جگہ ہمارا کراس ہوتا تھا۔ پہلے تو کوئی بزرگ بطور باڈی گارڈ ساتھ ہوتا تھا لیکن آج کل اکیلی ہی دکھائی دیتی تھیں۔ بیس اکیس سال کی ہوں گی۔ نیچے برقعے کا گاؤن پہنتی تھیں اور اوپر سر پر اسکارف۔ چہرہ کھلا رکھتی تھیں جو اس قابل بھی تھا کہ کھلا رکھا جائے۔ خوبصورت نین نقش' گورا رنگ اور لمبا قد لیکن جسامت کے لحاظ سے متناسب' نہ گٹھی تھیں نہ کھمبا' حسن چال میں اعتماد اور وقار دے ہی دیتا ہے' ان کی چال میں وافر مقدار میں تھا۔ بہرحال وہ ایسی تھی کہ راہ میں اس پر توجہ دیئے بغیر کوئی نہیں گزر سکتا تھا۔ جس کی نظر ایک دفعہ پڑ جاتی ہوگی' دوسری نظر کی خواہش بھی رکھتا ہوگا۔ اپنے حسن کا انہیں اندازہ بھی تھا اور احساس بھی۔ اس کا اظہار ان کی چال اور نظروں سے ہوتا تھا۔ بہرحال ہمیں کیا' حیرت اس بات پر تھی کہ اتنی کچی عمر کی لڑکی پچاس' پچپن سال کے مرد کو کیوں سلام کرے گی؟

لڑکیاں' بزرگوں کو سلام اُسی صورت میں کرتی ہیں جب انہیں پہچانتی ہوں۔ کوئی رشتے دار' واقف کار یا اڑوسی پڑوسی وغیرہ ہو' وہ بھی احتراماً قسم کا۔ ایسا بے تکلف قسم کا سلام تو ہم عمروں کے لیے ہوتا ہے۔ میرا اور اُن کا تعلق تو بس اتنا ہی تھا کہ ایک ہی روٹ کے مسافر تھے اور وہ بھی مخالف سمتوں کے۔ میں صبح آفس جاتا تھا اور وہ صبح کالج۔ یہیں اُسی پارک کے جنکشن پر ہمارا کراس ہوتا تھا' کبھی بات وات نہیں ہوئی تھی' ویسے ہی جیسے عام مسافر ایک دوسرے پر نظر ڈال کر گزر جاتے ہیں' ہم بھی گزر جاتے تھے لیکن ایک بات ضرور تھی جیسے کوئی خوبصورت منظر دیکھیں تو دوبارہ دیکھنے کو دل چاہتا ہے' اس کا چہرہ دوبارہ دیکھنے کو دل ضرور چاہتا تھا۔ شاید کان بج رہے ہوں' اس عمر میں کان کچھ بجتے بھی زیادہ ہیں' اب دل تو بجنے سے رہا پھر بھی احتیاطاً میں نے آہستہ سے ''وعلیکم السلام!'' کہا اور آفس چلا گیا۔ بات آئی گئی ہوگئی' میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ بلا پھر نازل ہو جائے گی۔ دوسرے دن وہیں سے گزر رہا تھا کہ وہ سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی اس حرکت پر میں حیران رہ گیا۔ اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ ''جی فرمایئے؟''

''فرمانا کیا ہے' آپ اپنا علاج کیوں نہیں کراتے؟'' جواب کی بجائے اس کے سوال پر میں اور بھی حیران ہوا۔

''کیا مطلب' کس چیز کا علاج؟'' میں نے پوچھا۔

''کانوں کا علاج اور کس چیز کا۔ تین دن سے سلام کر رہی ہوں' چوتھے دن جواب دیا ہے اور پوچھ رہے ہیں' کس چیز کا علاج؟''

مجھے بڑا غصہ آیا اس لیے کرخت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں کہا کس نے ہے سلام کرنے کی زحمت کو؟ نہ جان نہ پہچان اور چلی ہیں سلام کرنے کو۔''

''ہم نے تو سنا تھا کہ سلام کرنا نیکی ہے' خاص کر بزرگوں کو۔ سلام میں پہل کرنے والے کو زیادہ ثواب ملتا ہے' میں نے تو پہل بھی اسی لیے کی تھی' مجھے کیا پتا تھا' یہاں معاملہ ہی الٹا ہے' نیکیاں برباد' گناہ نازل۔''

''گھر میں اور خاندان میں کافی لوگ ہوں



گے۔ نیکیاں کمانے کا اتنا ہی شوق ہے تو انہیں سلام کر کے پورا کیا کرو۔ ہمیں معاف ہی رکھو۔'' اتنا کہہ کر میں آگے نکل گیا' وہ وہیں کھڑی رہی۔ تھوڑی دور جا کر میں نے مڑ کر دیکھا' وہ وہیں کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کھا جائے گی۔ میں واپس آیا اور اس سے کہا۔ ''بڑوں کی بات پر گرمی نہیں کھاتے' یہ بھی نیکی ہے۔ اپنا میٹر بھی ٹھیک کراؤ' زیادہ تیز چلتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں فوراً وہاں سے نکل آیا۔ پیچھے سے اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ ''بڑے آئے بڑے میاں' دیکھ لوں گی کتنے بڑے ہیں۔''

دو دن خیریت سے گزر گئے۔ جنکشن پر ہمارا کراس تو ہوا لیکن ایسے جیسے سگنل ڈاؤن ہو یا بتی سبز۔ دونوں چپ چاپ گزر گئے۔ میں خوش تھا کہ اس کی تسلی ہوگئی' جان چھٹی لیکن تیسرے روز جنکشن پر پہنچا تو بتی سرخ تھی۔ مجھے روک کر بولی۔ ''آپ اپنے کانوں کا ہی نہیں' آنکھوں کا بھی علاج کرائیں۔''

''کیوں' اب ان سے کیا تکلیف پہنچ گئی آپ کو اور اس طرح کیوں میرا راستہ روک لیتی ہیں آپ؟''

''جدھر سے گزرتی ہوں' لوگ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں' بڑی بڑی عمروں کے لوگ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہیں لیکن دو دن سے آپ کے پاس سے گزر رہی ہوں' آپ کو نظر ہی نہیں آ رہی؟ نظر کے قصور کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے اور راستہ تو میں آپ کا روکوں گی' جتنی بے عزتی آپ نے اُس دن میری کی تھی' اُس کا بدلہ تو میں نے لینا ہے۔''

''دیکھو' آنکھیں میری بالکل ٹھیک ہیں' تم نظر بھی آتی ہو لیکن ضروری تو نہیں کہ سب ہی تمہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھیں۔ غیر محرموں کو میں ایسے نہیں دیکھتا۔''

''کن کو ایسے دیکھتے ہیں آپ' محرموں کو؟ تو محرم ہی بنا لیں اپنی۔''

''کیا بکواس ہے' شرم نہیں آتی تمہیں؟ اپنی عمر دیکھو اور میری دیکھو' تمہارے باپ کے برابر ہوں گا۔''

''کوئی بکواس نہیں' کوئی غیر شرعی بات نہیں کی میں نے۔ عمروں سے کیا فرق پڑتا ہے' آپ نے شاید پڑھا نہیں' عمر نہیں' فریکوئنسی (frequency) ایک ہونی چاہیے۔ اگر ایک فریکوئنسی پر نہ ہوں تو پھر چاہے ہم عمر بھی ہوں' اکٹھے نہیں چل سکتے۔ ویسے بھی بقول شاعر۔

چاہت میں کیا دنیاداری' عشق میں کیسی مجبوری
دنیا کا کیا' سمجھانے دو' ان کی اپنی مجبوری

''لاحول ولاقوۃ الاباللہ'' میں نے جیسے ہی لاحول پڑھی' وہ ایسے بھاگی کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ آفس تک میں اُسی کے متعلق سوچتا رہا' خاصی خبیث' کچی اور شرارتی لڑکی نظر آتی تھی لیکن شرمندگی کا باعث بھی بن سکتی تھی اس لیے اس کا بندوبست ضروری تھا۔ اس سے جان چھڑانے کے طریقے سوچنے لگا۔ یہی ذہن میں آیا کہ یا تو راستہ تبدیل کیا جائے یا ٹائم۔ گاڑی پر بھی آ سکتا تھا لیکن میرے پاس واک کا اور کوئی وقت نہیں تھا۔ آخر پہلے ٹائم میں تبدیلی کا فیصلہ کیا۔

دوسرے دن میں گھر سے پندرہ منٹ دیر سے نکلا۔ جنکشن پوائنٹ پر وہ نظر نہ آئی تو تسلی ہوئی کہ طریقہ کامیاب رہا لیکن دو چار قدم میں آگے چلا تھا کہ وہ پارک کے بنچ پر بیٹھی نظر آئی۔ دیکھ بھی ادھر ہی رہی تھی اس لیے فوراً اٹھ کر آ گئی۔ آتے ہی کہنے لگی۔

''اگر آپ کا خیال ہے کہ ٹائم بدل کر یا روٹ

بدل کر مجھ سے جان چھڑا سکتے ہیں تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ محترمی کمال احمد صاحب! میں آپ کو بھی جانتی ہوں اور آپ کے عہدے اور حیثیت کو بھی۔ میں نے آپ کا گھر بھی ڈھونڈ لیا ہے اور آفس بھی۔ اگر آپ نے کوئی گڑبڑ کی تو میں وہاں بھی پہنچ سکتی ہوں جو یقیناً آپ کے لیے کوئی ایسا خوشگوار نہ ہوگا۔ ویسے میں نے آج یہاں سے اٹھنا تو نہیں تھا۔ پیریڈ مس ہوتا' کالج سے نکال دیتے یا گھر سے جھاڑ پڑتی' یہی ہوتا نا' ہوتا رہے لیکن ذمہ داری ساری آپ پر ہوتی۔"

"لیکن کیوں؟ آخر میری غلطی کیا ہے؟ میں نے کوئی زیادتی یا ایسی ویسی حرکت کی ہے تو بتاؤ' خواہ مخواہ میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو؟ آخر کوئی بات بھی تو ہو؟"

"کچھ بھی نہیں نہ آپ نے کوئی زیادتی کی ہے نہ ایسی ویسی حرکت' بس میری مرضی جو میرا دل چاہا' میں نے کر دیا۔ میں بس اپنے دل کا کہا مانتی ہوں۔ جو کچھ یہ چاہتا ہے' وہی کرتی ہوں۔"

"کیوں' یہ صرف تمہاری ہی دنیا ہے کیا' یہاں اور لوگ بھی تو ہیں' ان کے بھی تو دل ہیں۔ اگر سب اپنے ہی دل کا کہا مانیں' اپنی ہی مرضی کریں تو کیا حال ہوگا اس دنیا کا اور پھر یہ تمہارا دل اپنے کسی ہم عمر کو کیوں نہیں چاہتا؟ اس بوڑھے پر کیوں نظر کرم ہے؟"

"ہم عمر چھچھورے ہیں' الٹی سیدھی حرکتیں کرتے ہیں' کئی لڑکوں نے قریب آنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے بالکل اچھے نہ لگے' یہ دل نہ مانا۔ آپ کے ساتھ بھی یہ سلسلہ میں نے یونہی نہیں شروع کیا' کافی دنوں سے میں آپ کو دیکھ رہی تھی' چپ چاپ ناک کی سیدھ میں چلنے والے' کوئی دائیں بائیں تاک جھانک نہیں' کوئی غلط حرکت نہیں' عورت کی تو آپ کو پتا ہے نا' صرف دو ہی آنکھیں نہیں ہوتیں' مکھی کی طرح بہت سی ہوتی ہیں' آگے پیچھے' دائیں بائیں' ہر طرف۔ ہر طرف سے آنے والی نظر کو یہ دیکھ بھی سکتی ہے اور پہچان بھی۔ میں نے آپ کو ہر طرف سے اور ہر طرح سے دیکھ لیا ہے اس لیے ہاتھ بڑھایا ہے۔ باقی رہی یہ دنیا تو یہ دنیا جائے جہنم میں' میں نے کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا اس کے خیال رکھنے کا۔"

"اگر میں ہاتھ نہ بڑھاؤں تو؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کی مرضی لیکن میں اپنا ہاتھ پیچھے نہیں کھینچوں گی اور یہ بھی سن لیں' ایک دن آپ کو بھی ہاتھ بڑھانا ہی پڑے گا۔"

"لیکن کیوں' تم اگر اپنی مرضی کر رہی ہو تو میری بھی کوئی مرضی ہونی چاہیے۔ میں نے تو نہیں چاہا کہ تم میرے ساتھ نتھی ہو جاؤ۔" اس پر وہ کچھ روہانسی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں مجھے بھیگتی نظر آئیں اور وہ بنچ پر بیٹھ گئی۔ بھیگی آنکھیں اور آنسو عورت کے بہت خطرناک ہتھیار ہیں' مرد کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے ہیں' ہمدردی سمجھے یا شکست' میں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ مجھے اپنے سخت الفاظ پر افسوس ہوا۔ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔

"یہ بھی تو سوچو' جتنا سیدھا تم مجھے سمجھ رہی ہو' میں اتنا سیدھا نہ نکلوں تو؟ کیا پتہ میں نے چہرے پر شرافت کا خول چڑھایا ہوا ہو؟"

"جو بھی ہو' میرے نصیب۔ آپ اپنی مرضی کریں' میں اپنی مرضی کروں گی۔ آپ نے دھوکہ دیا تو کیا ہو جائے گا' کھا لو گی؟ غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں' ایک اور سہی اور ہاں' یہ کوئی عاشقی معشوقی یا شادی بیاہ کا چکر تو ہے نہیں' دوستی ہے یا میری ضد' میں کچھ آپ سے مانگ تو نہیں رہی' بس تھوڑا سا ہنس کر بول لیا کریں۔ تھوڑی سی توجہ' بے رخی میں برداشت



نہیں کر سکتی۔"

"لیکن تم سوچتی کیوں نہیں' کس راہ پر چل نکلی ہو اور انجام کیا ہو سکتا ہے؟ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو تم تو بچی سمجھ کر چھوٹ جاؤ گی' مصیبت میرے گلے میں پڑ جائے گی کہ اسی بڈھے نے بچی کو پھنسا لیا ہے۔ وہ تو بچی ہے' معصوم ہے' ویسے تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"کس چیز کا ڈر' کس کس کا ڈر؟ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ میں ہوں کیا' عورت ہوں یا چیونٹی؟ ہر وقت ڈر' ہر طرف سے ڈر' گھر ہو تو بہن بھائیوں کا ڈر' ماں باپ کا ڈر' گھر کی عزت کا ڈر' چادر اور چار دیواری کا ڈر' اسکول' کالج میں ہوں تو اساتذہ کا ڈر' ہم جماعتوں اور دوستوں کا ڈر' اسکول' کالج ڈسپلن کا ڈر' باہر ہوں تو خدا کا ڈر' جنت دوزخ کا ڈر' سوسائٹی کا ڈر' لوگوں کا ڈر' ڈر ہی ڈر' ہر طرف ڈر' کہاں جائے بندہ؟ کبھی کبھی ٹیلی وژن پر اینیمل پلینیٹ (Animal Planet) چینل میں ہرنوں کو دیکھتی ہوں تو خود کو بھی ہرنی ہی سمجھنے لگتی ہوں۔ اس میں اور مجھ میں فرق ہی کیا ہے' اس کے بھی چاروں طرف ڈر ہی رہتا ہے' اس پر تو لومڑی' گیدڑ اور کتوں جیسے معمولی جانور بھی شیر ہوتے ہیں۔ یہی حالت میری بھی ہے' آپ کو پتا ہے' ڈر زیادہ ہو جائے تو ختم ہی ہو جاتا ہے۔ میرا بھی ختم ہو گیا ہے' اب میں کسی سے نہیں ڈرتی۔"

"بہت جذباتی ہو گئی ہو' میرے خیال میں چلنا چاہیے۔ کالج سے بھی لیٹ ہو رہی ہو گی۔"

"میں نے نہیں جانا آج کالج۔ آپ نے میری طبیعت خراب کر دی ہے۔"

"لیکن میں نے تو آفس جانا ہے نا' اس لیے چلتے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے لیکن آئندہ سیدھے رہنا ہے' کوئی گڑبڑ نہیں کرنی۔" خدا حافظ کہہ کر ہم دونوں اپنے اپنے راستے پر روانہ ہو گئے۔

آفس آ کر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ معاملہ الجھتا ہی جا رہا تھا۔ جتنا میں اس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا' وہ اتنی ہی چپکتی جا رہی تھی۔ معاملہ ایسا تھا کہ اس میں کسی سے مشورہ بھی نہیں لیا جا سکتا تھا۔ بیس' بائیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی' ایک عمر رسیدہ مرد کے پیچھے کیوں پڑ سکتی ہے؟ کتنے ہی دیکھے' سنے اور پڑھے واقعات اور طرح طرح کے خیالات ذہن میں آنے لگے۔ خوبصورت لڑکیوں کے ذریعے مردوں کو پھانس کر بلیک میل کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے کام نکلوانے کے لیے لڑکیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ جنسی کاروبار کرنے والے بھی لڑکیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ عورتیں خود بھی اپنے کام نکلوانے کے لیے ایسے چکر چلاتی ہیں۔ پتا نہیں' یہ کس چکر میں ہے لیکن کوئی چکر ہے ضرور اس لیے میں نے ہر صورت میں اس سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا پھر راستہ اور ٹائم بدلنے کا خیال آیا۔ دیر سے آ کر تو دیکھ لیا تھا' اب جلدی آنے کا فیصلہ کیا۔ اگلا قدم راستہ بدلنے کا تھا۔

اگلی صبح میں معمول سے آدھا گھنٹہ پہلے گھر سے نکلا اور خیریت سے آفس پہنچ بھی گیا۔ کوئی دس بجے ایک لفافہ ملا۔ اندر بڑی مختصر سی تحریر تھی۔ اوپر سے سرخ سیاہی سے وارننگ لکھ کر اسے انڈر لائن کیا گیا تھا۔ نیچے ایک ہی لائن میں لکھا ہوا تھا۔ "اگر آئندہ آپ نے ایسی حرکت کی تو خط نہیں آئے گا' میں خود آؤں گی۔" اور اس کے نیچے تھا۔ "فقط وہی۔"

بیڑہ غرق اور ٹھنڈی سڑک۔ یہ طریقہ بھی ناکام ہو گیا تھا۔ کچھ سوچنے کے لیے میں نے کرسی سے ٹیک لگائی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو دوسری طرف وہی تھی۔ میں نے ہیلو کہا تو بولی۔

"اب پہچاننے سے انکار نہ کر دیجیے گا نہ فون

رکھے گا۔''

''تمہاری آواز کون نہیں پہچانے گا اور مجھے فون رکھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔''

''شاباش' لگتا ہے' کان بہتر ہو گئے ہیں۔''

''یہ تم لوگوں نے کوئی کلینک تو نہیں کھولا ہوا' کبھی کانوں کے علاج کی بات کرتی ہو' کبھی آنکھوں کی۔ اگلی دفعہ دل اور جگر کی بات کرو گی۔ اپنے دماغ کا ہی کیوں نہیں علاج کرا لیتیں؟ سارا مسئلہ ہی ختم ہو جائے۔''

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' بس آپ ذرا ٹھیک ہو جائیں۔ خط تو میرا مل ہی گیا ہو گا' یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ میں نے فون نمبر بھی لے لیا ہے' بس یہ وارننگ ہے۔ آئندہ حالات کا دارومدار آپ پر ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

فون رکھ کر میں پھر سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے؟ راستہ بدلنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اس کو آفس کا بھی پتہ تھا اور اس کے پاس فون نمبر بھی تھا۔ فون نمبر تو شاید اس نے آفس کے بورڈ سے پڑھ لیا ہو لیکن اس پر میرا موبائل نمبر نہیں تھا اس لیے میں نے اسٹاف کو سختی سے منع کر دیا کہ کسی کو میرا موبائل نمبر نہ دیں پھر میں نے سوچا' ہفتہ دس دن کے لیے شہر سے باہر چلا جاتا ہوں' واپسی تک شاید یہ بھول بھال چکی ہو۔ ہمارا گاؤں زیادہ دور نہیں' تین چار گھنٹے کا راستہ ہے' میں نے آفس سے ہفتے کی چھٹی لی اور شام کو گاؤں چلا گیا۔ پہلا دن امن و امان سے گزرا۔ دوسرے دن موبائل پر اس کی کال آئی۔ میں بڑا حیران ہوا' پتہ نہیں' اس نے نمبر کہاں سے لیا تھا؟ بڑے غصے میں تھی' سلام دعا سے پہلے ہی شروع ہو گئی۔ ''اگر آپ کا خیال ہے کہ مجھ سے اس طرح بھاگ سکیں گے تو دل سے نکال دیں' اندازہ ہے کہ آپ کا نمبر کتنی مشکل سے ملا ہے؟''

مجھے اس پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں کہا کس نے ہے کہ میرا نمبر ڈھونڈتی پھرو؟ مجھے کام تھا' چلا آیا' تمہیں کیا' کوئی تمہارا قیدی تو نہیں۔''

''آپ کو میرا اتنا بھی خیال نہیں کہ بتا کر چلے جاتے؟ میرے قیدی نہ سہی' کچھ تو ہیں۔'' اس کی آواز مجھے بھیگتی ہوئی محسوس ہوئی جس نے مجھے موم کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے آنسو موبائل میں ہی بہہ کر آ جائیں گے۔ میں نے کہا۔

''او بابا! مجھے یہ تو بتاؤ' میں کس کھاتے میں تمہیں اطلاع دیتا؟ تم میری ہو کون؟ پھر اگر اطلاع دینا بھی چاہتا تو کیسے دیتا' میرے پاس تو تمہارا نمبر ہی نہیں' نمبر کو چھوڑو' مجھے تو تمہارا نام بھی نہیں معلوم۔''

''ہاں' یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کے پاس میرا نمبر نہیں لیکن اگر کوئی ڈھونڈنا چاہے تو مل ہی جاتا ہے۔ مجھے بھی تو مل ہی گیا تھا نا' باقی رہی بات کہ میں آپ کی ہوں کون تو یہ مجھے بھی پتا نہیں لیکن ہوں بہت کچھ۔ جہاں تک نام کا تعلق ہے' نام میں کیا رکھا ہے' آپ کچھ بھی کہہ لیں۔''

''کیا کہہ لوں؟ تم کہہ رہی تھیں کہ مکھی کی طرح تمہاری ہر طرف آنکھیں ہیں تو مکھی ہی نہ کہہ لوں؟ اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟'' اس کے قہقہے کی آواز آئی۔ ''ایک دفعہ تم کہہ رہی تھیں کہ خود کو جنگل کی ہرنی سمجھتی ہو' غزالہ ہی نہ کہا کروں؟'' اس پر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ میری باتوں نے اس کا موڈ سیٹ کر دیا تھا۔ اس کی ہنسی بھی تو کیا ہنسی تھی' جھرنے سے بہہ نکلتے تھے۔ کتنی دیر جلترنگ سی بجتی رہتی۔ اس کے بعد ہر لفظ رس گھولتا' اس نے رس گھولا۔

''خبردار جو مجھے مکھی کہا' میں آپ کو مکھی لگتی ہوں؟'' پھر اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''یہ غزالہ جو آپ کہہ رہے تھے' کہیں مجنوں والی غزالاں تو نہیں؟ اگر وہی ہے تو پھر تو اس کے لیے مجنوں بھی ڈھونڈنا



پڑے گا۔ اگر آپ مجنوں بننے کو تیار ہوں تو میں بھی غزالاں بننے کو تیار ہوں۔''

''لاحول ولا قوۃ۔'' جیسے ہی میں نے لاحول پڑھی' اس نے موبائل بند کر دیا۔ پتا نہیں کیوں؟

اگلے دن اس کی کال آئی تو سب سے پہلے میں نے یہی پوچھا۔ ''یہ چکر کیا ہے' کل میں نے جیسے ہی لاحول پڑھی' تم نے موبائل آف کر دیا۔ ایک دن پہلے بھی یہی ہوا تھا کہ میں نے جیسے ہی لاحول پڑھی' تم بھاگ گئیں؟''

بولی۔ ''میں دراصل شیطان کی ڈیوٹی پر ہوں۔ لاحول سے تو بھاگنا ہی ہے۔ اچھا' ان باتوں کو چھوڑیں' یہ بتائیں' واپس کب آ رہے ہیں؟''

''تم تو میری بیوی بنتی جا رہی ہو۔ ہر بات کی باز پرس کرنے لگی ہو۔ بابا' تم سے ہی تو بھاگ کر یہاں آیا ہوں' تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں کب آ رہا ہوں؟''

''یہ بات ہے تو پھر دو دن کا نوٹس ہے' اگر آپ دو دن میں واپس نہ آئے تو تیسرے دن میں آ جاؤں گی۔''

''یہاں تمہارے والد صاحب بھی نہیں پہنچ سکتے اسی لیے تو یہاں آیا ہوں۔''

''والد صاحب کا تو پتا نہیں لیکن میں آپ کو پہنچ کر دکھاؤں گی' بس آپ استقبال کے لیے تیار رہیے گا۔''

میں آرام سے بیٹھ گیا۔ اس کی تڑی کو ذہن سے نکال دیا لیکن دوسرے دن اس کی کال آئی تو میرے ہوش اڑ گئے۔ اس نے میرے گاؤں کا ایڈریس اور پہنچنے کا طریقہ تفصیل سے بتا کر پوچھا۔ ''اب کیا خیال ہے اور کیا پروگرام ہے؟''

''خیال تو جو بھی ہے' اس کو چھوڑو' تم یہ بتاؤ کہ چڑیلیں کیسی ہوتی ہیں؟''

''بس میرے ہی جیسی ہوتی ہیں' یہی سننا چاہتے تھے نا آپ؟'' اس نے قہقہہ لگایا پھر اس کی اسی جلترنگ میں کھوئے میں نے اس سے اگلے دن واپس آنے کا وعدہ کر لیا۔ حسبِ وعدہ میں اگلے دن اسلام آباد پہنچ بھی گیا۔

میرا خیال تھا کہ دوسرے دن تصدیق کے لیے فون ضرور کرے گی کہ میں واپس آیا بھی ہوں یا نہیں لیکن اس نے نہ کیا' غالباً یقین تھا کہ میں ضرور آ گیا ہوں گا اس لیے کہ اس نے طریقہ ہی ایسا استعمال کیا تھا۔ ایک دفعہ تو دل میں آئی کہ میں ہی رپورٹ کر دوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہو گئی ہے۔ اس کا نمبر تو میرے موبائل میں آ ہی چکا تھا لیکن پھر اس ڈر سے نہ کیا کہ کہیں اپنا نمبر چھپانے کے لیے اس نے فون کسی اور نمبر سے نہ کیا ہو۔ ایک تو کوئی نہ کوئی ڈر ہر وقت ہمارے پیچھے لگا ہی رہتا ہے' بعض اوقات تو میں بھی خود کو ہرن ہی سمجھنے لگتا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ڈر' ہر طرف کوئی نہ کوئی ڈر۔ زندگی تو ویسے بھی جنگل کی رات بن کر رہ گئی ہے۔

زندگی جیسے رات جنگل کی
ہر قدم پر ہے ایک ڈر صاحب

اگلے دن میں معمول کے مطابق اپنے وقت پر گھر سے نکلا۔ جنکشن سے کچھ پہلے میں رک گیا تا کہ اسے دیکھ لوں کہ آئی ہے یا نہیں؟ وہ جنکشن پوائنٹ سے کچھ پیچھے کھڑی نظر آئی' غالباً وہ بھی یہی دیکھ رہی تھی کہ میں آتا ہوں یا نہیں؟ مجھے دیکھتے ہی کھِل اٹھی۔ وہ ہی کیا' سارا پارک ہی کھِل اٹھا۔ اس کی مسکراہٹ تھی ہی ایسی' سارے ماحول میں رنگ بھر دیتی تھی۔

ملتے ہی بولی۔ ''شاباش' یہ ہوئی نا بات' بس اسی طرح سیدھے سیدھے چلتے رہیں۔''

''تم نے کیا دوسروں کو سیدھا کرنے کا ٹھیکہ لے

رکھا ہے؟ خود ہی کیوں نہیں سیدھی ہو جاتیں' سارا معاملہ ہی سیدھا ہو جائے۔ ٹیڑھے آدمی کو ہر چیز ٹیڑھی نظر آتی ہے۔''

''نہ میں خود ٹیڑھی ہوں نہ مجھے ٹیڑھا نظر آتا ہے' بس آپ پر کنٹرول رکھنا ضروری ہے۔''

مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ ''مجھے یہ بتاؤ' مجھے کیا تم نے الاٹ کرا لیا ہے جو اتنا کنٹرول دکھا رہی ہو؟''

''بالکل' الاٹمنٹ لیٹر ہے میرے پاس' کہیں تو دکھا دوں؟'' اس نے قہقہہ لگایا' قہقہہ کیا تھا' قتل عام تھا۔

''برائے مہربانی سرِ عام اس طرح قہقہے نہ لگایا کرو۔ اسی طرح قتل عام کرتی رہیں تو کسی دن نقصِ امن کے خطرے کے پیشِ نظر پولیس ہی نہ پکڑ کر لے جائے۔''

''خبردار' یہ آپ لوگوں کو شاعری کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ کوئی کہتا ہے' قتل عام کر رہی ہو' کوئی کہتا ہے' پھول برسا رہی ہو' کوئی کہتا ہے' رنگ برساتی ہو' میں کیا کروں؟ ہنسوں' مسکراؤں ہی نہیں' بس روتی بسورتی ہی رہوں۔ اب روؤں گی تو آپ لوگ کہیں گے فضا سوگوار ہو گئی ہے' آنسوؤں کی ندیاں بہہ رہی ہیں' خزاں چھا گئی ہے اور پتا نہیں' کیا کیا' ہاں سچ' کہیں آپ شاعر تو نہیں؟ اللہ مجھ پر رحم کرے۔''

''نہیں' نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ ٹاٹا کرتے ہوئے بھاگ گئی۔

آفس آ کر میں نے پھر اسی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ اس بلا سے جان چھڑانا ضروری تھا۔ کچھ نہ سوجھی تو کسی سے مشورے کا فیصلہ کیا حالانکہ ایسے معاملات میں کسی کو رازدار بنانا بڑا مشکل اور خطرناک کام ہوتا ہے۔ اسلم میرا پرانا دوست اور قابلِ اعتماد رازدار ہے۔ اسے میں نے فون کر کے آفس میں ہی بلا لیا' اس کے آنے پر میں نے اسے ساری تفصیلات بتائیں۔ سننے کے بعد کہنے لگا۔ بظاہر تو یہ بلیک میلنگ وغیرہ کا ہی چکر لگتا ہے لیکن ضروری نہیں' یہ سائیکو کیس بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے' زیادہ عمر کے کسی مرد نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہو جس کی وجہ سے اسے مرد ذات' خاص کر زیادہ عمر کے لوگوں سے نفرت ہو گئی ہو اور وہ انتقاماً ایسی حرکتیں کر رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سوتیلے باپ یا کسی اور نے اس پر یا اس کی والدہ وغیرہ پر ظلم کیا ہو جس کی وجہ سے یہ مردوں کی دشمن بن گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا ہو' انتقاماً یہ بھی اب دوسروں کی زندگی میں زہر گھول رہی ہو۔ کئی چیزیں ہو سکتی ہیں پھر سائیکو کیس تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

ہم لوگ دیر تک سوچتے رہے کہ اس لڑکی کو کیسے کھولا جائے تاکہ یہ اپنے متعلق کچھ بتائے۔ پتا تو چلے کہ وہ کیا ہے اور چاہتی کیا ہے؟ فیصلہ ہوا کہ اسے اعتماد میں لیا جائے' ممکن ہو تو باہر ذرا فاصلے پر لے جایا جائے۔ علیحدگی میں یا دور جاتے ہوئے ڈرے تو اسے کہا جا سکتا ہے کہ جب تمہیں اعتبار نہیں تو پیچھے کیوں پڑی ہو' جان چھوڑو۔ مان جائے تو تنہائی میں اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کی جائے۔

دوسرے دن ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ ''یہاں تم تو نہیں ڈرتیں لیکن میں ہر وقت ڈرتا رہتا ہوں کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ میرا خیال ہے' کہیں باہر چلتے ہیں' ایسی جگہ جہاں کوئی جان پہچان والا دیکھ نہ سکے۔''

وہ بجائے ڈرنے یا سوچنے کے' وہ فوراً مان گئی' ایسا لگا جیسے وہ خود بھی یہی چاہتی ہو۔ جگہ کا نام دامنِ کوہ اس نے خود تجویز کیا' دن بھی اس نے ورکنگ ڈے رکھا' چھٹی کا نہیں اور وقت بھی دوپہر کا رکھا



تاکہ وہاں کم سے کم لوگ ہوں۔ میں نے اپنی طرف سے جگہ' وقت یا دن کا مشورہ نہ دیا تاکہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو پھر اچانک اس نے اسی وقت چلنے کا کہا۔ شاید اس لیے تاکہ میں کوئی پروگرام نہ بنا سکوں۔

میں نے کہا کہ مجھے آفس سے چھٹی بھی لینی ہو گی اور گاڑی بھی اس لیے اسے انتظار کرنا پڑے گا۔ اس نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ میں نے آفس جا کر چھٹی لی اور پھر گاڑی لے کر پارک میں آ گیا۔ وہ منتظر تھی۔

اُسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں' یہ کار میں آگے بیٹھتی ہے یا پیچھے؟ لیکن وہ تو دھڑلے سے اگلا دروازہ کھول کر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ نکلتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''گھر والوں سے کیا بہانہ کرو گی اور کالج میں کیا؟'' فٹ بولی۔

''بہانے کی کیا ضرورت ہے' صاف صاف کہہ دوں گی کہ آپ کے ساتھ گئی تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بکواس مت کرو' تمہیں شرم نہیں آتی؟'' میں جھینپ گیا۔

''نہ یہ کوئی بکواس ہے نہ اس میں کوئی شرم کی بات ہے' آپ کو آتی ہے تو کرتے رہیں۔ دوستوں کے ساتھ جانے کا ہی بہانہ کیا جاتا ہے نا' آپ دوست ہی تو ہیں۔'' میں اسے گھور کر رہ گیا اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ کہتے ہیں' سفر پر یا تفریح کے لیے جائیں تو اپنے اندر کے بچے کو ضرور زندہ رکھیں اور ساتھ لے جائیں تاکہ بچوں کی طرح لطف اندوز ہو سکیں لیکن وہ تو خود سراپا بچی بن گئی تھی۔ ایک ایک لمحے اور ایک ایک چیز سے لطف اندوز ہوتی' جگہ جگہ گاڑی روکتی' ایک ایک چیز کے لیے مچلتی اور ضد کرتی' راستے میں ایک چلڈرن پارک میں اس نے جھولے بھی لیے' پینگ (swing) پر تو اسے خاص طور پر بہت مزہ آیا۔ ہوا میں اوپر جاتی تو بچوں کی طرح چیختی' پینگ پر اس نے مجھے بھی جھولے کی دعوت دی لیکن میں نے معذرت کر لی۔ راستے کے ہر متوجہ بندر کا اس نے منہ چڑایا' اُس کی حالت دیکھ کر میں نے سوچا' دامن کوہ پر لوگ ہوں گے' یہ کہیں شرمندہ نہ کرے اس لیے اسے اوپر پیر سوہاوہ چلنے کو کہا مگر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پہلے یہاں کچھ کھلائیں پلائیں پھر آگے جائیں گے۔ خود تو روزہ رکھا ہوا ہے' مجھے خواہ مخواہ بھوکا مار رہے ہیں۔ پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے دامنِ کوہ میں اوپر پہنچے تو مزہ آ گیا۔

شام کا وقت تو نہیں تھا لیکن گہرے بادلوں نے شام کر دی تھی۔ نم آلود ٹھنڈی ہوا نے تو اسے پاگل کر دیا۔ وہ تقریباً بھاگ کر ویو پوائنٹ پہنچی۔ میں بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلا' دوڑ میں اس کا ساتھ تو دے نہیں سکتا تھا۔ نزدیک پہنچا تو اس کی آواز آئی۔

''اب چلیں بھی' کیا بوڑھوں کی طرح رینگ رہے ہیں؟.....'' جیسے ہی میں ویو پوائنٹ پر پہنچا' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایسی جگہ لے گئی جہاں سے منظر واقعی بہت خوبصورت تھا۔ اسلام آباد ہمارے قدموں میں تھا۔ بادل مرگلہ کی پہاڑیوں سے لپٹے جا رہے تھے۔ فیصل مسجد سے راول جھیل تک سارے اسلام آباد نے جیسے بادل اوڑھ لیے تھے۔ وہ مسحور تھی' دیکھنے سے دل بھرا تو اس نے آنکھیں بند کر کے ہوا سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ ہوا نے مست کیا تو اس نے بازو پھیلائے اور گھومنا شروع کر دیا جیسے بچے گھومتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے نشے میں ہو' مجھے ڈر لگا' کہیں چکر کر گر ہی نہ جائے اس لیے اس کے قریب ہو گیا۔ اسے کہا بھی کہ کہیں گر ہی نہ جاؤ؟

جواب ملا۔ ''کوئی بات نہیں' آپ جو ہیں۔'' اور پھر اچانک اُسے چکر آیا اور گرنے لگی لیکن میں نے جلدی سے اُسے تھام لیا۔ کچھ دیر وہ اسی حالت میں رہی پھر جیسے ہی میں نے اسے نیچے لٹانے کا سوچا' وہ ہوش میں آ گئی۔ خود کو میری بانہوں میں دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

''آج تو گرتوں کو تھام رہے ہیں' ساقی بنے ہوئے ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا' آپ جو ہیں' گرنے نہیں دیں گے۔'' پھر اسی منظر والی جگہ گئی اور پوچھنے لگی۔ ''کیسا منظر ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارے جیسا۔''

وہ مسکرائی اور بولی۔ ''میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

میں نے کہا۔ ''اس منظر جیسی۔''

ایک نظر اُس نے منظر پر ڈالی' ایک مجھ پر اور بولی۔ ''کاش' آپ خود کو بھی دیکھ سکتے۔'' اور آ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ شکر ہے' اردگرد کوئی نہیں تھا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ ''ترس آتا ہے آپ پر' فکر نہ کریں' اردگرد بندروں کے سوا کوئی نہیں اور بندروں کو ان معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کیسی مزے کی زندگی ہے ان کی۔''

''خیال ہے تمہارا' ذرا کسی بندر یا کو بیچ میں آنے دو پھر تماشہ دیکھنا۔''

''لیکن آپ اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ کس سے ڈرتے ہیں' دوسرے بندر سے؟''

''دوسرا بندر ضروری نہیں اور بہت کچھ ہے ڈرنے کو۔ مذہب ہے' معاشرہ ہے' گھر ہے۔ جنگل میں تو ڈر ہی ڈر ہے۔'' پھر اس کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے کہا۔ ''تم تو کچھ کھانے پینے کے لیے آئی تھیں' چلو' کچھ کھاتے پیتے ہیں' بھوک لگ گئی ہے۔''

وہ بولی۔ ''پہلے روح کی غذا تو کھانے دیں' میں تو ترسی ہوئی ہوں۔''

پھر میں اُسے تقریباً گھسیٹ کر ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ کھانا ہم نے بڑے آرام وسکون سے کھایا۔ کھانا کھا کر جیسے ہی نکلے' اس نے کہا۔ ''آئیں' میں آپ کو ایک اور جگہ دکھاتی ہوں۔'' جس جگہ وہ لے گئی' وہ واقعی بہت خوبصورت اور پرسکون تھی۔ وہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ میں نے جگہ کا ایک چکر لگایا اور ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی تھوڑی دیر اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ بڑی مسرور لگ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آج تو تمہارا رنگ ہی بدل گیا ہے۔''

وہ چہکی۔ ''کیسے نہ بدلتا' زندگی کا اتنا خوبصورت رخ کبھی کبھی ہی تو دیکھنے کو ملتا ہے۔ کاش' یہ ہمیشہ ایسی ہی رہ سکتی۔ آپ بھی تو بتائیں' آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟''

''لگ تو بہت اچھا رہا ہے لیکن ڈر بھی بہت لگ رہا ہے۔ اب پوچھو گی کہ کس سے؟ تو مجھے ڈر تم سے بھی لگ رہا ہے اور تنہائی سے بھی۔ دیکھو نا' ایک سنسان جگہ پر ایک مرد اور عورت کا تنہا ہونا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے؟''

''آپ بھی عجیب چیز ہیں' رونق والی جگہ پر لوگوں سے ڈرتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ اب تنہائی میں مجھ سے ڈر رہے ہیں' کہاں لے جاؤں میں آپ کو؟ فکر نہ کریں' کھا نہیں جاؤں گی آپ کو۔'' پھر بڑبڑائی۔ ''کیا چیز بنائی ہے اللہ میاں نے!''

''میں تو جو کچھ بھی ہوں' تمہارے سامنے



ہوں لیکن تمہارا جغرافیہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا' تم ہو کیا چیز؟''

''میں بس چیز ہی ہوں' میرا جغرافیہ سمجھنا آسان نہیں' اس میں آپ کو کافی وقت لگے گا۔ فی الحال اتنا ہی سن لیں کہ میں کم از کم وہ نہیں ہوں جس سے آپ ڈر رہے ہیں۔ آپ یہی سوچ رہے ہوں گے نا کہ کسی بلیک میلر کی ایجنٹ ہوں یا خود بلیک میلر ہوں' جنس کا کاروبار کرنے والے کسی گروہ یا کسی غیر قانونی کام کرنے والے سے تعلق نہ ہو' تسلی رکھیں' ان میں سے کوئی بات بھی نہیں۔ میرا خیال ہے' آج اتنا ہی کافی ہے' باقی آئندہ ملاقاتوں پر رکھتے ہیں۔ اب کافی وقت ہو گیا ہے' واپس چلنا چاہیے۔''

واپسی کا سفر بھی اتنا ہی خوشگوار تھا جتنا جانے کا۔ جنکشن سے کچھ پہلے اس نے مجھے اتار دینے کا کہا' شاید نہیں چاہتی تھی کہ مجھے اس کے گھر کا پتا چلے۔ اسے اتار کر میں گھر چلا گیا۔ شام کو میں نے ساری تفصیل اسلم کو سنائی۔ مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور الجھ گیا تھا۔ یہی سوچا کہ انتظار کیا جائے' شاید آہستہ آہستہ خود ہی کھل جائے اور مزید معلومات حاصل ہو جائیں۔

دوسرے دن جنکشن پر ملاقات ہوئی تو اس کی آنکھوں میں کل کا خمار تھا اور چہرے پر اپنائیت کے رنگ پھر کئی دن اسی طرح راستے میں ملاقات ہوتی رہی۔ ایک دن اچانک اس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی۔ ''کتنے دن تو دامنِ کوہ پر گزرے دن کا خمار رہا۔ اب اترا ہے تو دل چاہتا ہے پھر ویسا ہی دن گزرے۔ کسی دن پھر نہ چلیں؟''

''ٹھیک ہے' چلیں گے کسی دن۔ مجھے بھی اُس دن بڑا اچھا لگا تھا۔''

بہت خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔ ''مزہ آئے گا لیکن اس دفعہ چلیں گے ذرا دور جہاں آپ کو دیکھے جانے یا کسی واقف کے ملنے کا خطرہ نہ ہو۔''

''لیکن کہاں؟ اتنی دور بھی نہ ہو کہ اسی دن واپسی مشکل ہو جائے۔'' مجھے تشویش ہوئی۔

''خیر ہے' اگر دیر بھی ہو گئی تو رات وہیں گزار لیں گے۔ آپ کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا؟ بس ایک ایک سوٹ ساتھ رکھ لیں گے۔''

''میرا کیا مسئلہ ہو گا' تم اپنا سوچو' رات باہر کیسے گزارو گی؟''

''میری فکر نہ کریں' میرے پاس بڑے طریقے ہیں' بس جس دن جانا ہوا' میں بتا دوں گی۔'' تاریخ اور جگہ شاید پہلے سے نہیں بتانا چاہتی تھی' ابھی غالباً پورا اعتماد نہ تھا۔ اگلے دن جنکشن پر ملاقات ہوئی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا۔ ملتے ہی کہنے لگی۔ ''چلیں تیار ہو جائیں' چلتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بتا تو دیا ہوتا' میں کچھ تیاری تو کر لیتا۔ میری سروس ہے' چھٹی بھی تو لینی ہوتی ہے۔ میں تو گاڑی بھی نہیں لایا۔''

''کون سی لمبی چوڑی تیاریاں کرنی ہیں' ایک ہی دن کی تو بات ہے' شام تک واپس آ جائیں گے۔ دیر ہو گئی تو رات گزار لیں گے' بس ایک سوٹ ساتھ رکھ لیں۔ آپ گاڑی لے آئیں' میں انتظار کرتی ہوں۔''

مجھے اس نے سنبھلنے یا بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ میں پہلے آفس گیا' چھٹی لی پھر گاڑی لے کر گھر گیا۔ ایک سوٹ گاڑی میں رکھا اور واپس جنکشن پر آ گیا۔ میرے آفس کا کام ایسا ہے کہ باہر آتے جاتے رہتے ہیں اس لیے گھر والوں نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی البتہ اسلم کو میں نے بتا دیا اور رابطہ رکھنے کا بھی کہہ دیا اس لیے کہ میری بھی تسلی نہیں تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تو میں نے پوچھا۔ ''اب بتاؤ' چلنا کدھر ہے؟'' کہنے لگی۔ ''مری روڈ پر چڑھتے ہیں پھر جدھر

سڑک اور گاڑی لے جائیں۔"

مری روڈ پر راول پارک کے بورڈ پر نظر پڑی تو کہنے لگی۔ "جھیل دیکھے کافی عرصہ ہوگیا ہے' چلیں' جھیل دیکھتے ہیں۔"

گاڑی پارک کر کے ہم پارک میں چلے گئے۔ پارک میں پہنچتے ہی وہ پھر بچی بن گئی۔ کبھی کونجوں کے پیچھے ہے تو کبھی قلفی والوں کے۔ کشتی دیکھ کر مچل گئی کہ کشتی کی سیر تو کبھی کی ہی نہیں' آج کر کے دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا بھی کہ دیر ہو جائے گی لیکن وہ نہ مانی۔ اسے تو کھلی فضا' تازہ ہوا اور سکون چاہیے تھا جو کشتی میں اسے خوب ملا اس لیے اسے بڑا مزہ آیا۔ بڑی مشکل سے اسے راول پارک سے نکالا۔ آگے چھتر پارک آیا تو پھر وہی ہوا لیکن یہاں میرے مجبور کرنے پر صرف کھا پی کر آگے نکل گئے۔ اسی طرح رکتے رکاتے مری پہنچے تو دوپہر ہوگئی تھی۔ گھومتے پھرتے رہے تھے اس لیے بھوک بھی لگی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ کھانا کھالیا جائے تاکہ اگلے فیز کے لیے تازہ دم ہوں۔ مال پر ایک جگہ کھانا کھایا اور دوبارہ روانہ ہوگئے۔ مری میں ہم زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتے تھے تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ وہاں سے ہم بھوربن گئے۔ بھوربن کے موسم اور مناظر نے اسے باگل کر دیا۔ اس کا بس چلتا تو رات بھی وہیں گزارتی لیکن میں اسے پٹریاٹہ وغیرہ کا چکر دے کر نکال لایا' پٹریاٹہ میں اس نے لفٹ چیئر کی سیر کی۔ اس کے بعد میں نے واپس چلنے کا کہا تو کہنے لگی۔

"اب نتھیا گلی دور ہی کتنا رہ گیا ہے' دیکھ لیتے ہیں۔" اور نتھیا گلی میں شام ہوگئی۔ میرا پروگرام واپسی کا تھا لیکن اس نے کہا۔

"مری کے راستے تو جاتے ہی رہتے ہیں۔ آج موقع ملا ہے' ایبٹ آباد کے راستے چلتے ہیں۔" میں نے تعمیل کی۔ اندھیرا تھا اس لیے راستے کی سیر نہ ہو سکی۔ ایبٹ آباد میں کھانا کھایا۔ ٹائم دیکھا تو دس بج چکے تھے۔ کہنے لگی۔ "یہاں سے اسلام آباد کے تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ رات کے ایک دو بجے کہاں گھر والوں کو جگاتے پھریں گے کیوں نا' رات یہیں گزار لیں؟"

میں نے کہا۔ "رات کسی کے ساتھ گزارنے کا مطلب سمجھتی ہو اور اس کے نتائج بھی؟"

"دوسروں کے متعلق تو پتا نہیں' آپ کے ساتھ رات گزارنے کا مطلب بالکل سمجھتی ہوں۔ نتائج کے لیے بھی تیار ہوں۔"

ایک غیر معروف سے ہوٹل میں رہنے کا پروگرام بنا۔ میں دو کمرے لینا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں علیحدہ کمرے میں ڈرتی ہوں۔ اگر آپ کو مجھ سے ڈر نہ لگے تو ایک ہی کمرے میں رہ لیتے ہیں۔ دوسرا بیڈ ڈلوالیں گے۔" سوال پیدا ہوا کہ کس کے شناختی کارڈ پر کمرہ لیا جائے؟ میں تو اپنا شناختی کارڈ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُسی کے شناختی کارڈ پر باپ بیٹی کی حیثیت سے کمرہ لیا۔ میرے کارڈ کے متعلق بتایا کہ ساتھ نہیں لائے۔ مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا لیکن اس نے کہا۔ "کوئی فرق نہیں پڑتا' رات ہی تو گزارنی ہے۔" کمرے میں ایک الگ بیڈ ڈلوالیا گیا۔

کمرا میری توقع سے بہتر تھا۔ دوسرا بیڈ ڈالنے سے زیادہ تنگ بھی نہیں ہوا تھا۔ دونوں بیڈز کے تقریباً درمیان کمرے میں ایک طرف ٹیلی ویژن رکھا تھا اور اس کے سامنے دوسری طرف دو صوفہ چیئر تھیں۔ کھانا تو ہم کھا ہی چکے تھے اس لیے صوفہ چیئر پر بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھنے لگے۔ کیبل پر کوئی انڈین فلم لگی ہوئی تھی' بڑی سنجیدہ اور دردناک قسم کی کہانی لگتی تھی اس لیے میں نے ریموٹ اٹھایا کہ چینل بدل دوں لیکن اسے پتا نہیں کیا نظر آیا کہ مجھے روک دیا۔ میں نے بھی واپس بیٹھ کر فلم دیکھنی شروع کر



دی۔ کسی عورت پر مظالم کی داستان تھی۔ اس وقت تک اس کی ساری شوخی رخصت ہو چکی تھی' چہرے پر غم کی پرچھائیاں تھیں جو آہستہ آہستہ گہری ہوتی گئیں پھر اس کے آنسو بھی بہنے لگے۔ اس پر میں بھی بے چین ہوگیا اور اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کچھ کہنے سے روک دیا' بس آنسو بہاتی اور فلم دیکھتی رہی۔ فلم زیادہ تر چل چکی تھی' جلدی ختم ہوگئی لیکن اس کے آنسو نہ رکے۔ میں اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا' اس کے آنسو پونچھے اور اس سے پھر پوچھا کہ کیوں رو رہی ہے؟

وہ بولی۔ "یہ تو میری اپنی ہی داستان لگتی ہے' بس کردار ہی بدلے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم نے اپنی داستان کبھی سنائی ہی نہیں' شاید ابھی مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں!"

اس نے کہا۔ "کیا سناؤں' وہ کہتے ہیں نا کہ ایک افسردہ دل ساری انجمن کو افسردہ کر دیتا ہے تو آپ کو کیوں افسردہ کروں؟"

"میرے خیال میں ہمارے تعلقات اب اتنے تو ہو گئے ہیں کہ ایک دوسرے کی خوشیاں اور غم بانٹ سکیں۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ لیکن اب میری طبیعت اتنی خراب ہوگئی ہے کہ میرے لیے کچھ کہنا مشکل ہے پھر سہی' اب میرے خیال میں سو جانا چاہیے۔" وہ اپنے بیڈ پر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی اپنے بیڈ پر آ کر سو گیا۔

ہم کیونکہ سارا دن پھرتے رہے تھے اور رات کو سوئے بھی دیر سے تھے اس لیے دوسرے دن آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ دوسرے بیڈ پر نظر پڑی تو وہ خالی تھا۔ اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا' باتھ روم بھی باہر سے بند تھا۔ اس کا بیگ بھی نہیں تھا۔ باہر نکل کر پارکنگ میں دیکھا' گاڑی موجود تھی۔ کمرے میں واپس آیا تو صوفہ چیئر پر ایک خط پڑا نظر آیا۔ میرے ہی نام تھا' لکھا تھا۔

"محترمی کمال احمد صاحب! السلام علیکم! رات آپ میری داستان سننا چاہتے تھے لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے سنا نہ سکی۔ آج سن ہی لیجیے۔ میرا نام سائرہ ہے۔ میں نے ایک اوسط درجے کے گھر میں جنم لیا۔ گھر میں دولت تو زیادہ نہیں تھی لیکن محبت کی فراوانی تھی۔ میرے والدین آپس میں بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی شادی بھی پسند کی تھی اس لیے ابو کے والدین نے اُن سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ابو کی وفات تک گھر جنت کا ہی حصہ تھا لیکن ابو کی وفات کے بعد ہر چیز بدل گئی۔ میری عمر اُس وقت سات سال تھی۔ بہن بھائیوں میں' میں بڑی تھی۔ ایک بھائی اور بہن مجھ سے چھوٹے تھے۔ امی بے سہارا ہو گئیں۔ سسرال والوں کا تو پہلے ہی قطع تعلق تھا۔ میکے میں کوئی تھا نہیں' صرف بوڑھے والدین تھے جو اس قابل نہیں تھے کہ ان کی کوئی مدد کر سکیں۔ تین سال تو انہوں نے ایسے تیسے کر کے گزار ہی لیے' یہ تین سال گزارنے کے لیے بھی انہوں نے بڑے دھکے کھائے اور خوار ہوئیں لیکن گزار ہی لیے' انہیں خود سے زیادہ ہماری فکر تھی پھر جب انہوں نے دیکھا کہ مرد کے سہارے کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو آخر شادی کر ہی لی۔ میری عمر اُس وقت دس سال تھی۔ ہمارے نئے والد کی بھی یہ دوسری شادی تھی۔ دو ایک سال تو یہ ٹھیک رہے پھر انہوں نے رنگ دکھانا شروع کیا۔ سلسلہ چھوٹی چھوٹی زیادتیوں سے شروع ہوا جو آہستہ آہستہ شدید مظالم تک پہنچ گیا۔ میرے ساتھ تو ان کا رویہ شروع ہی سے اچھا نہ تھا لیکن پھر اچانک ان کا رویہ بدلنے لگا جس کی وجہ بعد میں معلوم ہوئی۔ ایک دن میں گھر میں اکیلی تھی' چھوٹے بہن بھائی اسکول گئے ہوئے تھے اور امی ابو آفس' کوئی گیارہ بجے

اچانک ابو آ گئے۔ ان کو دیکھ کر میں بڑی حیران ہوئی کیونکہ یہ تو ان کے آفس کا وقت تھا۔ ان کے ہاتھ میں مٹھائی کا پیکٹ تھا۔ کہنے لگے۔ ''میں کہیں کام سے گیا ہوا تھا' وہیں ساتھ ہی مٹھائی کی دکان تھی' میں نے سوچا' گھر کے لیے لیتا جاؤں۔ گھر راستے میں ہی تھا' سوچا' گھر ہی چھوڑتا جاؤں۔'' ایک لڈو مجھے نکال کر دیا یہ کہتے ہوئے کہ ذرا چکھو' کیسی ہے؟ خود اندر چلے گئے۔ مٹھائی مشہور دکان کی تھی' مجھے اچھی لگی اس لیے فوراً ہی کھا گئی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ والد صاحب نے اس میں کچھ ملایا ہوا ہے۔ کھاتے ہی میں بے ہوش ہوگئی۔ بڑی مشکل سے امی کو فون کیا۔ وہ فوراً آ گئیں۔ میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ میں نے انہیں سب کچھ بتایا تو اور بھی پریشان ہوئیں جس مرد کا سائبان سمجھ کر انہوں نے سایہ ڈھونڈا تھا' سہارا لیا تھا' خود اسی نے گھر میں آگ لگا دی تھی۔ والد صاحب گھر آئے تو بہت فساد ہوا لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ امی بہت لڑیں' روئیں دھوئیں لیکن آخر انہیں طلاق اور جان سے مارنے کی دھمکی دے کر چپ کرا دیا گیا۔ بس اُس وقت سے میں مرد ذات کو اپنا دشمن سمجھتی ہوں' خاص کر والد صاحب کی عمر کے لوگوں کو۔ اب میری زندگی کا مقصد ہی یہ رہ گیا ہے کہ جس طرح میری زندگی برباد کی گئی ہے' میں بھی ایسے لوگوں کی زندگی برباد کروں۔ ان کی خانگی زندگی میں آگ لگاؤں اور ان کی شرافت کا لبادہ اتار کر انہیں ذلیل کروں' آپ میرے تیسرے ٹارگٹ تھے' میں پہلے دو کو ذلیل کر چکی ہوں' آپ کے ساتھ بھی میرا یہی پروگرام تھا لیکن آپ مختلف قسم کے انسان ثابت ہوئے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر آپ کو کئی دفعہ تنہائی میں کھل کھیلنے کا موقع دیا لیکن آپ نے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا۔ دامنِ کوہ میں آپ کو یاد ہے جب میں آپ کی بانہوں میں بے ہوش تھی' میں دراصل بے ہوش نہیں تھی' آپ کو دیکھ رہی تھی' آپ کرتے کیا ہیں؟ واقعی شریف ہیں یا صرف لبادہ اوڑھ رکھا ہے؟ اس کے بعد بھی میں نے کوشش جاری رکھی۔ کل کا پورا دن اور یہ رات بھی اسی پروگرام کا حصہ تھی لیکن آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ ایک اچھے انسان ہیں اور دنیا میں صرف بھیڑیے ہی نہیں' اچھے انسان بھی بستے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے بعد آپ کی زندگی سے نکل جاؤں۔ آئندہ نہ میں آپ کو تنگ کروں گی نہ آپ کی خانگی زندگی پر کسی طرح کا ڈاکہ ڈالوں گی۔ آخر میں اس ذہنی کوفت کے لیے معذرت جو میری وجہ سے آپ کو ہوئی۔ اس خوبصورت' پرسکون اور خوشگوار وقت کا شکریہ جو آپ کے ساتھ گزرے۔ یہ خوشگوار لمحے میری زندگی کا حاصل ہیں۔ آپ ہمیشہ عمروں کے فرق کی بات کرتے تھے۔ میرے خیال میں ایسے چند پرسکون لمحے عمروں کا فرق مٹانے کے لیے کافی ہوتے ہیں اس لیے کہ ایسے چند لمحے سو سال کی اذیت ناک عمر سے کہیں بہتر ہیں۔ خدا حافظ!

والسلام!

سائرہ!''

کمال احمد کو میں ایک مدت سے جانتا ہوں۔ بہت اچھا اور نیک آدمی ہے۔ اس کی عزت بھی اس کی سروس اور عہدے سے زیادہ اس کے کردار کی وجہ سے ہے لیکن جب سے میں نے اس کی یہ داستان سنی ہے' میری نظروں میں اس کا قد اور بھی اونچا ہوگیا ہے۔ اس معصوم اور مظلوم لڑکی کی میں کیا بات کروں' ایسی لڑکیاں تو ''دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں'' کمال نے اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی لیکن نیوں لبھدے لال گواچے' مٹی نہ پھرول جوگیا''

......☆☆......







جاوید عثمان زندانی

# جس سے آتی ہو بوئے لہو

حجاب عباسی کا خیال

وہ جو اپنی ذات میں گم رہا جسے صرف اپنا خیال ہے
وہ کبھی کسی کا نہ ہو سکا وہی اپنی وجہ زوال ہے

**اُن غریب دوستوں کا قصہ جنہیں اچانک دولت مل گئی تھی**

میرا نام عاصم ہے' آج جب میں اپنی گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے سوائے دکھ اور افسوس کے' کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ زندگی جو ہر پل رنگ بدلتی ہے' کبھی رنگ و نور' کیف و سرور' کبھی بادِ نوبہار' کبھی تیرگی تو کبھی راہِ پرخار۔ آج میری آنکھیں پرنم ہیں۔ مجھے اپنے تینوں دوستوں کی شدت سے یاد آ رہی ہے اور ماضی کا ایک ایک منظر میرے سامنے سے یوں گزر رہا ہے جیسے وہ جیتے جاگتے میرے سامنے ہوں اور مجھ سے باتیں کر رہے ہوں۔

ہم چاروں دوستوں نے غربت میں آنکھ کھولی تھی۔ شہر کی ایک کچی بستی میں گندے نالے کے قریب ہمارے جھونپڑی نما مکان تھے۔ یہاں چوبیس گھنٹے تعفن پھیلا رہتا تھا اور اکثر بدبو کا یہ عالم ہوتا کہ سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ بارش کے دنوں میں نالا بھر جاتا' پانی گھروں میں داخل ہو جاتا۔ رات رات بھر جاگ کر ہمیں پانی اپنے گھروں سے نکالنا پڑتا۔ کسے خواہش نہیں ہوتی کہ اچھے ماحول میں رہے' بہترین گھر اور زندگی کی تمام آسائشیں اسے میسر ہوں' ہم بھی اچھی زندگی کے خواب دیکھا کرتے تھے لیکن ہم چاروں دوست دن رات محنت مزدوری کر کے بمشکل گھر کا خرچ چلا پاتے تھے۔ ایسے میں اچھے گھر اور آسائشوں کے بارے میں سوچنا بس خواب ہی تھا۔ ہم چاروں یعنی حسن' الطاف' رضا اور میں ایک فیکٹری میں ورکر تھے۔ تنخواہ اتنی قلیل تھی کہ بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ میں' حسن اور رضا قناعت پسند تھے اور اللہ کی رضا میں خوش تھے جبکہ الطاف کی فطرت میں غصہ اور چڑچڑا پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا' وہ ذرا ذرا سی بات پر الجھ جاتا' شاید غربت نے اسے بہت زیادہ احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ اکثر ہم سے کہا کرتا۔ ''زندگی میں ہر انسان کو ایک چانس ضرور ملتا ہے' بس مجھے وہ چانس ملنے دو پھر دیکھنا' میں کیا کرتا ہوں۔''

ہمارے علاقے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو راتوں رات امیر بن گئے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ نو دولتیے کالے دھندوں میں ملوث تھے۔ ہمارا علاقہ جرائم پیشہ افراد کا گڑھ بھی تھا اسی لیے علاقے میں آئے دن پولیس کے چھاپے پڑتے رہتے تھے۔ اکثر جرائم پیشہ افراد اور پولیس کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوتا تھا اور کبھی کبھی تو ایسا گھمسان کا رن پڑتا کہ علاقہ میدانِ جنگ بن جاتا۔ اس میں کچھ بے گناہ بھی مارے جاتے۔ کئی مجرموں کو پولیس پکڑ کر لے جاتی لیکن کچھ ہی دنوں میں وہ پھر چھوٹ کر آ جاتے اور ان کے دھندے دوبارہ شروع ہو جاتے۔ ہم چاروں دوست اس ماحول سے اس قدر بے زار تھے کہ جی چاہتا' یہاں سے بھاگ جائیں لیکن ہم بے بس تھے' ہمارے اتنے وسائل نہ تھے کہ کہیں اور گھر لیتے' مجبوراً اسی جگہ رہ کر یہ سب تماشے دیکھتے رہتے۔ غربت اور تنگ دستی نے ہمارے دلوں کو مُردہ کر دیا تھا۔ کوئی تفریح وغیرہ کرنے کا دل ہی نہ کرتا البتہ کبھی کبھی دل بہت گھبراتا تو شکار کا پروگرام بنا لیتے۔ ہم چاروں کو مچھلی کے شکار کا بے حد شوق تھا۔ اس شوق کا فائدہ یہ تھا کہ ایک دو وقت کی ہانڈی کے لیے مچھلی مل جاتی تھی۔ جب مہینے کی آخری تاریخیں چل رہی ہوتیں اور گھر میں راشن ختم ہو چکا ہوتا تو ایسے میں ہم چاروں دوست اکثر شکار کا پروگرام بنا لیتے۔

اُس روز بھی ہم نے شکار کے لیے ہمیشہ کی طرح کالا پوائنٹ جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ کالا پوائنٹ سمندر کے درمیان ایک چھوٹا سا خشکی کا ٹکڑا تھا۔ وہ جگہ شکار کے لیے بہت موزوں تھی۔ وہاں



شکار بھی وافر مقدار میں ملتا تھا اور رات کے سناٹے میں کوئی پریشان کرنے والا بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہم صبح تک شکار کرتے اور دن نکلتے ہی کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر آ جاتے۔ ہفتے کی شام کو ہمیں کالا پوائنٹ کے لیے نکلنا تھا۔ ڈور کانٹے تو ہمارے پاس موجود ہوتے ہی تھے' چارہ' بس کا کرایہ اور کالا پوائنٹ کے لیے کشتی کا کرایہ ہم چاروں آپس میں برابر برابر بانٹ لیتے تھے۔

ہفتے کی صبح اچانک مجھے تیز بخار نے گھیر لیا۔ والدہ نے جب میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو چونک کر بولیں۔ ''تجھے تو بہت تیز بخار ہے تو کام پر کیسے جائے گا؟ آج چھٹی کر لے اور دوائی لے آ۔''

''نہیں ماں! میں کام پر نہیں جاؤں گا تو منیجر سخت ناراض ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ چھٹی صرف مرنے پر ہی کرنا۔''

ماں نے مجھے بہت سمجھایا مگر میں نہ مانا اور کام کے لیے نکل گیا۔ ہم چاروں دوست ساتھ ہی بس میں جاتے تھے۔ جب میرے دوستوں کو میری طبیعت کی خرابی کا پتا چلا تو انہوں نے زبردستی مجھے گھر واپس بھیج دیا اور کہا کہ ہم منیجر سے بات کر لیں گے۔

''لیکن آج تو ہمارا شکار کا بھی پروگرام ہے؟'' میں نے کہا۔

''ابھی تو دوائی لے۔ اگر شام تک بخار اتر گیا تو پھر دیکھیں گے۔ اگر تو نہ جا سکا تو فکر مت کر' ہم تیرے حصے کی مچھلی تجھے پہنچا دیں گے۔''

میں وہاں سے سیدھا علاقے کے کلینک چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تمہیں ملیریا ہے' دو تین دن دوائی لینی پڑے گی۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے گھر واپس آ گیا۔ جسم بخار میں تپ رہا تھا' دوائی پی کر میں چارپائی پر ایسا لیٹا کہ ہوش ہی نہیں رہا۔ شام کو جب میرے تینوں دوست شکار پر لے جانے کے لیے گھر آئے تو آنکھ کھلی۔ والدہ سرہانے بیٹھیں میری ماتھے پر پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں اور پڑھ پڑھ کر مجھ پر دم بھی کر رہی تھیں۔ حسن نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔

''اسے تو ابھی بھی تیز بخار ہے' دوائی پی تو نے؟''

''ہاں' پی لی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے' ملیریا ہو گیا ہے' تین چار دن بخار رہے گا۔'' میں نے نقاہت سے جواب دیا۔

''ایسا کر تو آرام کر' ہم شکار کا سارا انتظام کر چکے ہیں اس لیے کینسل بھی نہیں کر سکتے۔''

''ہاں یار' تم لوگ جاؤ' مجھ میں تو ذرا ہمت نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو اپنا خیال رکھنا اور دوائی وقت پر لینا۔'' حسن بولا' ساتھ ہی اس نے الطاف اور رضا کی نظر بچا کر ہاتھ ملانے کے بہانے میرے ہاتھ میں سو کا نوٹ تھما دیا تھا۔ میں اور حسن برے وقتوں میں ایک دوسرے کی اسی طرح 50 یا 100 روپے کی مدد کر دیا کرتے تھے کیونکہ اس سے زیادہ تو ہم افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال تینوں مجھے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ اُس رات میں' میں بے خبر سوتا رہا۔ صبح اٹھا تو میرا بخار کافی کم ہو گیا تھا۔ میں بستر پہ لیٹے لیٹے اپنے تینوں دوستوں کا انتظار کرنے لگا۔ ہم ہفتے کی شام کو شکار پر جاتے تھے تو عموماً صبح نو دس بجے تک ہماری واپسی ہو جاتی تھی لیکن اس وقت گیارہ بج رہے تھے اور وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شکار کے بعد سب سے پہلے میرے پاس آئیں گے اور میری طبیعت کا پوچھیں گے لیکن اب تک اُن کا کوئی پتا نہ تھا۔

بارہ بجے کا وقت ہوگا کہ اچانک برابر والے گھر سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ برابر

میں حسن کا گھر تھا۔ حسن کی دو جوان بہنیں اور ایک بوڑھی ماں تھی۔ والد کا ایک اندھی گولی لگنے سے ایک سال قبل انتقال ہو چکا تھا اور بڑی بہن کی اگلے ماہ شادی ہونے والی تھی۔

''بیٹا! یہ کلثوم کے گھر سے کیسی آوازیں آ رہی ہیں؟ ذرا جا کر معلوم تو کر۔'' میری والدہ پریشانی سے بولیں۔ میں خود پریشان ہو گیا تھا اور فوراً حسن کے گھر پہنچا۔ وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ حسن کی بوڑھی ماں بری طرح بین کر رہی تھی' دونوں بہنیں زار و قطار رو رہی تھیں جبکہ الطاف اور رضا سر جھکائے کھڑے تھے مگر حسن نظر نہیں آ رہا تھا۔

''کیا ہوا الطاف؟ حسن کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ الطاف بری طرح چونک گیا اور خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا' بولتے کیوں نہیں تم لوگ؟'' میں چیخا۔

''حسن..... حسن..... اب اس دنیا میں نہیں رہا۔'' رضا کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''کیا!!'' مجھے ایک جھٹکا لگا اور جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

''لیکن..... لیکن کیسے.....؟ کیا ہوا اسے؟'' میری آواز رندھ گئی تھی۔

''وہ ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھا شکار کر رہا تھا۔ کائی کی وجہ سے اچانک اُس کا پیر پھسلا اور وہ گہرے سمندر میں جا گرا۔ ہم تمام رات پاگلوں کی طرح اُسے تلاش کرتے رہے لیکن وہ نہیں ملا۔'' یہ کہتے ہوئے الطاف رو پڑا۔

یہ خبر محلے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ حسن کے گھر میں محلے والے جمع ہو گئے۔ محلے کے بااثر افراد نے چند غوطہ خوروں کو اس مقام پر بھیجا جہاں حسن ڈوبا تھا۔

حسن گھر کا واحد کفیل تھا۔ اس کے گھر والے بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔ کافی تلاش کے بعد حسن کی لاش سمندر کے اندر جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی مل گئی۔ اس کا چہرہ بری طرح مسخ ہو گیا تھا' شاید چٹان سے گرنے کی وجہ سے اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرایا تھا۔ سمندری جانور اس کے جسم کا آدھا سے زیادہ گوشت کھا چکے تھے۔ اس کا چہرہ دکھانے کے قابل نہ تھا۔ محلے والوں نے غسل وغیرہ دے کر اس کی تدفین کر دی۔ اس تمام عرصے میں مجھے' الطاف اور رضا کی پراسرار خاموشی چبھتی رہی۔ الطاف کی آنکھوں میں کبھی کبھی خاص چمک سی آ جاتی اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا تھا جبکہ رضا بالکل گم صم سا تھا' وہ بات بات پر چونک جاتا' ایسا لگتا جیسے وہ خوف زدہ ہو۔

اس واقعے کے چند دن بعد حسن کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پُرسہ دینے والے جا چکے تھے۔ حسن کی ناگہانی موت کا مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ جیتا جاگتا زندہ دل نوجوان اچانک موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ اس کی باتیں یاد کر کے میری آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اس کا دیا ہوا سو کا نوٹ اب بھی میری جیب میں موجود تھا۔

''اماں جی! آپ پریشان نہ ہوں' جیسے حسن آپ کا بیٹا تھا' اُسی طرح ہم بھی آپ کے بیٹے ہیں اور حسن کی بہنیں ہماری بہنیں ہیں۔ آج سے گھر کی اور بہنوں کی ساری ذمہ داری ہماری ہے۔ اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے؟ صبر کریں اور زلیخا کی شادی کی تیاری کریں جو خرچہ ہوگا' وہ ہم اٹھائیں گے۔ گھر کے خرچے کی بھی فکر مت کریں' وہ ہر مہینے آپ کو ملتا رہے گا۔'' الطاف کی آواز پر میں خیالات سے نکل آیا تھا۔ الطاف تو اس طرح کہہ رہا تھا جیسے وہ کوئی امیر کبیر آدمی ہو۔ یہاں ہمارے گھروں کا خرچہ بمشکل چلتا تھا جبکہ مالی لحاظ سے



الطاف تو سب سے زیادہ پریشان رہتا تھا۔

''ہاں اماں جی! آپ مطمئن ہو جائیں' الطاف سب سنبھال لے گا۔'' رضا بولا۔ میں نے چونک کر رضا کو دیکھا' اس کے لہجے میں بے بسی اور خوف کا عنصر نمایاں تھا۔ مجھے پھر الطاف اور رضا کی باتیں چبھنے لگی تھیں۔ الطاف کی آنکھوں سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت خوش ہو اور حسن کے مرنے کا اسے کوئی دکھ نہ ہو البتہ رضا کی خوف زدہ آنکھیں اور ڈرا سہما سا لہجہ مجھے عجیب لگا۔

ابھی اس سانحے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میں نے نوٹ کیا' الطاف کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے' اس کے رہن سہن' کھانے پینے کا انداز غرض کہ سب کچھ ہی بدلا بدلا سا تھا۔ اس کے ٹھاٹھ باٹ دیکھ کر لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ سب کے ذہن میں یہی سوال تھا کہ اچانک الطاف کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ گیا؟ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ پیسوں کے لالچ میں وہ جرائم پیشہ افراد کے لیے کام کر رہا ہے۔ خیر' اپنے وعدے کے مطابق الطاف نے حسن کی بہن کی شادی کا سارا خرچہ اٹھایا اور ہر ماہ ایک معقول رقم حسن کے گھر دینے لگا۔ رضا اور مجھ سے اس نے کبھی ایک پیسہ نہیں مانگا تھا۔ میں نے رضا سے کئی دفعہ پوچھنے کی کوشش کی کہ الطاف کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا اور وہ ایک دم حاتم طائی کیسے بن گیا؟ میرے سوال پر رضا سہم سا جاتا تھا اور کہتا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم' میں کچھ نہیں جانتا۔'' لیکن اس کے جواب پر میرا دل مطمئن نہ ہوتا بلکہ شکوک و شبہات اور جڑ پکڑنے لگتے تھے۔

الطاف نے اب ہم سے ملنا بھی کم کر دیا تھا پھر ایک دن اس نے فیکٹری کی نوکری کو بھی خیر باد کہہ دیا اور اونے پونے اپنا مکان بیچ کر اچھے علاقے میں فلیٹ خرید لیا۔ کچھ عرصے بعد اس کے پاس ایک قیمتی گاڑی بھی آ گئی۔

اس بات کو کافی وقت گزر گیا' میں اور رضا اپنے معمول کے کاموں میں لگ گئے تھے۔ حسن کی موت کے بعد رضا کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی' وہ صرف کام کی بات کرتا حالانکہ اس واقعے سے پہلے وہ خاصا زندہ دل اور ہنسی مذاق کرنے والا انسان تھا مگر اب لگتا تھا جیسے اندر ہی اندر اسے کوئی پریشانی یا خوف کھائے جا رہا ہو' وہ دن بدن کمزور بھی ہوتا جا رہا تھا۔ میں اس کی حالت نوٹ کر رہا تھا۔ آخر ایک دن مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں پھٹ پڑا۔

''رضا' تجھے بتانا ہوگا کہ کیا بات ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ حسن کے انتقال کے بعد تو ایک دم بدل گیا ہے' آخر ایسی کیا بات ہے جس نے تجھے پریشان کیا ہوا ہے؟ دیکھ' اگر کوئی بات ہے تو مجھ سے مت چھپا' میں تیری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح تو' تُو گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔''

''میں ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ کوئی بات نہیں پھر تو میرے پیچھے کیوں پڑا رہتا ہے اور بار بار پریشان کرتا ہے؟'' رضا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''اچھا تو پھر الطاف کی راتوں رات کایا کیسے پلٹ گئی؟ وہ ایک لاٹ صاحب کیسے بن گیا؟ میرا دل کہہ رہا ہے تو ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ دیکھ' ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں' آج تک ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ مجھے بتا' اُس رات کیا ہوا تھا؟''

''عاصم' خدا کے واسطے' میرا پیچھا چھوڑ دے' میں تجھے بتا چکا ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم تو بار بار ایک ہی بات پوچھ کر مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے۔ اب اگر تو نے کچھ پوچھا تو تیری میری دوستی ختم۔'' رضا جذباتی ہو گیا تھا' اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر میں نے

اسے مزید کریدنے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے جھگڑ پڑے گا۔ میں خاموش ہوگیا۔

زندگی اسی طرح مخصوص ڈگر پر چل رہی تھی' وہی یکسانیت کا شکار' صبح فیکٹری' رات کو گھر۔

ایک دن اسی یکسانیت سے اکتا کر میں رضا سے بولا۔ ''چل یار' آج الطاف سے مل کر آتے ہیں۔ بہت دن ہوگئے اسے دیکھے ہوئے۔ اس کی یاد بھی بہت آرہی ہے۔ ایک ساتھ بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کریں گے۔''

''کیا..... الطاف!!'' رضا تیز لہجے میں بولا۔ ''دفع کر اس کو' کوئی ضرورت نہیں اس کے پاس جانے کی۔ اس نے کبھی ہماری خبر لی؟ وہ تو دولت کے نشے میں ایسا ڈوبا ہے کہ اسے نہ دوستی یاد ہے نہ رشتے۔ میں ایسے آدمی پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔'' رضا کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔

''یار' کیا بات ہے تو کیوں اس سے اکھڑا اکھڑا رہنے لگا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''ہوسکتا ہے' وہ مصروف ہوگیا ہو۔ اگر ہم اس کے پاس چلے جائیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔ آخر وہ ہمارے بچپن کا دوست ہے' ذرا دیکھیں تو وہ ہمیں پہچانتا بھی ہے یا نہیں؟''

''دوست.....'' رضا کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''میں جانتا ہوں' وہ کیسا دوست ہے۔''

''دیکھ' خوامخواہ ضد مت کر۔ تیری طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ ہم اس سے ملیں گے تو تیری طبیعت بھی بہل جائے گی۔'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں' میں تو کسی قیمت پر نہیں جاؤں گا۔ تجھے جانا ہے تو جا۔'' رضا کا لہجہ اٹل تھا۔

میں نے سوچا' اب اصرار کرنا فضول ہے' ویسے بھی رضا جس بات پر اڑ جاتا تھا پھر اسے راضی کرنا مشکل ہوتا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر کسی دن میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔'' میں مایوس ہوکر گھر واپس آگیا۔

سچ پوچھو تو میرے دل میں وہی کانٹا چبھ رہا تھا کہ الطاف راتوں رات امیر کیسے بن گیا؟ آخر اُس رات کو ایسا کیا ہوا تھا جو رضا میرے لاکھ پوچھنے کے باوجود نہیں بتا رہا تھا؟ میرے اندر کا تجسس مجھے چین نہیں لینے دے رہا تھا اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ الطاف سے مل کر اسے کریدوں' شاید وہی کچھ بتا دے۔ دل میں اسی خیال کو لیے چھٹی والے روز الطاف سے ملنے جا پہنچا۔ اس کی رہائش کراچی کے انتہائی پوش علاقے باتھ آئی لینڈ میں تھی۔ اس بلڈنگ کے چوکیدار سے جب میں نے الطاف کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا۔

''کیا مزدوری وغیرہ کے چکر میں آیا ہے؟''

''نہیں بھائی' وہ میرا دوست ہے' اس سے ملاقات کرنی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا' سیٹھ الطاف تیرا دوست ہے؟'' چوکیدار کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''کیا نام ہے تیرا؟''

''عاصم..... عاصم نام ہے میرا۔''

چوکیدار نے نزدیک لگے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ ''صاحب' کوئی عاصم نام کا آدمی آپ سے ملنے آیا ہے۔ وہ کہتا ہے' آپ کا دوست ہے۔'' چند لمحوں تک چوکیدار دوسری طرف کی آواز سنتا رہا پھر اس نے جی کہہ کر انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا۔

''صاحب' وہ سامنے لفٹ سے تیسری منزل پر چلے جائیں۔ 311 نمبر کا فلیٹ الطاف صاحب کا ہے۔'' چوکیدار کا رویہ ایک دم بدل گیا تھا۔ وہ تو ''تو'' سے ''صاحب'' پر آگیا تھا۔ کچھ دیر میں ہی



میں 311 نمبر فلیٹ تک پہنچ گیا تھا۔ الطاف دروازے پر کھڑا میرا منتظر تھا' وہ بہت گرم جوشی سے مجھ سے بغل گیر ہوا۔

''او' میرا یار آیا ہے۔ آخر تم لوگوں کو آج میری یاد آ ہی گئی۔ رضا کہاں ہے؟ کیا اکیلا ہی آیا ہے؟''

''ہاں' میں اکیلا ہی آیا ہوں۔ رضا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ نہیں آسکا۔''

''اوہ' کیا ہوگیا اسے؟ چل تو اندر آ' اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' وہ مجھے تقریباً گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔

الطاف میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ کہاں وہ دھان پان سا کمزور الطاف اور کہاں یہ ہٹا کٹا سرخ و سفید الطاف۔ اس کا فلیٹ بھی بہت شاندار تھا' زندگی کی ہر آسائش اس فلیٹ میں موجود تھی۔ ہم کافی دیر تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ میں موقع کی تلاش میں تھا کہ اُس سے اُس رات کے بارے میں پوچھوں لیکن مجھے موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ الطاف نے میری بہت خاطر مدارات کی پھر وہ بولا۔

''چل یار' آج میں تیرے ساتھ ہی رضا کے گھر چلتا ہوں' اس سے بھی مل لوں گا اور اس کی خیریت بھی معلوم کرلوں گا۔ تجھے دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ اپنے پرانے علاقے میں چلتے ہیں۔ بہت دن ہوگئے اس ماحول سے اب اکتاہٹ سی ہونے لگی ہے۔'' پھر اس نے کپڑے بدلے اور ہم دونوں نیچے اتر آئے۔ کار پارکنگ میں اس کی شاندار کار کھڑی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔ ساری زندگی بسوں کے دھکے کھاتے گزری تھی۔ آج تک ایسی شاندار کار میں بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

''تو نے شادی نہیں کی کیا؟'' میں نے الطاف سے پوچھا۔

''ابے' کہاں یار' ابھی تو کاروبار کی سیٹنگ میں لگا ہوا ہوں۔ سیٹنگ ہوجائے گی تو پھر سوچوں گا۔''

الطاف کی شاندار گاڑی جب محلے میں داخل ہوئی تو اس کے گرد بچوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ لوگ حیرت سے گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ میں اور الطاف کار سے اترے تو لوگوں کو پتا چلا کہ یہ الطاف ہے۔ الطاف سب سے بڑے اچھے انداز میں ملا۔ جب ہم دونوں رضا کے گھر میں داخل ہوئے تو رضا چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ایک دم چونک گیا اور اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آرہے تھے۔

''کیا ہوگیا میرے یار' تجھے؟ عاصم بتا رہا تھا کہ تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یار' میرے ہوتے ہوئے تم لوگ کیوں پریشان ہوتے ہو؟ میں ہوں نا' تمہارا دوست' وہ بھی بچپن کا۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہے تو مجھے بتا' میں اگر کام نہ آیا تو لعنت ہے مجھ پر..... چل اٹھ' میں تجھے ابھی شہر کے بڑے ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں۔ فکر مت کر تو بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔'' الطاف پنار کے بولتا چلا گیا۔

''میں ٹھیک ہوں اور مجھے تجھ سے کچھ نہیں چاہیے' بس تو حسن کے گھر والوں کا خیال رکھ' اس کی دوسری بہن کی بھی شادی ہونے والی ہے۔''

''ہاں' ہاں' کیوں نہیں' میں ضرور جاؤں گا اپنے مرحوم دوست کے گھر تو کیوں ٹینشن لیتا ہے؟ جب میں نے وعدہ کیا ہے تو تُو فکر کیوں کرتا ہے؟'' یہ کہہ کر الطاف نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے چند نوٹ نکال کر رضا کے ہاتھ پر رکھنے کی کوشش کی۔

''میں نے کہا نا' مجھے کچھ نہیں چاہیے' یہ پیسے تو اپنے پاس ہی رکھ۔'' رضا اس کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے بولا۔

''یار' تو اب تک مجھ سے ناراض ہے؟ دیکھ بھول جا پرانی باتوں کو۔ یہ سب کچھ تو زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔ ضد مت کر' رکھ لے یہ روپے' تیرے کام آئیں گے۔''

''میں نے کہا نا' ہٹا ان پیسوں کو' مجھے ان میں سے خون کی بو آرہی ہے۔'' رضا تلخی سے بولا۔

''چل بھئی' جیسی تیری مرضی' اب میں چلتا ہوں' یہاں سے حسن کے گھر جاؤں گا پھر بھی کبھی ضرورت پڑے تو مجھے ضرور یاد کرنا۔''

اس کے بعد الطاف' حسن کے گھر گیا اور انہیں اپنا فون نمبر بھی دیا کہ جب بھی حسن کی بہن کی شادی کا معاملہ ہو تو وہ اسے فون کر دیں۔ حسن کی والدہ نے اسے بہت سی دُعائیں دیں۔ رخصت ہوتے وقت میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور آخر میں نے اس سے وہ سوال کر ہی ڈالا جو مسلسل مجھے پریشان کر رہا تھا۔

''الطاف' ایک بات تو بتا' یہ یکا یک تیری کایا کیسے پلٹ گئی؟ تیرے پاس راتوں رات اتنی دولت کہاں سے آ گئی اور ایسی کیا بات ہے جو رضا کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے؟ میں نے اس سے کئی بار پوچھا مگر وہ کچھ نہیں بتاتا۔ دیکھ' تو ہی بتا دے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''ہاہاہا.....'' الطاف نے بے ساختہ ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ ''میری جان' زیادہ مت سوچا کر۔'' وہ میرا گال تھپتھپا کر بولا۔ ''زیادہ سوچنے سے آدمی کا دماغ کھسک جاتا ہے' بس اتنا سمجھ لے کہ ہر انسان کو زندگی میں ایک چانس ضرور ملتا ہے' بس مجھے بھی اُس رات چانس ملا تھا اور ہاں' تیرے پاس میرا نمبر ہے نا' کوئی کام ہو تو فون کر لینا۔'' اس نے میری بات مذاق میں اڑا دی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ چند جرائم پیشہ افراد کی نظروں نے اسے تاڑ لیا تھا اور دو افراد موٹر سائیکل پر اس کی گاڑی کے پیچھے چل پڑے تھے۔

میرے دماغ میں الطاف اور رضا کے درمیان ہونے والی باتیں گونج رہی تھیں۔ رضا نے یہ کیوں کہا تھا کہ مجھے ان پیسوں سے خون کی بو آ رہی ہے؟ میں نے بہت سوچا مگر اس گتھی کو سلجھا نہ سکا اور سر جھٹک کر خیالات کی دنیا سے نکل آیا۔

زندگی سسکتی ہوئی اپنی ڈگر پر چل رہی تھی۔

ایک دن میں اور رضا فیکٹری میں کام کر رہے تھے کہ اچانک رضا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا' شاید اسے چکر آ گئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں گھبرا گیا' میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ میں نے اسے سہارا دیا اور دیوانہ وار فیکٹری کے ورکروں کو مدد کے لیے آوازیں دینے لگا۔ چند ورکرز بھاگتے ہوئے پاس آ گئے۔ ہم نے مل کر فوری طور پر رضا کو گاڑی میں ڈالا اور اسپتال پہنچے۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے رضا کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور شام تک اس کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر کے مطابق اسے برین ہیمبرج ہوا تھا' ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے اس کے دماغ کی نس پھٹ گئی تھی۔ مجھے بری طرح شاک لگا تھا' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح اچانک یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ میں نے گھبراہٹ میں الطاف کو فون لگایا۔ کئی دفعہ کی ٹرائی کے باوجود بھی مجھے دوسری طرف سے جواب نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر میں نے فون بند کر دیا۔ پہلے حسن کی ناگہانی موت اور اب رضا کی اچانک موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ رضا کے گھر والوں پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس دوران میں نے الطاف سے کئی مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر دوسری طرف خاموشی کے سوا کچھ نہ



ملا۔

وقت سب سے بڑا مسیحا ہے۔ تمام زخم مندمل کر دیتا ہے۔ رضا کی موت کو ڈیڑھ مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ میں اپنے گھر میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ وقت کی گرد ہر چیز کو دھیرے دھیرے دھندلا دیتی ہے مگر ایک بات میرے اندر اسی طرح جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ رضا نے مرتے دم تک مجھے نہیں بتایا کہ الطاف کے دن کیسے پھرے؟ اُس رات کو حسن کے ساتھ کیا ہوا اور اب الطاف کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔ آرکیڈ کے چوکیدار کے مطابق کافی دنوں سے اس کے فلیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ اگر الطاف کو بھی کچھ ہو گیا تو پھر میرے لیے یہ راز ہمیشہ کے لیے ایک راز ہی رہے گا۔

میں سوچوں میں گم ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اچانک بری طرح چونک گیا' ٹی وی پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ کراچی کے علاقے پاک کالونی سے سیٹھ الطاف کی بوری بند لاش ملی ہے۔ خبر کے مطابق اغوا کاروں نے اسے بری طرح تشدد کر کے ہلاک کیا تھا۔ سیٹھ الطاف کو کچھ ماہ پہلے اغوا کیا گیا تھا۔ ذرائع کے مطابق اغوا کرنے والوں نے اسے بھتہ نہ دینے کی وجہ سے ہلاک کیا تھا۔

الطاف کی اندوہناک موت کی خبر سن کر مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک میں اسی کیفیت میں رہا' یوں لگ رہا تھا جیسے میرے حواس گم ہو گئے ہوں۔ راتوں رات وہ دولت مند تو بن گیا تھا مگر موت کو شکست نہ دے سکا' پیسہ اسے نہ بچا سکا' ویسے پیسہ بچاتا بھی کسے ہے؟ لیکن وہ دولت مند بنا کیسے؟ اس سوال کا جواب مجھے نہ مل سکا۔ یہ راز تو شاید اب کوئی نہ بتا سکے گا۔

میں اس کے جنازے میں ایک اجنبی کی طرح شریک ہوا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر میں نے اسے اپنا دوست ظاہر کیا تو کہیں پولیس والے مجھے پوچھ گچھ میں شامل نہ کر لیں کیونکہ میں غریب تھا اور غریب ہونا سب سے بڑا جرم ہوتا ہے۔

ایک صبح ڈاک سے مجھے ایک خط موصول ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے کون خط لکھ سکتا ہے؟ لفافے پر نام پتا دیکھا تو میرا ہی تھا۔ میں نے بھیجنے والے کا نام پڑھا تو مجھے جھٹکا لگا' پیچھے الطاف کا نام لکھا تھا۔ میں اندر آ گیا اور بے تابی سے خط کھول کر خط لکھنے کی تاریخ پر نظر ڈالی' خط تقریباً ایک مہینے پہلے لکھا گیا تھا مگر ڈاک والوں کی سستی کی وجہ سے مجھے آج ملا تھا۔ میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔

''اچھے دوست عاصم' خدا تجھے خوش رکھے۔ تو سوچ رہا ہو گا کہ میں تجھ سے ملاقات بھی کر سکتا تھا یا موبائل پر بات بھی کر سکتا تھا پھر یہ خط کیوں؟ میرے دوست' کچھ باتیں ایسی ہیں جو نظریں ملا کر نہیں کی جا سکتیں۔ آخر بہت سوچ سمجھ کر میں خط کا سہارا لے رہا ہوں تو نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ راتوں رات میرے پاس اتنی دولت کہاں سے آ گئی؟ آج میں تجھے اس کا جواب دیتا ہوں لیکن تجھے شروع سے ساری بات سمجھاتا ہوں۔

تجھے تو پتا ہے کہ ہم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی' اس میں خود کو زندہ رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے' مفلسی' فاقے اور ناتمام خواہشیں سائے کی طرح ہمارے گرد رقص کرتی رہتی تھیں' گندے نالے کی سڑاند رات دن سوتے جاگتے ہمارے ساتھ ہوتی تھی۔ ہمارے کھنڈر نما مکان جو کسی بھی وقت زمین بوس ہو سکتے تھے' ہمیشہ ہمیں خوف میں مبتلا رکھتے تھے۔ کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا جو ہم نے خوشی میں گزارا ہو اور پھر ان حالات میں میری بہن کا جہیز نہ ہونے کی وجہ سے خودکشی کرنا..... اور میری بوڑھی ماں کا علاج نہ ہونے کی وجہ سے میرے ہاتھوں میں دم

توڑنا' بس ایسے کٹھن حالات میں مجھے زندگی سے نفرت سی ہوگئی تھی' زندگی بوجھ لگنے لگی تھی۔ کبھی کبھی سوچتا' زندگی کیا ہے؟ ایک سزا جو مجھے دے دی گئی ہے۔ یہ تو موت سے بدتر زندگی تھی۔ میں سوچتا' کیا اسی طرح سسکتے سسکتے زندگی گزر جائے گی؟ کیا میں یوں ہی غربت اور تنگ دستی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا؟ لیکن پھر دل کے کسی گوشے سے آواز آتی کہ الطاف' اللہ زندگی میں ہر انسان کو ایک چانس ضرور دیتا ہے اور تجھے بھی دے گا۔ اس آواز سے دل کو کچھ سکون سا ملتا اور میں عارضی طور پر سب کچھ بھول جاتا۔ عاصم' اب میں اُس واقعے کی طرف آتا ہوں جس نے میری زندگی بدل دی۔ یہاں میں اس بات کا اعتراف کروں گا کہ مجھ جیسا مطلبی اور خودغرض دوست شاید ہی دنیا میں کوئی ہو۔ مجھے اپنے آپ کو دوست لکھتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔ دولت کی چکاچوند نے دوستی کے رشتے کو ایک دم ماند کر دیا تھا۔ اس روز میں ظالم' خودغرض اور سفاک بن گیا تھا جو نہیں جانتا تھا کہ دوستی کسے کہتے ہیں' خلوص کس چڑیا کا نام ہے؟ میرے سامنے صرف اور صرف دولت کی اہمیت تھی۔

اُس دن تجھے بخار تھا اس لیے تجھے چھوڑ کر ہم کالا پوائنٹ شکار کے لیے چلے گئے۔ میرے گھر میں کھانے کے لیے ایک دانہ تک نہ تھا۔ باپ کی ٹی بی کی دوائی کے ناغے ہو رہے تھے اور چھوٹی بہن نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اجو مشتی والے نے ہمیشہ کی طرح ہمیں کالا پوائنٹ پر چھوڑا اور صبح آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ تجھے تو پتا ہے' اس سے اپنا ادھار چلتا تھا۔ اُس وقت شام ڈھل رہی تھی' ملگجا اندھیرا کالا پوائنٹ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ہم ہمیشہ کی طرح اُسی چٹان کے قریب کچی زمین پر لیٹ گئے' چٹان کی دوسری طرف سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں اندھیرے نے کالا پوائنٹ کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ چاند کی مدہم سی چاندنی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اُس وقت وہاں پر ہم تینوں کے سوا کوئی اور نہ تھا' چاروں طرف سناٹا تھا' صرف چٹانوں سے ٹکراتی پرشور لہروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ جب ذرا تھکن اتری تو ہم تینوں اپنی اپنی مخصوص جگہوں پر شکار کے لیے ڈوریاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ میں خیالات میں الجھا ہوا تھا' کافی دیر ہوگئی تھی' کوئی مچھلی نہیں لگی تھی۔ اچانک میرے کانوں میں دور سے آتی ہلکی ہلکی سی کسی انجن کے چلنے کی آواز آئی اور پھر یہ آواز نزدیک ہونے لگی۔ لگتا تھا جیسے کوئی لانچ یا اسٹیمر کالا پوائنٹ کی طرف آرہا ہو۔ ہم تینوں ایک دم چونکنے ہوگئے اور ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

''لگتا ہے' پولیس یا کوسٹ گارڈ کے لوگ ہماری طرف آرہے ہیں' ویسے بھی آج کل شکار پر پابندی ہے۔ اگر دھر لیے گئے تو بہت برے پھنسیں گے۔'' حسن نے گھبراتے ہوئے کہا۔ انجن کی آواز لحہ بہ لحہ ہمارے قریب ہوتی جارہی تھی۔ ہمارے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اگر رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے تو ہمارے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں' ہم لمبے پھنستے۔ آواز ایک دم قریب آگئی تھی۔ ہم تینوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے اٹھے اور ایک چٹان کے پیچھے دبک گئے جہاں سے ذرا سا سر نکال کر کالا پوائنٹ کے کنارے کی طرف دیکھا۔ کنارے پر ایک چھوٹی بوٹ آکر رکی تھی۔ چاند کی مدہم روشنی میں بوٹ کے اندر دو ہیولے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک ہیولہ تیزی سے بوٹ سے اترا' اس کے انداز سے گھبراہٹ اور بے چینی جھلک رہی تھی' اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ چال بتا رہی تھی کہ بریف کیس کافی وزنی ہے' اس نے



چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ہم اس سے کافی فاصلے پر چٹان کی آڑ میں تھے۔ ملگجے اندھیرے میں وہ شخص سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ اس نے دوبارہ محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر زمین پر بیٹھ گیا۔ بریف کیس اس نے سائیڈ پر رکھ دیا تھا پھر اس نے ہاتھوں سے زمین سے کچی مٹی ہٹانی شروع کر دی' ذرا سی دیر میں زمین میں ایک گڑھا ہوگیا۔ اس نے بریف کیس کو اس گڑھے کے اندر رکھا اور اس کے اوپر واپس مٹی ڈال کر زمین کو پہلے کی طرح ہموار کر دیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے یہ کام کیا تھا پھر نزدیک ہی رکھا ایک پتھر اس نے نشانی کے طور پر اس جگہ پر گاڑ دیا۔ اپنا کام مکمل کر کے وہ تیزی سے اٹھا اور جا کر بوٹ میں بیٹھ گیا' بوٹ فوراً روانہ ہوگئی۔ ہم تینوں نے سکون کا سانس لیا۔ ہمارے دلوں سے خوف چھٹ چکا تھا لیکن خوف کی جگہ اب تجسس نے لے لی تھی۔ جب مجھے اچھی طرح یقین ہوگیا کہ بوٹ جا چکی ہے اور اب کوئی خطرہ نہیں تو میں تیزی سے چٹان کی آڑ سے نکلا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس شخص نے بریف کیس دبایا تھا۔ حسن اور رضا بھی میرے پیچھے تھے۔

''ضرور یہ کوئی اسمگلر تھے اور انہوں نے کسی خطرے کی وجہ سے بریف کیس یہاں دبایا ہے' اس میں یقیناً کوئی قیمتی چیز ہے۔'' حسن دبے دبے الفاظ میں بولا۔

''ہاں' ہاں' میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میرے لہجے میں بے چینی تھی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے اس جگہ کو کھودنا شروع کر دیا جہاں اس شخص نے بریف کیس دبایا تھا۔ کچھ ہی دیر میں بریف کیس میرے ہاتھوں میں تھا۔ حسن اور رضا میرے اور قریب آگئے تھے۔ بریف کیس کافی بھاری تھا' کم از کم سات سے آٹھ کلو کا تو ہوگا۔ میں نے بے تابی سے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر اس میں لاک لگا ہوا تھا۔ اضطراب کے مارے میرا برا حال تھا' کافی کوشش کے بعد بھی جب وہ نہ کھلا تو میں نے نزدیک پڑا پتھر اٹھا کر اس کی لاک پر زوردار ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ چند ضربوں کے بعد ہی بریف کیس ایک جھٹکے سے کھل گیا اور اس کے اندر سے پیلے پیلے رنگ کے بسکٹ نکل کر زمین پر بکھر گئے۔ چاند کی روشنی میں ان پیلے بسکٹوں سے سنہری کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے ایک بسکٹ کو اٹھا کر غور سے دیکھا' اس پر لکھا تھا۔

''سوئس گولڈ 999.9100 گرام۔''

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے۔

''یہ تو سونے کے بسکٹ ہیں اور اتنے سارے.....'' مجھے اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''انہیں فوراً اس بکسے میں ڈال دے' ہمیں پولیس کو اطلاع دینی ہوگی۔'' حسن بولا۔

''پاگل ہوگیا ہے تو' پولیس والے کون سا ایمان دار ہوتے ہیں' سب ہڑپ کر جائیں گے۔ میں اس میں سے کسی کو ایک بسکٹ بھی نہیں دوں گا' یہ سب میرے ہیں۔ اللہ نے مجھے چانس دیا ہے۔ میں کہتا تھا نا کہ اللہ ہر انسان کو زندگی میں ایک چانس ضرور دیتا ہے۔ دیکھو آج مجھے چانس مل گیا' مل گیا نا چانس.....'' میں دیوانہ وار بڑبڑا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے' اگر انہیں پولیس کے حوالے نہیں کرنا تو پھر اس کے تین حصے ہوں گے' تین نہیں بلکہ چار' ایک عاصم کا' وہ بھی ہمارا دوست ہے۔'' رضا ایک بسکٹ اٹھاتا ہوا بولا۔

''خبردار..... ہاتھ مت لگانا.....'' میں نے بسکٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ ''یہ سب میرا ہے'

کوئی صدمہ نہیں ہوگا۔'' مجھ پر جنونی کیفیت طاری تھی' شاید اتنا سارا سونا دیکھ کر مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ حسن اور رضا حیرت سے میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ رہے تھے۔

''دیکھ' ابھی تو یہ دولت دیکھ کر تو جذباتی ہو رہا ہے اور جذبات میں پتا نہیں کیا اول فول بک رہا ہے۔ ایسا کرتے ہیں' گھر جا کر فیصلہ کرتے ہیں کہ اس کا کیا کرنا ہے؟'' حسن نرمی سے بولا۔

''فیصلہ' کیسا فیصلہ..... فیصلہ تو ہو گیا' اس میں سے کسی کو کچھ نہیں ملے گا' مجھے چانس ملا ہے اور چانس بار بار نہیں ملتا۔ اب مجھے چانس ملا ہے تو تم دونوں کو ہضم نہیں ہو رہا۔ میں خبردار کرتا ہوں کہ اگر کوئی فضول بات کی تو میں تم دونوں کو مار کر یہیں گاڑ دوں گا۔'' میں حسن کو دھکا دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اندر حیوانیت حلول کر گئی تھی۔ دولت دیکھ کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ حسن اور رضا مجھے اپنے دشمن نظر آ رہے تھے۔

میری اس حرکت سے حسن ایک دم طیش میں آ گیا۔ ''انسان بن' دولت دیکھ کر تو اس قدر گر جائے گا' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' اس نے میرے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔

بس پھر کیا تھا' میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' حسن سے الجھ پڑا۔ رضا خوفزدہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟ ہم نے تو ایک دوسرے کو بھائیوں کی طرح سمجھا ہے۔ کہاں گئی تمہاری دوستی اور خلوص و محبت؟''

''اسے کیا پتا خلوص و محبت کس چڑیا کا نام ہے؟'' حسن نے میرے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ مجھ پر ایک دم جنون سوار ہو گیا اور مجھے ہوش نہ رہا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ جب میرا پاگل پن ختم ہوا تو میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں ایک بھاری پتھر تھا اور حسن خون میں لت پت زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی کھوپڑی چیخ گئی تھی۔ میں ہوش میں آ گیا تھا اور ہکا بکا کھڑا حسن کو دیکھ رہا تھا۔ حسن کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور مجھے اس طرح گھور رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ یہ تو نے کیا' کیا میرے دوست؟ چند روپوں کی خاطر مجھے مار ڈالا؟ کم سے کم میری بوڑھی ماں اور بہنوں کے بارے ہی میں سوچا ہوتا کہ میرے مرنے کے بعد اُن کا کیا ہوگا؟

میں نے ایک جھرجھری لے کر اس کی آنکھوں سے اپنی آنکھیں ہٹالیں اور رضا کی طرف دیکھا' رضا تھر تھر کانپ رہا تھا' خوف کی شدت سے اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔

''میں نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا' حسن نے مجھے طیش دلایا تھا اور اب میں تجھ سے بھی کہتا ہوں کہ اگر تو نے اس بات کا ذکر کسی سے کیا تو میں تجھے بھی مار ڈالوں گا۔'' میں رضا سے بولا۔ رضا کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ بری طرح دہشت زدہ ہو گیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ میں پہلے ہی جنون میں ایک قتل کر چکا تھا اور اب میں رضا کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نرم لہجہ میں کافی دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ رضا کا ایک ہی سوال تھا کہ ہم حسن کے گھر والوں کو کیا جواب دیں گے اور اس کی ماں اور بہنوں کا کیا ہوگا؟

''ہم کہہ دیں گے کہ حسن شکار کرتے ہوئے اوپر سے گر گیا اور رہی اس کے گھر والوں کی بات تو ان کا سارا خرچ میں اٹھاؤں گا مگر تو اپنی زبان بند رکھنا' کبھی بھول کر بھی اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔'' رضا خوف سے اقرار میں سر ہلاتا رہا۔ اس کے بعد میں نے حسن کی لاش کو گھسیٹ کر چٹان سے نیچے سمندر میں پھینک دیا اور اس کے بعد کی ساری کہانی تو تجھے پتا ہے۔



میری غلط فہمی تھی کہ دولت پا کر میں ہر طرح کا سکون پالوں گا لیکن سکون تو دور کی بات' میں ایک رات سکون سے سو بھی نہیں سکا۔ حسن کا مسخ چہرہ بار بار میرے سامنے آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے میرا پیچھا کر رہا ہو اور پھر جس دن میں تیرے ساتھ اپنے پرانے محلے میں گیا تھا' اس کے بعد سے مجھے دھمکی آمیز فون کالز ملنی شروع ہو گئی ہیں' وہ لوگ مجھ سے بھتہ مانگ رہے ہیں اور نہ دینے کی صورت میں مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں مارا نہ جاؤں' اسی خوف کی وجہ سے میں نے اپنے وکیل کو وصیت لکھوا دی ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو وہ تیرے پاس آئے گا۔ یہ تیری ذمہ داری ہے کہ تو حسن اور رضا کے گھر کا خیال رکھے گا۔ خط پڑھ کر جلا دینا اور ہو سکے تو اپنے اس گناہ گار دوست کو معاف کر دینا۔

فقط

الطاف''

میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے خط بند کر دیا' میرے ذہن میں کافی دنوں سے جو سوال مچل رہا تھا' اس کا جواب مل گیا تھا۔

حسن اور رضا کے گھر والوں کو آج تک پتا نہیں چلا کہ ان کے بوسیدہ اور خستہ مکان پکے اور شاندار کیسے ہو گئے اور ان کے مہینے کا خرچ کا انتظام کون کرتا ہے؟ البتہ میں اب بھی اُسی بوسیدہ مکان میں ہوں۔ مجھے اس دولت سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جس میں حسن اور رضا کے خون کی بو آ رہی تھی اور جس نے دوستی کے رشتے میں نفرت اور خودغرضی کی دراڑ ڈال دی تھی ہاں البتہ میں بھی کسی چانس کی تلاش میں ہوں مگر ایسا جائز چانس جس میں کسی کی جان نہ جائے اور اس میں سے خون کی بو نہ آئے.....

.....☆☆.....

# غزل

خیمۂ جاں میں دل کشی رکھ دی
اُس نے بنیادِ عاشقی رکھ دی

جن کو تعبیر مل نہیں سکتی
ایسے خوابوں میں زندگی رکھ دی

عشق رکھا غمِ فراق کا نام
قسمتِ دل شکستگی رکھ دی

کر دیا عشق نے اسے دریا
میرے ہونٹوں پہ تشنگی رکھ دی

ایک لمحہ سکون کا نہ ملا
کس خرابے میں زندگی رکھ دی

دردِ دل میں سکون کی خاطر
پہلوئے دل میں شاعری رکھ دی

میں نے بنیادِ شہر میں پروینؔ
اپنے حصے کی روشنی رکھ دی

پروین حیدر

## کراچی سے

اے شہرِ بے مثال، یہ کیا تجھ کو ہوگیا
کس نے کیا یہ حال، یہ کیا تجھ کو ہوگیا

سب پھول داغ داغ ہیں، کلیاں لہو لہو
ہر آنکھ اشکِ خون سے کرنے لگی وضو
کیسا ہے خوف، کیسی تباہی ہے چارسُو
ویران محفلیں ہوئیں، ٹوٹا ہر اک سُبو

جینا ہوا محال، یہ کیا تجھ کو ہوگیا
اے شہرِ بے مثال، یہ کیا تجھ کو ہوگیا

اے روشنی کے شہر، بتا تجھ کو کیا ہوا
کیوں ہر طرف ہے آج اندھیرا بڑھا ہوا
کیوں ظلم اس زمین پہ حد سے سوا ہوا
ہے خون کس کے ہاتھ پہ کس کا لگا ہوا

یہ تجھ سے ہے سوال، یہ کیا تجھ کو ہوگیا
اے شہرِ بے مثال، یہ کیا تجھ کو ہوگیا

یہ شہر اک زمانے میں جنت نظیر تھا
ہر شخص روشنی کا یہاں کی اسیر تھا
انسان بااصول تھے، زندہ ضمیر تھا
خنجر تھا ہاتھ میں نہ کماں تھی نہ تیر تھا

اب کیوں ہے پائمال، یہ کیا تجھ کو ہوگیا
اے شہرِ بے مثال، یہ کیا تجھ کو ہوگیا

سعدیہ حریم



## شہید کی کہانی (ہمارے وطن کا دفاع کرنے والے شہیدوں کے حوالے سے ایک دلگداز سوچ)

منزہ سہام مرزا

# شہید کی ڈائری

علامہ اقبال کی پروازِ خیال
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

**قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ**

پیارے پاکستانیو.....!

اللہ کرے، آپ لوگ خیریت سے ہوں۔ اپنے وطن کے حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس بار میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لوں گا کیونکہ میں بہت مصروف ہوں، مہمانوں کا استقبال بھی تو کرنا ہے۔ پہلے تو اتنا رش نہیں ہوتا تھا مگر اب کچھ عرصے سے کافی مصروفیت رہنے لگی ہے۔ داروغۂ جنت نے پاکستانی مہمانوں کے استقبالیہ کیمپ پر میری ڈیوٹی لگا دی ہے۔

کچھ دن قبل شہدائے عباس ٹاؤن سے ملاقات ہوئی۔ ننھے باقر اور زین سے مل کر تو مجھے اپنا شیر علی یاد آ گیا۔ اس سے پہلے سانحۂ کوئٹہ والے آئے تھے، تب بھی بڑی مصروفیت رہی۔ آپ لوگ اپنی زندگیوں میں خوش رہیے۔ پولیس کو اور سیاست دانوں کو موردِ الزام ٹھہراتے رہیے۔ کیا صحیح اور کیا غلط ہے، اس بارے میں بعد میں کبھی بتاؤں گا۔ بیشتر مہمان پیاسے ہی چلے آئے تھے لہٰذا میں خاطر مدارات میں مصروف رہا۔

آج ہماری ملاقات محترم قائداعظم اور علامہ اقبال سے طے ہے، شہداء چاہتے ہیں کہ موجودہ پاکستان کے حالات تفصیل سے اُن کے گوش گزار کریں..... آپ سے تفصیلی بات چیت پھر کبھی ہوگی.....

شہیدِ وطن

سڑک کہانی

ان لوگوں کی سچی و تلخ کہانیاں جن کی زندگی سڑکوں پر سانس لیتے گزرتی ہے

نسیم سحر

# ردی والا

حامد علی سید کا خیال

لکھی ہے جس کی جہاں تک اُسے تو جینا ہے
یہ اور بات کہ دُشوار ہے بہت جینا

**زندگی کی سڑک پر حیات کی گاڑی ڈھونے والے ایک ردی والے کی حقیقی کہانی**

زندگی کی سڑک پر دوڑتے بھاگتے لوگوں کی اپنی اپنی کہانیاں ہوتی ہیں..... یہ کہانیاں اَن کہی ہوتی ہیں، کسی کے سامنے نہیں آتیں، ایسی ہی ایک اَن کہی کہانی یہ ہے، جسکی میں راوی ہی نہیں ایک کردار بھی ہوں۔

.....☆.....

وہ ردی پیپر اور بھوسی ٹکڑے والا تھا، روزانہ گلی گلی پھر کر وہ بھوسی ٹکڑے، ٹین ڈبے جمع کرتا تھا۔ میں بچپن سے اُسے دیکھ رہی تھی، کھچڑی سے بال، شکن آلود پیشانی اور پرانے سے، کسی حد تک میلے کپڑے پہنے وہ روزانہ ہماری گلی سے گزرتا تھا۔ دوپہر بارہ سے ایک بجے کے درمیان ہی اس کی آواز محلے کے تمام گھروں میں پہنچ جاتی۔ ''ردی پیپر والا.....'' برسوں سے اُس کا یہی معمول تھا۔ اکثر گرمیوں میں جب وہ تھک جاتا تھا اور پیاس لگتی تھی تو وہ کسی نہ کسی گھر کے باہر بنے چبوترے پہ بیٹھ جاتا اور پینے کے لیے پانی مانگ لیتا لیکن ویسے وہ تھا بہت خوددار آدمی، اگر میں کبھی اُسے کھانا وغیرہ دینے کی کوشش کرتی تو وہ بہت نرمی سے انکار کردیتا۔ ''باجی.....! بہت شکریہ! میں بس اپنی حق حلال کی روزی کھاتا ہوں۔''

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ جو ردی والے، سبزی والے، گلیوں میں گھوم کر اپنی روزی کماتے ہیں، محلے والے اُن کی آواز کے عادی ہوجاتے ہیں اور اگر کبھی اُن کی آواز سنائی نہ دے تو بے چینی سی ہوتی ہے۔ ''اللہ خیر کرے!'' جیسے الفاظ منہ سے خود بخود نکل جاتے ہیں..... ویسے بھی یہ ہماری طرح انسان ہی تو ہیں، کیا ہوا اگر غریب ہیں، یہ ایمانداری سے محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال رہے ہوتے ہیں، زندگی کا حق ادا کررہے ہوتے ہیں۔

گئے دنوں کی بات ہے جب میرے بھائی کی شادی کا زندگی سے بھرا ہنگامہ ختم ہوئے دو تین روز ہوئے تھے، گھر بہت پھیلا ہوا تھا، امی نے میرے ساتھ مل کر پورے گھر کی صفائی کی تھی اور سب فالتو کاٹھ کباڑ جمع کرکے ایک بڑے شاپر میں ڈال کر رکھ دیا تھا کہ جب ردی والا آئے گا تو اُسے دے دیں گے مگر ہوا یہ تھا کہ دو دن ہوگئے تھے، وہ نہیں آیا تھا۔

تیسرے دن بعد جب وہ آیا تھا تو امی نے پوچھا تھا۔ ''بھائی.....! خیریت تو تھی؟ کہاں غائب تھے؟''

''آپا.....! وہ..... میری گھر والی ذرا بیمار تھی۔''

''پھر ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''ہاں آپا.....! سرکاری ہسپتال لے گیا تھا۔ آپ کو تو پتا ہے، وہاں کتنا رش ہوتا ہے، نمبر بہت دیر سے آتا ہے اس لیے دو دن چھٹی کرنی پڑی۔'' اُس نے جواب دیا تھا۔ خیر، امی نے وہ سارا جمع شدہ فالتو سامان اُس کو دے دیا تھا۔ اُس نے تول کے بعد جو پیسے بنے تھے، وہ دیئے تھے اور آواز لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

دوسرے دن صبح ہم ناشتہ کررہے تھے کہ دروازہ بجا تھا، امی اٹھ کر گئی تھیں تو سامنے ردی والا کھڑا تھا۔ امی اُسے اتنی صبح دیکھ کر حیران ہوئی تھیں اور پھر انہوں نے سوچا تھا کہ اس کی بیوی بیمار ہے، ہوسکتا ہے، اسے پیسوں کی ضرورت ہو، ساتھ ہی اُن کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ذرا سی خیریت کیا پوچھ لی، یہ تو پھیل گیا۔ (یہ بات امی نے مجھے بعد میں بتائی تھی۔) سو انہوں نے ذرا روکھے سے لہجے میں پوچھا تھا۔ ''کیا بات ہے؟''

ردی والا بولا تھا۔ ''آپا.....! آپ نے کل مجھے ردی کا سامان دیا تھا، ہم ردی کا سب سامان الگ الگ کرتے ہیں، کل چھانٹی کے دوران جب آپ کا سامان کھولا تو.....''

''ہاں، ہاں! کیا ہوا، جلدی بتاؤ؟'' امی نے درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''وہ..... جی.....! اس میں سے یہ گھڑی نکلی ہے، یہ تو بالکل نئی گھڑی ہے، غلطی سے سامان میں رہ گئی ہوگی، بس یہی دینے آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک گھڑی امی کے حوالے کی تھی۔

میں نے اور امی نے فوراً اُس گھڑی کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہ قیمتی گھڑی تھی جو کہ امی نے اپنے داماد یعنی میرے بہنوئی کو میری بہن کی شادی کے موقع پر تحفے میں دی تھی۔ معلوم نہیں، وہ گھڑی اُس سامان میں کیسے چلی گئی تھی؟ اب جو گھڑی دیکھی تھی تو ہم حیران رہ گئے تھے۔

امی دل ہی دل میں کافی شرمندہ ہو رہی تھیں کہ خوامخواہ ہی اُس غریب لیکن ایماندار ردی پیپر والے کے بارے میں بدگمانی کی، ہم نے اُس کا بے حد شکریہ ادا کیا تھا اور امی نے تو اُسے بیوی کے علاج کے لیے کچھ پیسے بھی دینے چاہے تھے مگر اُس نے شکریئے کے ساتھ وہ پیسے واپس کر دیئے تھے مگر امی کے بے حد اصرار پر کہ میں یہ پیسے کوئی خیرات نہیں بلکہ انسانیت کے ناطے جو ایک مسلمان کا فرض ہے، تمہیں دے رہی ہوں تو اُس نے وہ پیسے لیے تھے اور سلام کر کے چل دیا تھا۔

اُس کے جانے کے بعد ہم لوگ واقعی حیران تھے کہ ایک غریب آدمی جس کی بیوی بیمار ہے، اُسے یقیناً پیسوں کی شدید ضرورت ہوگی، اُس کے لیے تو یہ نادر موقع تھا کہ وہ آرام سے اِس قیمتی گھڑی کو بیچ کر اپنی ضرورت پوری کرتا، وہ گھڑی جو کہ اُس وقت تقریباً پچاس ہزار کی تھی، اُس نے نہ تو چرائی تھی نا ہی مانگی تھی اور نہ چھینی تھی بلکہ اتفاقیہ ہی اس کو ملی تھی مگر پھر بھی اُس نے بہت ایمانداری سے وہ گھڑی ہمیں واپس کر دی تھی۔ سچ ہے کہ ایمانداری و شرافت کسی کی میراث نہیں بلکہ بہت کڑوی مگر سچی بات تو یہی ہے کہ یہ زیادہ تر غریب لوگوں میں ہی پائی جاتی ہے اور اُس ردی والے نے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ زندگی کی سڑک پر عام انسانوں کے روپ میں محنت مزدوری کرتے انسانوں کے روپ میں تو بڑے بڑے عظیم اور درویش صفت لوگ گھوم رہے ہوتے ہیں!

.....☆☆.....

## سوال

اے شہرِ کراچی کے
آوارہ گرد
سفاک
قاتلوں!
اتنا تو بتاؤ؟
سہمے سہمے حساس لوگوں میں
پریشاں و اُداس لوگوں میں
پھیلا کر ہر جانب
یوں خوف و ہراس لوگوں میں
تمہیں نیند کیسے آتی ہے
لوٹ کر ہر دل کا قرار
چھین کر سب کی آنکھوں سے خمار
بوڑھے باپ کے جھکے ہوئے کمزور کاندھوں پر
اُٹھا کر جواں بیٹوں کے جنازے
چھلنی کر کے ماؤں کے جگر
معصوم پھولوں جیسے بچوں کے سر سے
شفقت کا سائبان چھین کر
بہنوں کی عصمت کا سودا کر کے
سونی کر کے سہاگنوں کی
ارمانوں خوابوں بھری کلائیاں
تمہیں نیند کیسے آتی ہے؟
آنکھوں سے لوگوں کی
چھین کر خواب
انہیں رت جگوں کے عذاب دے کر
تمہیں نیند کیسے آتی ہے؟

شانی خامان۔ کراچی



**سلسلہ خاص** ایک نامور لکھاری کا تہلکہ خیز سلسلہ، جسے پڑھنے والے مدتوں یاد رکھیں گے

سلیم فاروقی

# آتشِ جنوں

شاعر کا خیال

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی پیار کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

**ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت، اس کے دل میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا۔ قسط نمبر 13**

## خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں، ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے، نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے..... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان، راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی، راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں، اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان منہ ماری ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے اور آزاد کرا کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس، عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورتِ حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا' اُس کے والد بھی اِس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پتہ لگتا ہے' عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان' بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے..... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں.....

راستے میں تیمور اور عمران' شیر خان پر قابو پا لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ بابر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچانک ریوالور نکال کر بابر خان کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ بابر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

فائلوں کے حصول کے بعد عمران اور تیمور گھر آتے ہیں تو اُن کے گھر پر بم سے حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں ان کا بھائی ارسلان بھی کام آ جاتا ہے' اس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ مشہدی نے کرایا تھا۔ جوابی وار کے طور پر عمران اور تیمور' مشہدی کے ایک قریبی ساتھی جان محمد کی دو بیٹیوں کو اغواء کر کے اسے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اُن کی بہن کے بارے میں بتائے ورنہ اُس کی بیٹیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جان محمد کی بیٹیاں ندا اور حرا' عمران کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو وہ بھی جذباتی ہو کر انہیں بہن کا درجہ دے کر اُن کے گھر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کے بھائی عدنان کی آمد ہوتی ہے جسے وہ مُردہ تصور کر چکا تھا۔ آگے چل کر عمران' تیمور اور نادیہ اپنے دشمن بابر خان کو اغوا کرتے ہیں اور عمران اُسے معذور کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

''اب وقت گزر چکا ہے۔'' میں نے بے نیازی سے کہا اور اس کے ہاتھ پر ہتھوڑے کی ہلکی سی ضرب لگائی۔ وہ ہتھوڑا اتنا بھاری تھا کہ اس کی ہلکی ضرب سے بھی اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں نے جان بوجھ کر اس کے کلائی کے جوڑ کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔

بابر خان کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی۔

میں نے ہتھوڑا دوبارہ اٹھایا تو وہ چیخ کر بولا۔ ''میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں' پلیز' رک جاؤ۔''

تیمور نے اچانک آگے بڑھ کر ہتھوڑا پکڑ لیا اور بولا۔ ''بھیا! غصہ تھوک دیں' وہ سب کچھ بتانے کو تیار ہے۔''

''میرا ہاتھ چھوڑو تیمور.....!'' میں نے درشت لہجے میں کہا اور تیمور کو آنکھ ماری۔

''بھیا! اسے ایک موقع اور دے دیں۔''

''تم اس کے حمایتی کب سے بن گئے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''آپ ہی تو کہتے ہیں کہ کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہیے؟''

''یہ ظلم نہیں ہے بلکہ اس کی سزا ہے تیمور.....!'' میں نے کہا۔ ''اس کے گناہوں کی فہرست تو بہت طویل ہے۔''

''ہاں' بولو۔'' تیمور نے مجھے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میرے ہاتھ میں شدید تکلیف ہو رہی ہے۔'' بابر خان نے کہا۔ ''مجھے میڈیکل ایڈ تو دے دو۔''

''تمہیں میڈیکل ایڈ بھی ملے گی لیکن ہمارے سوالوں کے بعد۔'' تیمور نے کہا۔ ''اب شروع ہو جاؤ۔''

''میں تکلیف سے مر رہا ہوں۔'' بابر خان نے کہا۔

''یہ وقت ضائع کر رہا ہے تیمور!'' میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ یہ کتے کی دم ہے' یوں سدھرنے والا نہیں ہے۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر وہ ہتھوڑا اٹھانے کی کوشش کی جو تیمور نے میرے ہاتھ سے لے کر رکھ دیا تھا۔

''ہاں..... عبداللہ کو میں نے ہی گولی ماری تھی۔'' بابر خان کرب ناک لہجے میں بولا۔ ہڈی ٹوٹنے سے وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ تو تم پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میں مشہدی کی باتوں میں آ گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''مشہدی نے مجھے لالچ دیا تھا کہ وہ مجھے یہاں کے معاملات کا چیف بنا دے گا۔ اس نے مجھے پانچ کروڑ روپے بھی دیئے تھے۔''

''اور تم نے محض پانچ کروڑ کی خاطر اپنے بھائی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''عبداللہ تمہیں اپنا بھائی ہی کہتا تھا نا؟''

''اُن دنوں عبداللہ کا رویہ بھی کچھ عجیب ہو رہا تھا۔'' بابر خان نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''وہ میری ہر بات پر تنقید کر رہا تھا۔''

''دوستوں میں کبھی کسی بات پر اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوست کو ختم ہی کر دیا جائے۔''

''وہ فائل کہاں ہے جو تم نے عبداللہ کے سیف سے نکالی تھی؟'' میں نے ہوا میں تیر چھوڑا۔

''وہ فائل نہیں تھی بلکہ کچھ کاغذات تھے۔'' تیمور نے کہا۔ ''وہ میں نے تین لفافوں میں رکھ کر اپنے کوٹ کے استر میں چھپا لیے تھے۔''

''اور یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم آج وہی کوٹ پہن کر آ گئے ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے وہ کاغذات چھپائے کیوں تھے؟''

''ان کاغذات کا علم ابھی تک مشہدی کو بھی نہیں ہے' وہ میرے پاس ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ وقت آنے پر مشہدی سے بھی سودے بازی کروں گا۔'' بابر خان نے کہا۔

''تم مشہدی کو بھی ڈبل کراس کر رہے تھے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ اگر اسے اس کا علم ہو جاتا تو وہ تمہاری کھال اتار لیتا؟''

''وہ ڈیل اتنی بڑی ہے کہ میں کاغذات چھپانے پر مجبور ہو گیا۔ اربوں روپے کی ڈیل ہے' اس پہ اگر میں مشہدی سے پچیس کروڑ بھی مانگتا تو وہ دینے سے انکار نہیں کرتا۔''

میں نے جیب سے وہ لفافے نکالے اور انہیں ایک ایک کر کے کھول لیا۔ ان کے مطابق مشہدی ایک غیر ملک سے اسلحے کی ایک بہت بڑی کھیپ منگوا رہا تھا۔ اس میں کچھ بااثر مقامی لوگ بھی انوالو تھے۔ وہ سامان بھی ایک بااثر سیاست داں کے ذریعے منگوایا جا رہا تھا اور اسلحے کا وہ جہاز اس ماہ کی اکیس تاریخ کو کراچی پہنچ رہا تھا' گویا ابھی جہاز کے پہنچنے میں دو ہفتے باقی تھے۔

''تم نے عبداللہ کو مارا' مشہدی کو ڈبل کراس کیا' اب تم خود بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے زندہ چھوڑ دو گے۔'' بابر خان ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

''ہاں' میں نے وعدہ کیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم شاید بھول گئے کہ وہ وعدہ میں نے کس شرط پہ کیا تھا؟''

''لیکن اب تو میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے؟'' اس نے کہا۔



''تمہارے بینک میں اس وقت کتنا بیلنس ہے؟'' میں نے کہا۔

''میں اب تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔'' بابر خان نے کہا۔ ''میرے اکاؤنٹ میں اس وقت تقریباً آٹھ کروڑ روپے ہوں گے۔''

''مجھے وہ ساری رقم چاہیے پھر میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے منظور ہے۔'' بابر خان کے چہرے پر زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ ''لیکن اس کے لیے مجھے چیک بک کی ضرورت پڑے گی۔'' اس نے کہا۔

''چیک بک تمہارے بریف کیس میں موجود ہے اور بریف کیس گاڑی میں تھا۔'' تیمور نے کہا۔

''تمہیں چیک دے کر صرف اپنے بینک کو ایک ٹیلی فون کرنا ہوگا کہ تمہیں اپنے کسی پروجیکٹ کے لیے یہ رقم درکار ہے۔''

''ٹھیک ہے' یوں ہی سہی۔'' اس نے کہا۔

مجھے رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن میں اسے سزا کے طور پر کنگال کرنا چاہتا تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ میں اس سے رقم لینے کے بعد اسے رہا کر دوں گا اور مشہدی کو اس کے بارے میں بتا دوں گا۔ میں جانتا تھا کہ مشہدی اسے کسی بھی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

تیمور اس کی چیک بک لے آیا۔


میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی

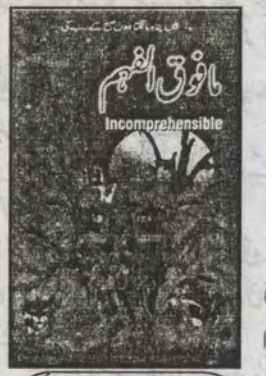


مافوق الفہم

INCOMPREHENSIBLE

محمد فہیم کے قلم سے

☆ جنات' موکلات' ارواح خبیثہ' حاضراتِ ارواح' چڑیل' چھل پیری وغیرہ کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ مرنے کے بعد روح کا قیام کہاں ہوتا ہے؟

☆ جادو' سحر' ٹونا' ٹوٹکا' سفلی علم اور پاک علم کیا چیزیں ہیں۔ علمائے دین اس بارے میں کیا فرماتے ہیں' اس بارے میں لوگوں کے دلچسپ واقعات۔

دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے قارئین کیلئے 50 فیصد کی رعایت (علاوہ محصول ڈاک) اصل قیمت =/270 روپے

بذریعہ وی پی منگوانے کیلئے SMS کیجئے 0332-3376124

ملنے کا پتہ

اسلوب پبلیکیشنز' B-31 روفی گرین لینڈ' اسکیم نمبر 33' ابو الحسن اصفہانی روڈ۔ گلشن اقبال ٹاؤن۔ کراچی 75330

''تم صرف بلینک چیک پر سائن کردو۔'' میں نے کہا۔ ''پھر بینک کو ٹیلی فون پر اطلاع دینا کہ تمہارا آدمی چیک لے کر آ رہا ہے۔ مجھے بیلنس بتا دیں تاکہ میں اسے انفارم کر سکوں اور وہ چیک میں رقم لکھ سکے۔''

تیمور کے چہرے پہ پھر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ کراہ کر بولا۔ ''میں نے بتایا تو ہے کہ میرے اکاؤنٹ میں آٹھ نو کروڑ سے زیادہ رقم نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، ممکن ہے نو کروڑ سے کم ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ نو کروڑ سے زیادہ ہو۔'' میں نے کہا۔ ''چلو چیک پر سائن کرو۔''

یہ بھی غنیمت تھا کہ میں نے اس کے بائیں ہاتھ کی ہڈی توڑی تھی۔ وہ ابھی سائن کرنے کے قابل تھا۔ اس نے بہت جبر کر کے چیک پر سائن کر دیئے۔

میں نے تیمور سے کہا۔ ''ڈاکٹر حامد کو بلاؤ تاکہ اسے فرسٹ ایڈ دے سکے۔''

''ڈاکٹر حامد آج کل حیدر آباد گیا ہوا ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''وہ کل تک آ جائے گا۔ اسے فرسٹ ایڈ تو میں بھی دے سکتا ہوں۔''

اس نے کہا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ اس نے تیمور کے زخم صاف کر کے ان پر کوئی پاؤڈر چھڑک دیا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو فوری طور پر لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے ذریعے باندھ دیا اور اسے خواب آور انجکشن دے دیا۔

اس سے فارغ ہو کر ہم باہر نکلے کہ چار بجنے میں دس منٹ تھے۔ اب کسی بھی وقت جان محمد کا ٹیلی فون آ سکتا تھا۔ میں ہر طرح سے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

اس وقت تک ہاشم بھی اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ہم لوگ ابھی تھوڑی دیر میں ایک ضروری کام سے جائیں گے۔ یہاں ایک کمرے میں دو لڑکیاں اور اوپر ایک زخمی ہے۔ خیال رکھنا کہ ان میں سے کوئی نکلنے نہ پائے۔''

''میں ایسا کرتا ہوں، بابر خان کے ہاتھ پھر باندھ دیتا ہوں، اس کے پیر تو ابھی تک بندھے ہوئے ہیں۔'' یہ کہہ کر تیمور اوپر چلا گیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی، وہ جان محمد کا نمبر تھا۔ میں نے لائن کاٹ دی اور وہ سیل فون نکالا جس کی سم نامعلوم تھی۔ میں نے جان محمد کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''ہاں جان محمد، کیا خبر ہے؟''

''میں وہاں تک پہنچ تو گیا ہوں لیکن ابھی لڑکی کو وہاں سے نکالنے میں کچھ وقت لگے گا کیونکہ وڈیرا موجود نہیں ہے لیکن تم فکر مت کرو، آج یہ کام ہر صورت میں ہو جائے گا۔''

میں نے جھنجلا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ سیل فون کا اسپیکر آن تھا اس لیے تیمور اور ہاشم دونوں ہماری گفتگو سن رہے تھے۔

''آپ کچھ دیر مزید انتظار کر لیں۔'' تیمور نے کہا۔ ''جان محمد کو اپنی بیٹیاں پیاری ہیں تو وہ ہم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

میں انتظار کرتا رہا، تقریباً بیس منٹ بعد میرے سیل فون کی بیل پھر بجی۔ میں نے جلدی سے سیل فون اٹھایا



لیکن وہاں جان محمد کی بجائے مشہدی کا نمبر تھا۔

میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو.....!''

''عمران.....! تم خود کو بہت چالاک سمجھتے ہو، تم نے جان محمد کو بلیک میل کر کے اسے ڈولی کو اغوا کرنے پر آمادہ کیا۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''صاف صاف بات کرو۔''

''اتنے بھولے مت بنو۔'' مشہدی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں اب تک تمہیں خود ہی طرح دے رہا تھا ورنہ جب چاہوں، تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دوں۔ میرے پاس اس سے زیادہ اہم کام ہیں اس لیے میں نے تمہیں چھوڑ رکھا تھا۔''

''کیا تم نے مجھے اسی لیے ٹیلی فون کیا تھا؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''میں نے تمہیں یہ بتانے کو ٹیلی فون کیا تھا کہ جان محمد کی لاش ایک گھنٹے بعد اس کے گھر پہنچ جائے گی۔''

''جان محمد کی لاش.....؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، میں غداروں کو کبھی معاف نہیں کرتا، تمہاری وجہ سے جان محمد غداری پر آمادہ ہوا اور میں اپنے ایک بہترین آدمی بلکہ دست راست سے محروم ہو گیا۔ اب تم سوچ لو کہ جب میں جان محمد کو ہلاک کر سکتا ہوں تو تم کس گنتی میں ہو؟ اب تم بھی الٹی گنتی شروع کر دو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارا سراغ نہیں لگا سکتا؟ اگر تم یہ سمجھتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں دو دن کے اندر اندر تمہارا سراغ لگا لوں گا۔''

''میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ تم شائستہ کو چھوڑ دو۔''

''جب تم ہی نہیں رہو گے تو شائستہ کس کے سہارے زندہ رہے گی؟ تمہارے خاندان کا ایک ایک فرد جہنم رسید ہو چکا ہے۔''

''وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم شائستہ کو چھوڑ دو۔ میں دو دن کیا، دو گھنٹے میں خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

''میں کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ تمہیں تو میں ڈھونڈ ہی لوں گا لیکن شائستہ کو رہا نہیں کروں گا، کسی بھی قیمت پر نہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے بپھر کر پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ حسین اور نازک لڑکی مجھے پسند آ گئی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم ہوش میں تو ہو؟'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''تم میری بہن سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

''دیکھو عمران.....! میں لاکھ برا آدمی سہی لیکن میرے بھی کچھ اصول ہیں، میں اگر جبراً اس سے شادی کرنا چاہتا تو اب تک کر بھی چکا ہوتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی رضامندی سے میرے ساتھ شادی کرے۔''

''اور تمہارے خیال میں وہ راضی ہو جائے گی؟'' میں نے کہا۔

''اسے راضی ہونا پڑے گا۔'' مشہدی نے کہا۔ ''یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ مشہدی جیسا کھرب پتی اور بین الاقوامی شہرت کا آدمی اس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔''

''بین الاقوامی شہرت؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اسی وقت تیمور نے مجھے اشارہ کیا کہ لائن کاٹ دوں۔

''خیر' دیکھا جائے گا۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

''وہ آپ کو باتوں میں لگا کر آپ کا نمبر ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ اب فوری طور پر یہ سم نکال دیں۔'' تیمور نے کہا۔

''ہاں' واقعی' وہ ایسا کر سکتا ہے۔ مجھے غصے اور جذبات میں اس بات کا خیال ہی نہیں رہا۔''

میں سیل فون آف کرنے ہی والا تھا کہ اس کی گھنٹی پھر بجی۔ اس دفعہ پھر اسکرین پر مشہدی کا نام تھا۔

میں نے بات کیے بغیر سلسلہ منقطع کیا اور سیل فون آف کر کے اس میں سے سم نکال دی۔

''کل میں ایک اور ''بے نام'' سم لے آؤں گا۔'' تیمور نے کہا۔ ''مشہدی کیا سمجھتا ہے کہ اسی کے پاس ذہن ہے' باقی سب لوگ عقل سے پیدل ہیں؟ یہ سم خالصتاً میرے آئی ٹی کے ایک دوست کی ایجاد ہے۔ مشہدی لاکھ سر پٹختا رہے لیکن اس سم کے ذریعے ہمارا سراغ نہیں لگا سکتا۔''

''اب ان لڑکیوں کو بھی یہاں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' نادیہ نے کہا۔

''اتنی جلدی مت کرو۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے یہ تصدیق تو ہو جائے کہ جان محمد واقعی ہلاک ہو چکا ہے۔ ممکن ہے' مشہدی ہمارے ساتھ ملف کر رہا ہو۔ وہ اپنے اتنے بہترین آدمی کو یوں نہیں مار سکتا۔''

''وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''اس نے میرے بھائی کو پلک جھپکتے میں گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔ وہ بھی اس کے خاص آدمیوں میں سے ایک تھا۔ اس کے پاس لوگوں کی کمی نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جان محمد اور وسیم جیسے لوگ مشکل سے ملتے ہیں۔ دونوں کی موت اس کی بیٹی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو بہت چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ٹھٹھہ میں اس نے کس وڈیرے کے پاس ڈولی کو رکھا ہوگا۔''

''ڈولی اب تک وہاں سے کہیں اور بھیج دی گئی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اس وڈیرے کو ضرور علم ہوگا کہ ڈولی کہاں ہے؟''

''ہم لوگ دوسروں کے بجائے ڈائریکٹ مشہدی ہی پر ہاتھ کیوں نہ ڈالیں؟'' میں نے کہا۔

تیمور اور ہاشم نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو لیکن وہ کچھ بولے نہیں۔

''میں پاگل نہیں ہوا۔'' میں نے کہا۔ ''مشہدی بھی آخر انسان ہے' وہ بھی گوشت پوست کا بنا ہوا ہے' ہوا یا دھواں نہیں ہے کہ ہمارے قابو میں نہ آئے۔ اسے بھی گولی لگے گی تو تکلیف ہوگی۔ گولی اگر کھوپڑی پہ لگ گئی تو اس کا قصہ ہی پاک ہو جائے گا۔''

''آپ شاید مشہدی کو اچھی طرح جانتے نہیں ہیں اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔''

''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ انسان ہے اور ہماری ہی طرح کا انسان ہے پھر اسے اغوا کرنے میں قباحت کیا ہے؟''

''اس کے آگے پیچھے گارڈز کی ایک فوج چلتی ہے۔ اول تو وہ گھر سے باہر ہی بہت کم نکلتا ہے اور نکلتا بھی ہے تو کئی گاڑیوں میں اس کے ایسے محافظ ہی ہوتے ہیں جو بظاہر اس سے بالکل لاتعلق ہوتے ہیں' اصل مسئلہ ان ہی کا ہے۔''



''اور وہ جو آئے دن وزیروں اور سفیروں کی پارٹیوں میں شریک ہوتا ہے تو کیا وہاں ہیلی کاپٹر میں جاتا ہے یا پھر سلیمانی ٹوپی پہن لیتا ہے؟''

''وہاں تو وہ بالکل محفوظ ہوتا ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''وہاں نہ صرف اس کے گارڈز ہوتے ہیں بلکہ میزبان کے گارڈز کے علاوہ پولیس کی نفری بھی ہوتی ہے۔''

''ایک بات اور بتا دوں۔'' ہاشم نے کہا۔ ''مشہدی ہمیشہ بلٹ پروف گاڑی میں سفر کرتا ہے۔''

''ہاں' اگر انسان فیصلہ کر لے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب امریکن سی آئی اے اور دوسرے دفاعی اداروں کی موجودگی میں وہاں کے صدر جان ایف کینیڈی کو گولی ماری جا سکتی ہے تو مشہدی کو بھی اغوا کیا جا سکتا ہے۔''

''میرے خیال میں اس وقت تک جان محمد کی ڈیڈ باڈی اس کے گھر پہنچ گئی ہوگی؟'' ہاشم نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور جان محمد کی بیوی نورین کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد کسی نے کال ریسیو کی اور ایک نسوانی آواز آئی۔ ''کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''مجھے مسز ملک سے بات کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں ملک کا ایک دوست بول رہا ہوں۔''

''آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟''

''میں اس وقت لاہور میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا' آپ ہولڈ کریں۔'' اس نے کہا اور سیل فون پر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نورین کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو.....!''

''ہیلو مسز نورین ملک.....!'' میں نے کہا۔

وہ میری آواز پہچان کر پھٹ پڑی۔ ''اب کس لیے ٹیلی فون کیا ہے تم نے؟ تمہاری وجہ سے میری بچیاں بھی مجھ سے بچھڑ گئیں اور آج شوہر بھی جان سے گیا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں؟''

''کسی نے ملک صاحب کو گولی مار دی۔ انہوں نے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔'' وہ شاید رو رہی تھی کیونکہ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ جان محمد کی موت کا مجھے بھی افسوس تھا۔ وہ بہر حال میری ہی وجہ سے مارا گیا تھا۔

''لیکن مسز نورین..... ملک صاحب کو کس نے گولی ماری اور اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''وہ اپنی بیٹیوں کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ اسی پریشانی میں کسی سے ان کا جھگڑا ہو گیا۔ ان کے دشمن بھی تو بے شمار تھے۔''

''مجھے واقعی بہت افسوس ہوا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر واقعی ایسا ہے تو میں اب آپ کی بیٹیوں کو رکھ کر کیا کروں گا؟''

''اگر تمہیں میری بات پر اعتبار نہیں ہے تو ابھی جناح اسپتال ٹیلی فون کر کے معلوم کر لو۔ ابھی تک ان کی ڈیڈ

باڈی....." اس سے مزید نہیں بولا گیا اور وہ سسکنے لگی۔

"مجھے یقین ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ فکر مت کریں' آپ کی بیٹیاں آج رات کو گھر پہنچ جائیں گی۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تیمور.....!" میں نے افسردگی سے کہا۔ "اُن لڑکیوں کی واپسی کا انتظام کرو۔"

"جی بھیا.....!" تیمور نے کہا۔ "میں ابھی تھوڑی دیر میں انہیں گھر پہنچا دوں گا۔"

"انہیں گھر بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انہیں کسی ایسی جگہ چھوڑ دینا جہاں سے انہیں آسانی کے ساتھ ٹیکسی وغیرہ مل جائے۔"

"جی بہتر ہے۔" تیمور نے کہا۔ "کیا میں لڑکیوں کو بتا دوں کہ....."

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟" ہاشم نے کہا۔ "اگر تم نے ابھی سے لڑکیوں کو بتا دیا تو اُن کا گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ ہمارے لیے فضول کی مشکل کھڑی ہو جائے گی۔"

"میں ان لڑکیوں سے خود ہی بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں لڑکیوں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دونوں لڑکیاں اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ پراعتماد اور بے خوف نظر آ رہی تھیں۔

حرا نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا ہوا عمران بھائی؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ "میں آج تمہیں کسی وقت گھر چھوڑ دوں گا۔"

"کسی وقت کیوں؟" حرا نے کہا۔ "چھوڑنا ہے تو ابھی چھوڑ دیں۔"

"لیکن تم دونوں مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ کسی کو بھی ہمارے حلیے نہیں بتاؤ گی۔ کوئی پوچھے بھی تو ایسے حلیے بتانا کہ وہ ہم تک نہ پہنچ سکے۔"

"آپ فکر مت کریں۔" حرا نے کہا۔ "میں نے آخر آپ کو بھائی کہا ہے اور سمجھنے بھی لگی ہوں۔ میں کسی کو بھی آپ کے بارے میں یا تیمور یا ماریہ باجی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"تم چلنے کی تیاری کرو۔ میں تیمور سے کہتا ہوں کہ وہ تمہیں چھوڑ آئے۔" میں نے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

میں نے سوچا کہ جان محمد کی بیوی کو ٹیلی فون کر کے بتا دوں کہ اس کی بیٹیاں آدھے گھنٹے بعد گھر پہنچ جائیں گی۔ مجھے جان محمد کی موت کا بہت افسوس تھا۔

میں نے دوبارہ نورین کا نمبر ملایا تو اس نے فوراً ہی اٹھا لیا اور بولی۔ "ہیلو.....!"

"مسز ملک.....! میں....."

"میں جانتی ہوں کہ تمہیں اب تک یہ اطلاع مل گئی ہو گی اور اب تم میری بیٹیوں کو نہیں چھوڑو گے۔"

"اطلاع تو مجھے مل چکی ہے۔ ابھی میں نے....."

"لیکن یہ تو دیکھو کہ تمہارے لیے ملک صاحب اپنی جان پر کھیل گئے۔"

"ہاں' مجھے بھی....."

"اب اگرچہ وہ زندہ ہیں مگر تم کم سے کم ان کی بیٹیوں پر تو رحم کر دو۔"

"ملک صاحب زندہ ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن....."



"وہ سب ان کے پارٹنر کی چال تھی۔ تفصیل کا تو مجھے علم نہیں ہے لیکن صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ ملک صاحب ابھی زندہ ہیں۔ وہ گھر آئیں گے تو تفصیل بھی معلوم ہو گی۔"

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس وقت سیل فون کا اسپیکر آف تھا اس لیے دوسرے لوگوں نے صرف میری یکطرفہ بات ہی سنی تھی۔

"جان محمد زندہ ہے؟" تیمور نے حیرت سے کہا۔ "مشہدی نے اسے کیسے چھوڑ دیا؟"

"مجھے تو یہ جان محمد کی کوئی چال لگ رہی ہے۔" ہاشم نے کہا۔

"کچھ بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس کی بیٹیوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں ابھی تم لوگوں کو گھر بھجوا دوں گا۔"

"لیکن بھیا.....! ہماری ساری محنت....."

"تیمور.....! کبھی کبھی ایسے فیصلے بھی کرنا پڑتے ہیں۔ میں نے اُن سے وعدہ کر لیا ہے اس لیے اب میں اپنے الفاظ سے نہیں پھروں گا۔"

"آپ اس کی بیوی کو ٹیلی فون کر کے کم سے کم یہ جتا تو دیں کہ جان محمد کے زندہ ہونے کے باوجود میں اس کی بیٹیوں کو محض اس لیے رہا کر رہا ہوں کہ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"جان محمد' مشہدی کے مقابلے میں زیادہ اصول پسند ہے۔ وہ تمہارا احسان مند تو ہو گا اور ممکن ہے' کبھی ہمارے کام بھی آ جائے۔"

"ٹھیک ہے' میں اسے ٹیلی فون کر کے بتا دیتا ہوں۔" میں نے کہا اور ایک دفعہ پھر نورین کا نمبر ملا لیا اور کہا۔

"مسز ملک.....! مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ ان لوگوں نے جان محمد کی موت کا ڈرامہ رچایا ہے لیکن میں نے چونکہ تم سے وعدہ کر لیا تھا کہ تمہاری بیٹیوں کو رہا کر دوں گا اس لیے میں تمہاری بیٹیوں کو چھوڑ رہا ہوں۔ میں ہمیشہ اپنے الفاظ پر قائم رہنے والا آدمی ہوں' یہ بات تم اپنے شوہر کو بھی بتا دینا۔ میں نے لڑکیوں کو ابھی تک تمہارے شوہر کی فرضی موت کی اطلاع بھی نہیں دی۔" یہ کہہ کر میں نے لائن کاٹ دی پھر میں نے تیمور سے کہا۔ "تم دونوں لڑکیوں کو لے جاؤ لیکن ان کی آنکھوں پر پٹی ضرور باندھ دینا اور انہیں کہیں اور چھوڑنے کی بجائے ان کے گھر کے نزدیک ہی چھوڑنا۔"

تیمور نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے اس فیصلے سے وہ خوش ہے نہ ہاشم اور نادیہ لیکن میں بھی کیا کر سکتا تھا' میں اپنے الفاظ سے نہیں پھر سکتا تھا۔

فوراً ہی تیمور دونوں لڑکیوں کو لے گیا۔ اس نے ہاشم کو بتا دیا تھا کہ میں لڑکیوں کو کئی سڑکوں پر چکر لگانے کے بعد گھر چھوڑوں گا تاکہ انہیں ایسا لگے جیسے ہم نے انہیں کسی دور دراز کے مقام پر قید کر رکھا تھا۔

اس کی واپسی ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ بہت تھکا تھکا اور شکستہ دل نظر آ رہا تھا۔

"خیریت تو ہے تیمور؟" میں نے پوچھا۔

"جی بھیا' خیریت ہے۔ میں نے انہیں گھر سے کچھ فاصلے پر اتار دیا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ان کی آنکھوں سے پٹی بھی کھول دی تھی۔ حرا نے کہا کہ وہ یہاں سے اپنے گھر پہنچ سکتی ہے۔ میں انہیں وہاں چھوڑ کر

تیز رفتاری سے واپس آ گیا لیکن آپ نے انہیں چھوڑ کر غلطی کی ہے بھیا!''

''ہم ان لڑکیوں کو کب تک قید رکھ سکتے تھے؟'' میں نے کہا۔

''جب تک جان محمد' شائستہ کو یا ڈولی کو ہمارے حوالے نہ کر دیتا۔''

''اس کی موت کی خبر سن کر میں لڑکیوں سے وعدہ کر بیٹھا کہ تمہیں ابھی تھوڑی دیر میں گھر بھجوا دوں گا۔''

''ہمارا واسطہ جس قسم کے لوگوں سے ہے بھیا!'' تیمور نے کہا۔ ''ان کے نزدیک وعدہ اور الفاظ پر قائم رہنا سب کتابی باتیں ہیں۔''

''ان کے نزدیک ہوں گی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرے نزدیک نہیں ہیں۔''

''دیکھو عمران.....!'' ہاشم نے کہا۔ ''دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسی قسم کے ہتھیاروں کی ضرورت پڑتی ہے' وہی حربے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ اگر ہم اخلاقیات کے چکر میں پڑے رہے تو وہ لوگ واقعی ہمیں چیونٹی کی طرح مسل دیں گے۔ پہلے میں بھی الفاظ کا دھنی اور وعدہ وفا کرنے والا شخص تھا لیکن حالات کی بھٹی میں تپ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سب کچھ واقعی کتابی باتیں ہیں یا تو آدمی ان سب لوگوں سے بالکل کنارہ کش ہو جائے اور اپنے اصولوں کا پرچار کرتا رہے یا پھر ان کا مقابلہ کرتا ہے تو پھر ڈٹ کر مقابلہ کرے۔''

''تم بھی کچھ بولو۔'' میں نے نادیہ سے کہا۔ ''تم کیوں خاموش ہو؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ اگر میں کچھ کہتی تو کیا آپ میری بات مان لیتے؟''

''اچھا یار' تم لوگ ناراض مت ہو۔ آیندہ میں بھی دشمنوں کا قرض ان ہی کے سکوں میں ادا کروں گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یہ آپ ہم پر بہت بڑا احسان کریں گے بھیا!'' تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یار' اب اس قصے کو ختم کرو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اور اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ انسان کا موڈ خراب ہو تو اسے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں سوجھتی۔''

میری باتوں پر تیمور اور ہاشم بے ساختہ مسکرانے لگے۔ نادیہ یوں ہی منہ بنائے بیٹھی رہی۔

''اب کیا تم سے علیحدہ درخواست کروں کہ میری اس غلطی کو معاف کر دو؟'' میں نے کہا۔

نادیہ بھی مسکرانے لگی اور بولی۔ ''یہ غلطی نہیں ہے عمران صاحب' بلنڈر ہے۔ خیر' اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو تیر' کمان سے نکل چکا ہے لیکن میری ایک بات لکھ لیں' مشہدی اور جان محمد دونوں نے مل کر آپ کو بے وقوف بنا دیا۔''

''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔''

''محبت میں تیرے سر کی قسم' ایسا بھی ہوتا ہے'' تیمور نے گنگنا کر کہا۔

''ارے' تم تو بہت اچھا گاتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''مجھ سے اچھے سنگر تو آپ ہیں۔'' تیمور نے کہا۔ ''بلکہ انعام یافتہ سنگر ہیں' کالج اور یونیورسٹی میں آپ نے گلوکاری کے کئی مقابلے جیتے ہیں۔''

''تیمور! ذرا اس حرام زادے بابر خان کی خبر تو لو' وہ مردود ہوش میں آیا یا ابھی تک بے ہوش ہے؟'' میں نے کہا۔



''وہ ہوش میں آیا بھی ہو گا تو میں اسے ایک انجکشن پھر بھونک دوں گا ورنہ وہ صبح تک ہمارا دماغ کھاتا رہے گا کہ میں مر گیا' مجھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ ڈاکٹر حامد واقعی حیدر آباد میں ہے اور میں کسی دوسرے ڈاکٹر کو یہاں لانے کا رسک نہیں لے سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کر اوپر چلا گیا۔

''ذرا میں بھی ایک نظر اس مردود کو دیکھ لوں۔'' ہاشم نے کہا اور وہ بھی اٹھ گیا۔

''اب تم مجھے ایک کپ کافی ہی پلا دو۔''

''میں نے آپ کے کہنے سے پہلے ہی الیکٹرک کیٹل میں پانی رکھ دیا ہے۔ میں ابھی کافی لے کر آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اشتعال انگیز چال میں وہاں سے چلی گئی۔

ابھی تک کسی لڑکی نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا لیکن یہ نادیہ تو میرے حواس پر چھائی جا رہی تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا۔ 'یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ دل اس کی طرف کیوں کھنچا جا رہا ہے؟' میرے اندر سے آواز آئی۔ 'عمران صاحب' آپ کو اس خوب صورت لڑکی سے محبت ہو گئی ہے لیکن اگر یہ محبت یکطرفہ ہوئی تو کیا کریں گے آپ؟'

''نہیں' نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔'' میں نے کہا۔

''کیسا نہیں ہو سکتا؟'' اچانک نادیہ کی مترنم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں بری طرح اچھل پڑا۔

''ارے' کیا ہوا' کیا سوچ رہے تھے آپ؟''

''نادیہ.....! اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا تو؟''

''میرے بارے میں؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ''میرے بارے میں آپ کیا سوچ رہے تھے؟''

''یہ ہی' تم جیسی حسین اور خوبصورت لڑکی اس دنیا میں کیسے آ گئی؟''

''اس دنیا میں مجھ سے بھی بڑھ کر حسین لڑکیاں موجود ہیں۔ کیا آپ ان سب سے یہ ہی سوال کریں گے؟'' وہ ہنس کر بولی۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت ستارے سے جگمگا رہے تھے۔

''میرا مطلب دنیا سے نہیں بلکہ اس دنیا سے ہے جس میں ہم فی الحال رہ رہے ہیں۔''

''یہ ایک طویل کہانی ہے عمران صاحب.....!'' نادیہ نے افسردگی سے کہا۔ ''کبھی وقت ملا تو آپ کو ضرور سناؤں گی لیکن اتنا بتا دوں کہ ان لوگوں میں رہنے کے باوجود میری عزت ابھی تک محفوظ ہے۔''

''مجھے یقین تھا۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''آپ کو کیسے یقین تھا کہ.....''

''تم عبداللہ کے لیے کام کرتی تھیں نا؟'' میں نے پوچھا۔ ''عبداللہ جرائم پیشہ نہیں تھا بلکہ وہ جرائم کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا' بس اس کا طریقہ کار غلط تھا کہ اس ملک میں انصاف کا حصول مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کم سے کم غریب آدمی تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا پھر مجھے اپنے بھائی ارسلان پر پورا یقین ہے کہ وہ کسی بھی جرائم پیشہ شخص کا ساتھ دے ہی نہیں سکتا تھا۔''

''آپ کا خیال بالکل درست ہے۔'' نادیہ نے کہا۔ ''میں نے بھی حالات سے تنگ آ کر اور پولیس کی ناانصافی دیکھتے ہوئے عبداللہ سے رابطہ کیا تھا پھر میں اس کے کہنے پر اس کے لیے کام کرنے لگی۔ عبداللہ کے کسی ساتھی نے بھی مجھے میلی نظر سے نہیں دیکھا' سوائے بابر خان کے لیکن وہ بھی عبداللہ کے سامنے بھیگی بلی بن گیا تھا

پھر وہ ارسلان سے بھی خوف زدہ رہتا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بولتی رہے اور میں سنتا رہوں۔

اسی وقت تیمور اور ہاشم وہاں آ گئے اور ہاشم بولا۔ ''وہ منحوس ہوش میں آ گیا تھا لیکن تیمور نے اسے ایک انجکشن اور دے دیا اور وہ پھر انٹا غفیل ہو گیا۔ اب وہ صبح سے پہلے نہیں جاگے گا۔''

''عمران.....! ذرا جان محمد کے گھر ٹیلی فون کر کے پتا تو کریں کہ دونوں لڑکیاں گھر پہنچ گئیں یا نہیں اور جان محمد گھر پہنچا بھی ہے یا ابھی تک کہیں روپوش ہے؟''

میں نے ایک دفعہ پھر نورین کا نمبر ملا لیا۔

اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی اور بولی۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔''

''ملک صاحب گھر پہنچے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' نورین نے جواب دیا۔ ''وہ ابھی تک نہیں آئے۔'' میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر میں نے مشہدی کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''ہیلو.....!''

دوسری طرف سے مشہدی نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''تم ابھی بچے ہو عمران.....! میں نے تمہیں بے وقوف بنایا اور تم بن گئے؟''

''یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے لڑکیوں سے وعدہ کر لیا تھا کہ آج انہیں ہر صورت میں گھر چھوڑ دوں گا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔''

''ایک منٹ ذرا ہولڈ کرو۔'' مشہدی نے کہا۔ وہ کسی دوسرے آدمی سے بات کر رہا تھا۔

اسی وقت سیل فون پر مجھے جان محمد کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو.....! میں تمہارا احسان مند ہوں اور اپنا وعدہ بھولا نہیں ہوں۔ تم فکر مت کرو۔'' اچانک وہ لہجہ بدل کر بولا۔ ''تم کیا سمجھتے تھے کہ تم میری بیٹیوں کو ہمیشہ قید رکھو گے؟''

دوسرے ہی لمحے سیل فون پر مشہدی کی آواز سنائی دی۔ ''اب تو تم نے اپنے کانوں سے جان محمد کی آواز سن لی؟''

میں ہکا بکا سیل فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہ گیا پھر مجھے خیال آیا کہ جان محمد واقعی میرا شکر گزار تھا۔ جب مشہدی کسی اور سے بات کر رہا تھا تو اسے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ مشہدی جوں ہی اس کی طرف متوجہ ہوا' اس نے لہجہ بدل لیا۔

اچانک سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ یہ بیل دوسری قسم کی تھی۔ نادیہ نے اپنے ہینڈ بیگ سے سیل فون نکالا اور بولی۔ ''ہیلو.....!''

پھر وہ دوسری طرف کوئی آواز سنتے ہی بری طرح خوف زدہ ہو گئی اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا.....

یہ پر تجسس' سنسنی خیز اور لہو رنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

.....☆☆.....



# آپ بیتی یہ سچ بیتی سنانے والے آپ کے اور ہمارے درمیان ہی موجود ہیں

تسنیم کوثر چیمہ

## سنو تو مین

گل حمید کا خیال

خود سے بھی جو چھپا کے رکھی تھی تمام عمر
وہ داستان سب کو سنانے لگی ہوں میں

**ایک ایسی بیٹی کا نوحہ' جس کی ماں کے قدموں تلے جنت نہیں تھی**

لندن سے مسز شاہ نواز کا خط ملا تو ٹھہری ہوئی جھیل میں گویا کسی نے پتھر پھینک دیا' وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ پتا نہیں' ساری زندگی اتنی دور گزارنے کے بعد ان کو میرا خیال کیسے آ گیا اور مجھ سے اتنے برسوں بعد رابطہ قائم کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ مجھے ان سے ملنے کی کوئی خواہش نہ تھی' اُن کے خط کا مجھ پر کوئی ردِعمل نہ ہوا' میرے اندر کوئی خواہش نہ مچلی' کوئی ارمان نہ جاگا' کوئی جذبہ بیدار نہ ہوا بلکہ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ یہ خط نہ آتا تو اچھا تھا۔ میرے اندر تو ایک گلیشیئر تھا جو پگھلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا' میرے دکھ' میرے غم تو ہمالیہ کی برف کی طرح تھے' اگلی پگھلتی بھی نہ تھی کہ اس پر دوبارہ پڑنی شروع ہو جاتی۔ برف کے اس ڈھیر تلے دب کر میرا پورا وجود جم چکا تھا۔ میں تو برف کا ڈھیر بن چکی تھی' شاید کسی نے برف کا ڈھیر اکٹھا کر کے مجھے سنو مین (SNOW MAN) بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔ مجھ میں زندگی نہ تھی' زندگی کی معمولی سی حرارت بھی نہ تھی' اگر حرارت ملتی تو سنو مین پگھل جاتا اور اس پانی میں میرا وجود بہہ جاتا۔ اُس وقت بھی عالیہ شاہ نواز کا خط میرے ہاتھ میں تھا اور میرے جذبات اور احساسات سب منجمد ہو چکے تھے۔ ''اب میں اُن سے مل کر کیا کروں گی؟'' میرے اندر ان سے ملنے کی نہ کوئی خواہش تھی نہ تڑپ اور نہ مجھے کسی خوشی کا احساس ہوا' مدت ہوئی' میں نے ایک ایک کر کے سب دروازے بند کر دیئے تھے' دل پر قفل لگا دیا تھا جسے میں چاہوں بھی تو نہیں کھول سکتی تھی۔ میرے قدم بوجھل اور بھاری ہو گئے تھے' میں زندگی سے تھک چکی تھی' مزید چلنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی' میں نے تو اپنے اردگرد اتنی دیواریں کھڑی کر دی تھیں کہ کوئی ان کے اندر نہ جھانک سکے۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی جو پیچھے رہ گیا' اس میں میرا کچھ نہیں تھا' کوئی نہیں تھا۔

میں نے چند ہفتے پہلے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی کہ کوئی شاہ نواز صاحب ڈرائیونگ کے دوران حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے تھے۔ خبر پڑھ کر دکھ ہوا تھا حالانکہ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں تھا پھر بھی ایک انسان کے دنیا سے اٹھ جانے پر افسوس ہوا تھا۔ خیر پھر میں غمِ روزگار میں بات بھول گئی مگر اب عالیہ شاہ نواز کا خط ملا تو معلوم ہوا کہ شاہ نواز صاحب وہ تھے جن کی وجہ سے میرے دل کی دنیا اجڑی رہی اور ان کی آباد رہی۔ کاتبِ تقدیر نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر ان کے دامن میں ڈال دیا تھا' وہ خوشیاں' وہ پیار' وہ محبت جن پر میرا پیدائشی حق تھا' مجھے نہ مل سکیں' میری دنیا اجڑ گئی' میرا دل ویران رہا مگر ان کا گھر آباد رہا لیکن میں شاہ نواز صاحب کو سارا الزام نہیں دے رہی مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ کسی کو بے سکون کر کے انسان خود بھی سکون نہیں پا سکتا۔

میں ماضی کی بجھی ہوئی راکھ کو کریدنے بیٹھی تو کچھ دبی دبی چنگاریاں سُلگ کر میرے ذہن کو جھلسنے لگیں۔ میں زندگی بھر انگاروں پر چلی تھی' شعلوں میں جھلستی رہی تھی مگر کسی کو اُس کی تپش بھی محسوس نہ ہونے دی تھی' کسی کو پتا ہی نہ چل سکا تھا کہ میرا یہ سفر کیسے اور کہاں سے شروع ہوا تھا' شاید وہاں سے جہاں میری ماں مجھے اسکول کے گیٹ پر چھوڑ کر چلی گئی تھی' تب مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں پھر دوبارہ کبھی اُس سے نہ مل سکوں گی۔ اسکول سے واپسی پر گھر آ کر پتا چلا تھا کہ میری امی جہاں سے آئی تھیں' وہاں واپس چلی گئی ہیں اور پھر میرے چھوٹے سے ذہن نے اتنی بڑی بات کو خاموشی سے تسلیم کر لیا تھا۔

میری داستانِ حیات اُن بچوں سے مختلف نہیں تھی جن کی مائیں بچپن میں ہی بچھڑ جائیں اور گھر میں دوسری ماں کی حکمرانی ہو۔ گھر بھر میں میرا وجود



بالکل فالتو تھا نہ ہونے کے برابر۔ میں ماں کے پیار کے ساتھ ساتھ باپ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئی کیونکہ باپ بھی انہی بچوں کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہیں جن کی ماں اُن کا گھر بسائے رکھے۔ شروع میں ابو نے مجھ پر توجہ دی مگر رفتہ رفتہ ان کی بڑھتی ہوئی فیملی اور مصروفیات کے باعث ان کے التفات میں کمی آنی شروع ہو گئی اور پھر وہ میرے وجود سے بے خبر ہو گئے' بس پھر زندگی گزرتی رہی نہ کچھ کھونے کا غم نہ کچھ پانے کی خوشی' میں نے اپنے جذبات اور احساسات کو بری طرح کچلا اور میں خود کو اُس مقام تک لے آئی جہاں غم اور خوشی میں کوئی فرق ہی نہ محسوس ہوتا تھا۔ میرے جذبات سرد ہو گئے' ارمان سینے میں دفن ہو گئے' حسرتیں تباہ ہو گئیں' ہر آس نراش بن گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان حالات کے مطابق ڈھلتا چلا جاتا ہے' جب غموں سے فرار ممکن نہ ہو تو ان سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی سمجھوتہ کرنے میں بہتری سمجھی' گھر میں آسائشیں تھیں' سہولتیں تھیں' سب کچھ میسر تھا مگر میرے لیے ان میں کوئی کشش نہ تھی' میری آنکھیں کچھ اور ہی ڈھونڈتی رہتیں' متلاشی رہتیں۔

میں اتنے سارے اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا تھی۔ میرے سامنے تنہائی کا ایک لق دق صحرا تھا۔ میں اس صحرا میں اکیلی ہی بھٹکتی رہی' میرے پاؤں پر ہی نہیں' سارے وجود پر آبلے پڑ گئے تھے' میں پیاسی چلتی رہی' ریت کی لہروں کو پانی سمجھ کر آگے بڑھی تو حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ سراب کے تعاقب میں بھاگتی رہی پھر بھی پیاس نہ بجھ سکی اور میں ان بگولوں میں کہیں گم ہو کر رہ گئی' ریت کے صحرا پر تو کسی کے قدموں کے نشان بھی نہیں تھے جو مجھے کسی منزل کا پتا دیتے' میں کون تھی؟ مجھے کہاں جانا تھا؟ میرا سفر کب اور کیسے ختم ہو گا' یہ شروع کہاں سے ہوا تھا' شاید وہاں سے جہاں میری ماں مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی' میں تھی اور میری تنہائی تھی۔ میں اندھیرے راستوں کی تنہا مسافر تھی۔

جب بچپن میں جھولے سے گر کر میرا سر پھٹا تھا تو کسی نے راتوں کو جاگ جاگ کر میرا سر نہیں دبایا تھا۔ جب میں ٹائیفائیڈ 104 بخار میں پھنکتی رہی تو کسی نے میرے ماتھے پر برف کی پٹیاں نہیں رکھی تھیں۔ جب میرا پاؤں فریکچر ہوا تھا تو کوئی بازو مجھے سہارا دینے آگے نہیں بڑھا تھا اور میں دو تین ماہ بے ساکھیوں کے سہارے چلتی رہی تھی۔ جب میں اسکول میں فرسٹ آئی تھی تو کسی نے میرا رپورٹ کارڈ دیکھ کر مجھے گلے نہیں لگایا تھا۔ میں نے کتنی چاند راتیں اور عیدیں آنسو پی پی کر گزاری تھیں' جب میں ہوسٹل شفٹ ہوئی تھی تو کسی ویک اینڈ پر مجھے کبھی کوئی ملنے نہیں آیا تھا' چھٹیوں میں بھی کبھی کوئی لینے نہیں آیا تھا پھر وہی پرانی سوچیں مجھے بے چین کرنا شروع کر دیتی تھیں۔

میں کون ہوں؟

میں کہاں سے آئی ہوں؟

مجھے کہاں جانا ہے؟

وہ کون سی منزل ہے جہاں پہنچ کر میرا یہ سفر ختم ہو گا؟

میرے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا' انسان سوچنا چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟ ذہن کام کرنا چھوڑ دے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے مگر نہیں' میں تو زندہ تھی' جسم اور جان کا رشتہ قائم تھا مگر اُسے زندگی تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں بظاہر زندہ تھی مگر شاید اندر سے مر چکی تھی۔ زندگی کی لاش کو سینے سے لگائے میں اُس کو دفنانے کی جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ میں اپنی صلیب خود اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھی' اپنا بوجھ خود اٹھاتے اٹھاتے تھک کر دم لینے کو پل بھر رکتی تو کسی کی آواز میرا تعاقب کرتی' یہاں نہ رکو' آگے بڑھو' تمہاری منزل قریب ہے اور میں پھر چلنا شروع کر دیتی تھی۔

برسوں کے اس سفر میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ایک بار میں نے کسی لمحے کمزور پڑ کر سوچا تھا کہ ابو سے بات کروں کہ وہ مجھے میری ماں کے بارے میں کچھ بتائیں' میری بات سن کر انہوں نے کچھ کہنا سننا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے ایڈریس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اب میں رات رات بھر جاگ کر خط لکھنے بیٹھتی تو سوچیں بھٹکنے لگتیں' سمجھ میں نہیں آتا تھا' کیا لکھوں اور کیسے لکھوں؟ پھر دل پر جبر کر کے انہیں چند لائنیں لکھ ڈالیں اور صرف ایک بار' بس صرف ایک بار ان سے ملنے کی تمنا کر بیٹھی۔ خط پوسٹ کر دیا اور جواب کا انتظار شروع کر دیا مگر جواب نہ آیا۔ ہر صبح اس امید پر اٹھتی کہ آج خط کا جواب ضرور آئے گا مگر شام ہونے کے ساتھ ساتھ مایوسی بڑھتی جاتی پھر تھک کر میں مایوس ہو گئی' جواب کا انتظار چھوڑ دیا اور اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ گئی پھر اچانک ایک دن ایک خط ملا۔ اجنبی سی تحریر تھی' جلدی سے کھولا تو میری نانی اماں کا دعوت نامہ تھا۔

''سائرہ! گرمیوں کی چھٹیوں میں میرے پاس آ جاؤ۔ تمہیں ملنے کو دل چاہتا ہے۔'' میں نے سوچا کہ امی نے خط لکھوایا ہو گا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتے ہی میں ننھیال چلی گئی اس امید پر کہ امی وہاں ہوں گی' ان سے مل کر کچھ غم غلط ہو جائے گا' کچھ وقت اچھا گزر جائے گا مگر ننھیال میں صرف نانی اماں سے ہی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا' بہت محبت سے رکھا مگر وہ میری امی کا کوئی ذکر نہیں کرتی تھیں۔ میں نے دبی دبی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے صاف لفظوں میں معذرت کر دی۔

''دیکھو سائرہ! تم میرے پاس رہو' میرے ساتھ وقت گزارو اور عالیہ سے نہ ہی ملو تو بہتر ہو گا کیونکہ تمہیں دیکھ کر وہ بہت ڈسٹرب ہو جائے گی' بڑی مشکل سے دوبارہ شادی کر کے اس نے خود کو ایڈجسٹ کیا ہے' میں نہیں چاہتی کہ تمہیں دیکھ کر اس کو وہ سب کچھ یاد آ جائے جس کو بھلانے کے لیے ہم سب نے اتنے جتن کیے ہیں پھر تمہارا وہاں جانا اس کے شوہر کو ناگوار گزرے گا۔''

نانی اماں کی خود غرضی پر میرا دل دکھ سے پھٹ گیا' میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا' میں تو اَن بریک ایبل گلاس تھی' معمولی ضربوں سے تو میں ٹوٹنے والی نہ تھی مگر اس ضرب سے میں اس طرح ٹوٹی کہ میری کرچیاں ہی دور دور بکھر گئیں' اتنی کرچیاں جن کو سمیٹتے سمیٹتے میری زندگی ختم ہو جائے گی پھر بھی میں انہیں سمیٹ نہ پاؤں گی۔ انسان کتنا بے آواز ہو کر ٹوٹ جاتا ہے' پاس رہنے والوں کو بھی خبر نہیں ہوتی۔

''اگر آپ کو میرا وہاں جانا مناسب نہیں لگتا تو آپ ان سے کہیں' وہ آ کر مجھے مل لیں!''

''وہ ضرور ملنے آتی مگر وہ اپنے شوہر کے ساتھ بیرونِ ملک چلی گئی ہے۔'' نانی اماں پھر دامن بچا گئیں اور میں کنویں کے پاس سے پیاسی ہی لوٹ آئی۔ میں زخموں سے چور امی سے ملے بغیر واپس آ گئی۔ جب میں جا رہی تھی تو کتنی پرامید تھی' واپس لوٹی تو اتنی مایوس اور ناکام.....

یہ مینار میں نے کتنے برسوں میں کھڑے کیے تھے جو دھڑام سے میرے اپنے اوپر گر گئے اور میں اپنے ہی ملبے تلے دبی سوچ رہی تھی کہ میں خود کو کیا کہہ کر تسلی دوں.....! کیا تسلی دیتی' خود کو کیسے بہلاتی' میں نے سوچا' کیوں نا زندگی کی ڈائری سے یہ صفحہ ہی پھاڑ دوں' روشنی کا یہ سوراخ بھی بند کر دوں' تھوڑی دیر اندھیرا لگے گا پھر آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جائیں گی مگر ایسا کرنا بہت مشکل لگا نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ان کا انتظار کیا کہ شاید کبھی ان کے دل میں میری محبت جاگ اٹھے' میری یاد ان کو بے چین کر دے تو وہ ملنے چلی آئیں مگر یہ میری خوش



فہمی تھی یا شاید غلط فہمی!

ننھیال سے واپسی کا سفر بہت مشکل تھا مگر سفر ہی تھا' گزر گیا اور میں تھک کر بے دم ہو کر گر پڑی جیسے میلوں کی مسافت پیدل طے کر کے آئی ہوں۔ چلتے وقت نانی اماں نے تاکید کی تھی کہ میں اُن سے رابطہ رکھوں۔ میں نے دل میں سوچا۔ 'جس سے میرا رشتہ تھا' جب وہی نہیں رہی تو باقی سب سے رسمی تعلقات رکھنے کا کیا فائدہ!..... وقت کی مجبوریوں میں انسان سب کچھ سہہ جاتا ہے' وقت بہت کچھ گوارا کر لیتا ہے۔ اگر وہ مجبور تھیں تو میری مجبوریوں کا تو اُن کو اندازہ ہی نہیں تھا۔ ان حالات کا کون ذمہ دار تھا؟ کس کو دوش دیتی؟ آخر میں نے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا اور میں نے صبر کر لیا' صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اور تو میرے پاس کوئی راہ نہیں تھی۔ کچھ عرصہ تک تو نانی اماں خیریت کی چند لائنیں لکھتی رہیں' کبھی کبھار عید یا سالگرہ پر کارڈ بھیج کر اپنا فرض ادا کر دیتیں..... میں نانی اماں سے محبت نہیں کر سکی تھی۔ اگر مجھے زندگی میں محبتیں ملی ہوتیں تو اس ذخیرے سے میں کچھ دوسروں کو بھی بانٹ دیتی مگر میرا دامن تو بالکل خالی تھا' کسی کو کچھ دینے کے قابل کہاں تھی!..... سو اِن خاردار راستوں پر چلتے چلتے میں نے نہ تو کوئی شکایت کی نہ گلہ ہی کیا اور نہ احتجاج ہی کیا' بس جو مجھے ملا' وہ میرا نصیب تھا' میرا مقدر تھا' مقدر کی سیاہی دھل ہی نہ سکی۔

اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک کا سفر بھی میں نے اکیلے ہی طے کیا۔ اتنے سالوں کا اتنا طویل سفر اور میں تنِ تنہا جہاں ایک ایک پل صدیوں پہ محیط تھا' جہاں ایک ایک لمحہ میں نے گن گن کر گزارا تھا' کسی کو خبر نہ ہوئی نہ کوئی جان سکا۔ میری قابلیت' میری ذہانت کے چرچے سبھی جگہ رہے' میں اپنی اسکول ٹیچرز سے لے کر یونیورسٹی کے پروفیسرز تک سب کی منظورِ نظر رہی۔ میری فائل میں اسناد اور سرٹیفکیٹس کے ڈھیر لگتے چلے گئے۔ تعلیمی منازل طے ہوتی چلی گئیں۔ ایم اے میں ٹاپ کیا تھا مگر میں خوشیاں کس کے ساتھ بانٹتی' کوئی شیئر کرنے والا نہیں تھا' جنم دینے والی ماں ہی جنم دے کر بھول گئی تھی تو باقی کون بچا تھا جو یاد رکھتا۔

ماں تو کسی بھی ملک کی ہو' کسی بھی نسل کی ہو' وہ صرف ایک ماں ہوتی ہے اور اپنی اولاد ہی اس کا سرمایۂ حیات ہوتا ہے مگر میری زندگی میں ماں کا کہیں وجود نہیں تھا۔ پتا نہیں' کیا مجبوریاں تھیں' کون سے حالات کے پیشِ نظر وہ اپنی اکلوتی اولاد سے دستبردار ہونے کو بھی تیار ہو گئی تھی۔ میرے ان سوالوں کے جواب تو صرف وہ خود ہی دے سکتی تھی' میری زندگی کی ڈائری میں ماں کے نام کا صفحہ تو تھا مگر بالکل کورا اور خالی تھا۔ میں جو لکھنے پہ آتی تو سینکڑوں صفحے سیاہ کر دیتی۔ اس ایک کورے کاغذ پر کچھ نہ لکھ سکی' میرے دل کا ایک کونہ خالی ہی رہا جس کو بھرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ پھر بھی خالی ہی رہا' میں کسی طور اس کو نہ بھر سکی۔ ایم اے میں ٹاپ کیا تو مجھے یونیورسٹی میں لیکچرر شپ مل گئی۔ نوکری کرنا نہ میرا شوق تھا اور نہ میری مجبوری' میں خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی' انسان بس خاموشی سے چپ چاپ کام کیے چلا جائے اور جیے جائے' ذہن مصروف ہو گا تو بے کار کی سوچوں سے جان چھوٹ جائے گی' یہی سوچ کر میں نے نوکری کر لی۔

نوکری کے بعد دوسری آفر شادی کی تھی جو ابو کے بھتیجے کی طرف سے تھی جس طرح نوکری میں نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے کر لی' بالکل اُسی طرح شادی ایک ضرورت سمجھ کر۔ اعجاز بہت اچھا انسان ہے' اس نے شادی کے شروع دن سے لے کر آج تک مجھ سے میری ماں کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا نہ اس نے کبھی تجسس سے کبھی سوال ہی کیا۔

اس نے اپنی توجہ اپنے پیار اور اپنی محبت سے مجھے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کیا۔ میں سر جھکائے کام کرتی رہتی تھی۔ ایک روز کہنے لگا۔

''سائرہ! ایک بات کہوں!''

میرا دل بیٹھنے لگا پھر ذرا ہمت کر کے کہا۔ ''ضرور۔''

''سائرہ! سر مجرموں کے جھکے ہوئے ہوتے ہیں' تم بہت اعلیٰ صفات کی مالک ہو' قابل ہو' ذہین ہو' اس اتنی انٹلیکچوئل ہو' میں چاہتا ہوں' تم سر اٹھا کر چلا کرو۔'' اور پھر اعجاز نے مجھے سر اٹھا کر اپنے ساتھ قدم ملا کر جینا سکھایا' وہ میرے ماضی کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا مگر مجھ سے اس نے کبھی کچھ نہ پوچھا بلکہ کبھی کبھی میرا اپنا دل چاہتا تھا کہ وہ اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات کرے مگر وہ کبھی نہیں کرتا تھا' وہ ہر حال میں خوش رہتا۔

انسان اگر اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن ہو تو اُسے دنیا کتنی خوبصورت لگتی ہے اور جب اپنا دل زخموں سے چُور چُور ہو' روح کے ہر تار سے خون رستا ہو تو ساری دنیا دکھوں کا گھر لگتی ہے' غم اور خوشی' یہ تو ہمارے اندرونی احساسات ہیں مگر دلوں کے اندر کون جھانکتا ہے' روح کے بارکس کو نظر آتے ہیں' باہر کھڑے ہو کر کیا اندازہ ہوتا ہے کہ پسِ دیوار کون رو رہا ہے؟ کس کی روح کتنی زخمی ہے' کس کے دل پر غموں اور دکھوں کا کتنا بوجھ ہے؟ کنارے پر کھڑے ہو کر طوفانوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا!

میرے اندر بھی کتنے طوفان اٹھتے تھے مگر میں سکون کی چادر اوڑھ کر کام کرتی رہتی۔ اپنا گھر میں بڑی نفاست' بڑے سلیقے اور بڑے شوق سے سنوار کر رکھتی' زندگی میں ترتیب پسندی کی بہت عادت تھی اس لیے ہر وقت' ہر چیز اپنی جگہ پر رکھ دیتی' بہت آرگنائز ڈ طریقے سے جینے کی عادت پڑ چکی تھی' گھر کی نفاست' سلیقہ اور ترتیب پسندی سے متاثر تو ہر کوئی ہوتا تھا مگر اعجاز اکثر میرا مذاق اڑاتا۔

''سائرہ! سلجھے ہوئے لوگ بڑے الجھے ہوئے ہوتے ہیں' تم بظاہر جتنی سلجھی ہوئی ہو' اندر سے تم اتنی ہی الجھی ہوئی ہو۔ تمہارے اندر بے شمار الجھنیں ہیں' بڑے الجھاؤ ہیں۔''

''بس اعجاز! میرا گھر بکھرا ہوا ہو تو میرا ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔''

اعجاز سے شادی کے بعد اگلا مرحلہ بچوں کا تھا جب میں تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھی تو وہ دن رات اللہ تعالیٰ سے بیٹی کی دُعا کرتا اور میں بیٹے کی۔ مجھے بیٹی کی خواہش نہ تھی۔ پتا نہیں' کیسا نصیب لے کر آئے گی اور حالات کی چکی میں میری طرح کتنا پسے گی!..... بیٹا ہو گا تو ہر طرح کے حالات سے ٹکرا کر طوفانوں کا رخ موڑ کر بھی اپنی بھرپور زندگی جی لے گا۔ میں دن رات بیٹے کے لیے دُعائیں کرتی۔ آخر خدا نے مجھے بیٹا ہی دے دیا۔ اعجاز مجھے خوش دیکھ کر ہی خوش ہو گیا مگر بیٹی کی خواہش اس کو بدستور رہی پھر دو سال بعد خدا نے مجھے دوسرا بھی بیٹا دے دیا تو میرے دونوں بیٹے خالد اور طارق میری آنکھیں بن گئے جن سے میں دنیا دیکھتی تھی۔ نہ مجھے اُن سے آگے کچھ نظر آتا نہ اُن کے پیچھے' بس وہی میری آنکھوں کی روشنی' میری آنکھوں کا نور بن گئے اور میں اپنے بچوں میں مگن ہو گئی۔ دونوں بچے میری زندگی میں خوشیاں بکھیرتے گئے اور میں اپنا آپ بھی بھلا بیٹھی' چھٹی والے دن میں بچوں کے ساتھ کھیلتی' اُن کی معصوم شرارتوں سے لطف اندوز ہوتی۔

اُس روز بھی چھٹی تھی' طارق کو اعجاز اپنے ساتھ مسجد لے گئے اور خالد میرے ساتھ کھیل رہا تھا' آنکھ مچولی کھیلنے میں اس کی باری چھپنے کی تھی اور میری ڈھونڈنے کی۔ میں نے کہا۔ ''تم چھپ جاؤ' میں تمہیں ڈھونڈتی ہوں۔'' وہ صوفے کے پیچھے پردوں



کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے پردے کے نیچے سے اس کے گلابی پاؤں نظر آ رہے تھے۔

''امی.....! مجھے ڈھونڈ لو۔'' اُس نے زور سے آواز لگائی تھی۔

میں نے اُس کو خوش کرنے کے لیے جان بوجھ کر اِدھر اُدھر جھوٹ موٹ کی ایکٹنگ کی' بچہ ہی تو تھا' صبر نہ کر سکا اور شور مچاتا پردے کی اوٹ اور صوفے کے پیچھے سے باہر نکل کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ''امی! آپ ہار گئیں' آپ مجھے نہیں ڈھونڈ سکیں۔''

میں نے اُس کو گود میں اٹھا کر بہت پیار کیا' اس کی ہنسی میرے کانوں میں رَس گھولنے لگی' میں نے اُس کو صوفے پر بٹھانے کی کوشش کی مگر اس نے اپنے ننھے بازو میری گردن کے گرد لپیٹ لیے۔

''امی.....! آپ نے مجھے ڈھونڈنے میں اتنی دیر لگا دی پھر بھی مجھے نہیں ڈھونڈ سکیں؟'' اُس کے اِس ایک جملے میں جانے کیا تھا جس نے مجھے پینتیس سال پیچھے پہنچا دیا۔ میں بھی ایک چھوٹی سی بچی تھی اور چھپی ہوئی تھی کہ میری ماں مجھے ڈھونڈ لے گی مگر میری ماں نے تو مجھے ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہ کی اور میں حالات' واقعات اور حادثات سے بچنے کے لیے جہاں چھپی ہوئی تھی' وہیں چھپی بیٹھی رہی' کوئی بھی مجھے نہ ڈھونڈ سکا' میں تو خود بھی اپنا سراغ نہ پا سکی۔ دنیا کے ہنگاموں میں میری ماں مجھے تلاش نہ کر سکی اور کہیں گم ہو گئی۔ میں اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔ بچپن میں ایک بار میرے ہاتھ سے گیس سے بھرا ہوا غبارہ چھوٹ کر اوپر کہیں بادلوں میں گم ہو گیا تھا اور میں اس کو نہ پا سکی تھی۔ اسی طرح ماں کا ساتھ بھی مجھ سے چھوٹ گیا اور ہاتھ بھی چھوٹ گیا تھا اور میں اُن کو ڈھونڈتی رہی مگر وہ مجھے کبھی نہ ملی۔ میں اُس کو خالد کی طرح آوازیں دیتی رہی۔ ''امی.....! مجھے ڈھونڈ لو' امی.....! مجھے ڈھونڈ لو۔'' مگر ماں نے کوشش ہی نہ کی اور اتنی دور جا بسی جہاں میری کوئی آواز' میری کوئی پکار اُس تک نہ پہنچ سکی اور در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ میں گھر کے کونوں کھدروں میں چھپ کر بیٹھی رہتی کہ شاید وہ مجھے ڈھونڈ نکالے اور سینے سے لگا لے مگر ایسا نہ ہو سکا اور پھر میں خود ہی گم ہو گئی۔ اپنی ذات کے خول میں بند ہو گئی نہ کوئی مجھے ڈھونڈ سکا نہ کوئی مجھے سمجھ سکا نہ کسی نے مجھے تنہائی کے اس جہنم سے باہر نکالا مگر اب اتنے برسوں بعد خدا نے میری دُعا سن لی تھی۔ بچوں نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا۔ اعجاز مجھے بہت اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ میری روح کے گھاؤ بھرنے لگے تھے' دل کے زخم مندمل ہونے لگے تھے۔ بچے میری محرومیوں کی تلافی کرنے لگے تھے۔ میرے زخم جن سے ہر وقت ٹیسیں اٹھتی تھیں' وہ بھرنے لگے تھے۔

اور اب اچانک زندگی کے اس موڑ پر عالیہ شاہ نواز نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا' وہ ملنا چاہتی تھیں' میں نے سوچا کہ میری زندگی کے ابتدائی چند سال مجھ پر اُن کا قرض تھے اور مجھے اُن کا یہ قرض چکانا تھا اور اِس سے اچھا موقع پھر دوبارہ نہیں ملنا تھا۔ اعجاز آفس سے گھر لوٹا تو میں نے مسز شاہ نواز کا خط اُس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''سائرہ! تم لندن جا کر اُن سے ضرور ملو۔''

''اور بچوں کا کیا ہو گا؟''

''سائرہ! گھبراؤ نہیں' بچوں کو میں اپنی امی سے ملوانے پنڈی لے جاؤں گا۔ دادی سے مل کر خوش ہو جائیں گے اور سعدیہ اُن کو مصروف رکھے گی' بچے بہل جائیں گے۔'' اور پھر اگلے روز اعجاز نے آفس سے واپسی پر لندن کا ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا' واپسی اوپن تھی۔

میں نے اپنے ہینڈ بیگ میں کپڑوں کے دو جوڑے اور چپل ڈالی تھی تو پیکنگ میں مدد کرنے کے لیے اعجاز میرے پاس چلا آیا تھا۔

''تم ایسے لندن جاؤ گی تو وہ کیا سوچیں گی؟ تم بکس روم سے بڑا سا سوٹ کیس نکالو اور اپنے سب سے بہترین کپڑے سلیکٹ کر کے پیک کرو' وہاں خوب گھومنا پھرنا' ڈھیر ساری شاپنگ کرنا اور ہر جگہ اپنی تصویریں اتروا کر لانا۔'' اُس نے میرے ہاتھ میں اپنا قیمتی کیمرہ تھما دیا تھا اور ساتھ ہی تین ہزار اسٹرلنگ پاؤنڈز کے ٹریولرز چیک بھی تھے۔ اعجاز کی معاملہ فہمی' اعلیٰ ظرفی اور فراخ دلی کی تو میں روزِ اول سے قائل ہی نہیں بلکہ گھائل بھی تھی۔

رات دو بجے میں ایئرپورٹ پہنچی اور صبح چار بجے لندن روانہ ہوگئی۔ آٹھ گھنٹے کی فلائٹ کے بعد میں ہیتھرو ایئرپورٹ اتری اور ٹیکسی لے کر شاہ نواز صاحب کے ایڈریس پر پہنچ گئی۔ ٹیکسی سے اتر کر دروازے پر بیل دی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔

دروازہ کھلا تو عالیہ شاہ نواز چاکلیٹ ساڑھی میں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ اتنے سالوں میں بھی وہ بالکل نہ بدلی تھیں۔ زندگی کے ماہ و سال اُن پر اثر انداز نہیں ہوئے تھے' روشن اور چمکتا ہوا چہرہ' ماتھے پر خم کھائے ہوئے بالوں کا تاج' اُجلی رنگت اور ہرنی جیسی آنکھیں مگر انہوں نے شاید مجھے نہیں پہچانا تھا۔

''مسز شاہ نواز! میں سائرہ ہوں اور لاہور سے ملنے آئی ہوں۔ آپ کا خط ملا تھا' اچانک ہی پروگرام بنا اور فلائٹ بھی مل گئی' جلدی میں آنے کی اطلاع نہ دے سکی۔''

''سائرہ.....!'' انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا تھا مگر اُن کے سینے سے لگ کر مجھے پیار محبت کی کوئی گرمی نہ محسوس ہوئی تھی۔ میں سنو مین بنی رہی تھی' میرے اندر گلیشیئر فریز ہی رہا تھا' ذہن منجمد اور سوچیں مفقود' میرے اندر کوئی ہلچل نہ مچی تھی۔

انہوں نے مجھے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم بیٹھو' میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''آپ تکلیف نہ کریں' ابھی کچھ دیر پہلے جہاز سے اترتے ہوئے میں نے کھانا بھی کھا لیا تھا اور چائے بھی پی کر آ رہی ہوں۔''

''چلو پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

میں اُن کے پیچھے پیچھے اُن کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھی اور ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ اِس ایک لمحے کا میں نے پینتیس سال انتظار کیا تھا اور آخر وہ گھڑی آ پہنچی تھی جب وہ مجھے کچھ بتاتیں' اپنی صفائی پیش کرتیں مگر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی تھیں پھر بڑی مشکل سے سکوت ٹوٹا تھا۔

''شاہ نواز صاحب کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا' ابھی میں عدت کے دن پورے کر رہی ہوں۔''

گفتگو کا سلسلہ شروع بھی ہوا تھا تو کہاں سے! نہ مجھ سے شروع کیا نہ اپنے آپ سے ذکر بھی کیا تھا تو اپنے شوہر کا!..... پھر ہمالیہ کی برف مجھ پر گرنی شروع ہوگئی تھی۔ میرے اندر کا گلیشیئر اور سخت ہونے لگا تھا۔ شوہر کا ساتھ تھا تو میری ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی' اب شوہر کا ساتھ چھوٹا اور تنہائی ڈسنے لگی تو انہیں میرا خیال آ گیا کہ اس بڑھاپے میں اُن کے پاس' اُن کے ساتھ رہ کر میں اُن کو کمپنی دوں' انہیں بہلائے رکھوں تاکہ اِن کو اکیلے پن کا احساس نہ ہو' شوہر کی جدائی کا غم غلط ہو سکے' میری تنہائی کا انہیں تب کیوں احساس نہ ہوا جب وہ مجھے جہنم میں دھکیل کر خود اپنی جنت بسانے چلی گئی تھیں؟ یہاں بھی اُن کی خودغرضی تھی' اپنی ذات عزیز تھی' اپنے لیے سہارا چاہیے تھا۔ انہوں نے مجھے میرے دکھوں' غموں اور محرومیوں کی تلافی کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی ضرورت کے تحت بلایا تھا۔ اِس موڑ پر بھی اُن کو اپنی اولاد سے زیادہ اپنا ہی خیال تھا' اپنا مستقبل عزیز تھا' اتنے برسوں بعد اب وہ بڑھاپے میں اپنی تنہائی اور اکیلے پن سے خوف زدہ تھیں اور میرے سہارے کی آرزو کر رہی تھیں۔ اُن کو میرا سہارا چاہیے تھا' اب بھی وہ میری بجائے صرف



اپنے بارے میں سوچ رہی تھیں' اُن کا خیال تھا کہ میں اُن کے لیے اُن کی دعوت پر اپنا ہنستا بستا گھر' اپنی جنت چھوڑ کر چلی آؤں گی!!

نہیں' میں اُن کی خاطر یہ قربانی نہیں دے سکتی تھی' میرا گھر' میرا شوہر' میرے بچے یہ سب کچھ مجھے اتنے برسوں بعد ملا تھا۔ میں نے اُس منزل تک پہنچنے کے لیے زندگی بھر بہت دکھ سہے تھے۔ میں نے ساری زندگی خود کو بے نفس کر کے دوسروں کی مرضی سے زندگی گزاری تھی مگر اب وقت میرے ہاتھ میں تھا' میں اپنی زندگی' اپنی آزادی اور اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی تھی۔ میں اُس عورت کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی جس کے قدموں تلے میری جنت تھی' میں اپنے شوہر کے تحفظ اور پیار کی چھت تلے اِن بچوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی جن کی جنت میرے قدموں تلے تھی۔

میں اپنے بچوں کے لیے' صرف اور صرف اپنے بچوں کی خاطر جینا چاہتی تھی' مجھے صرف اور صرف اپنے خدا کا سہارا چاہیے تھا۔ مجھے اعجاز کی محبت چاہیے تھی' اعجاز جس نے اپنا سب کچھ وار کے میرا دامن اولاد اور خوشیوں سے بھرا تھا' میرے دونوں بچے میری زندگی کا حاصل تھے۔ میری زیست کا سرمایہ تھے' میری کل کائنات تھے' میری آنکھوں کی روشنی تھے' میرے دل کے ٹکڑے تھے!!

اور پھر اُن اگلے چند لمحوں میں' میں نے فیصلہ کر لیا تھا پھر میں نے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی۔ دو گھنٹے مکمل خاموشی میں گزر گئے تھے' خاموشی کی ایک اپنی زبان ہوتی ہے' انسان خاموش رہ کر وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے جو لفظوں کا سہارا لے کر' بول کر نہیں کہا جا سکتا' الفاظ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی' خاموشی اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے' میری خاموشی نے انہیں سب کچھ کہہ دیا تھا' سب کچھ بتا دیا تھا کیونکہ تبھی میں نے اُن کی آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا اور پیشتر اس کے کہ اُن کے آنسو مجھے کمزور کرتے' میرے فیصلے کو متزلزل کرتے' میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''مسز شاہ نواز! مجھے اپنی ایک بیمار دوست سے ملنا ہے' میں آپ سے اجازت چاہوں گی۔''

''دوبارہ آ کر کچھ دن تو میرے پاس ٹھہرو گی نا؟''

''وعدہ نہیں کرتی' کوشش کروں گی۔'' سنو مین مضبوطی سے جما رہا تھا' اونچے پہاڑوں پر برف باری تیز ہوگئی تھی۔

میں نے باہر نکل کر ٹیکسی روکی تھی اور ڈرائیور سے کہا تھا۔ مجھے ہیتھرو ایئرپورٹ اتار دے۔ عالیہ شاہ نواز نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے پچھلے سارے دروازے بند کر دیئے تھے۔ اٹھارہ گھنٹے ایئرپورٹ پر گزارنے کے بعد مجھے لاہور واپسی کی فلائٹ مل گئی تھی۔ جہاز کا دروازہ بند ہوا تھا تو میرے اندر برف باری تھم گئی تھی۔ میں نے ایک ایک کر کے اپنی زندگی کے سب پچھلے دروازے لاک کر دیئے تھے تاکہ پچھلی کوئی سوچ' کوئی پرانا خیال' کوئی پرانا رشتہ اندر داخل ہو کر مجھے پریشان نہ کر سکے' مجھے بے سکون نہ کر سکے۔ میں نے جہاز کی کھڑکی سے نیچے دیکھا تھا' لندن ملگجے اندھیرے اور کُہر میں لپٹا ہوا تھا مگر میرے سارے اندھیرے چھٹ چکے تھے' میں اندھیروں کی مسافر اندھیروں کی گود سے نکل کر روشنیوں کے اُس شہر جا رہی تھی جو میری جنت تھا۔ میں نے کھڑکی سے سر لگا کر سکون سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مجھے کسی کا انتظار نہ تھا' کسی کی تلاش نہ تھی' مجھے جو کچھ چاہیے تھا' وہ میرے سامنے تھا' میرا گھر' میرا شوہر' میرے بچے!!

یہی میری زندگی تھی' یہی میری منزل تھی اور ہے رہے گی!!

.....☆☆.....

تمثیلہ زاہد

# دو بوند پیاس

بہزاد لکھنوی کا خیال

اب کیوں ڈھونڈوں میں چشمِ کرم ہونے دے ستم بالائے ستم
میں چاہتا ہوں اے جذبۂ غم مشکل پسِ مشکل آجائے

**زندگی کی ریس میں سرپٹ دوڑتے ایک غریب دولت مند کا عبرت اثر ماجرا**

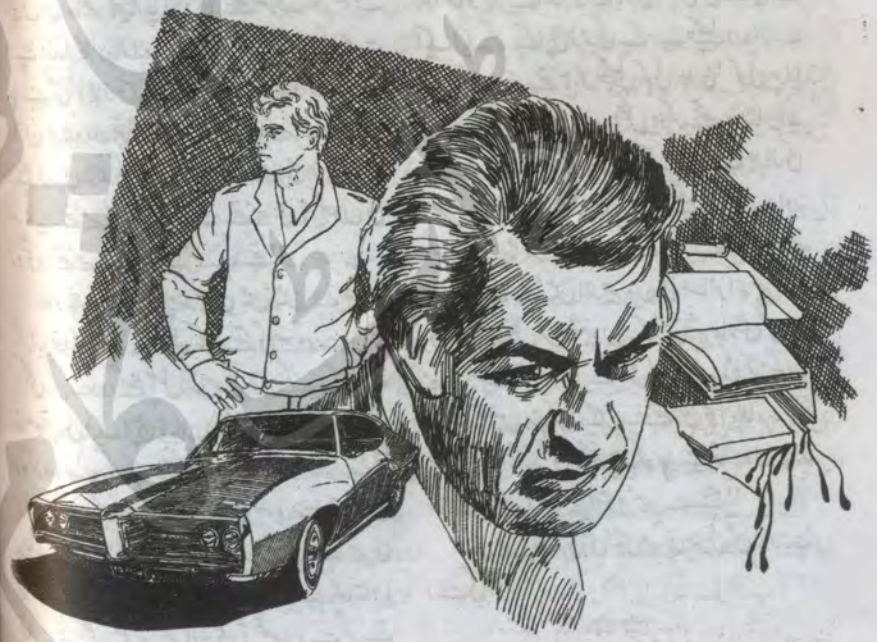





کبھی آپ نے سوکھی زمین دیکھی ہے؟ ایسی زمین جس کی مٹی کا ذرہ ذرہ پانی کی بوند کو ترسا ہوا ہو، اس کا سوکھا وجود چیخ گیا ہو، وہ مرکزِ نگاہ تو ہو لیکن منظورِ نظر نہ ہو کیونکہ اُس کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں اور ہماری دنیا کے لوگ اسی سے واسطہ رکھتے ہیں جو کچھ دینے کے قابل ہو۔

زمین زرخیز ہو، اچھی پیداوار دینے کے لائق ہو تو کسان بھی خوش ہو کر بیج بوتا ہے، زمین کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے لیکن بنجر زمین اس کے کسی کام کی نہیں ہوتی۔

میرا وجود بھی اس وقت ایک بنجر زمین جیسا ہے جس کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔ میں مرکزِ نگاہ تو ہوں، منظورِ نظر نہیں۔

میں اسی معاشرے کا ایک کردار ہوں، ایک ایسا کردار جو عبرت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے لائق ہے۔ آج میں جو کچھ ہوں، اس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ میرا جرم اتنا سنگین ہے کہ موت بھی مجھ سے کوسوں دور ہے۔

بلندی کو چھونا اور خواہشوں کے حصول کی جدوجہد انسانی فطرت ہے لیکن انسان کی یہی صفت جب اعتدال کی دیوار پھلانگنے لگتی ہے تو زندگی کو منفی رخ پر لا کھڑا کرتی ہے۔ میں بھی خواہشوں کا غلام بن کر دوڑتا رہا، دوڑتا رہا اور اتنا آگے نکل آیا کہ واپسی ممکن نہ رہی۔

.........

''امی......! میری بائیک تھرڈ کلاس ہوگئی ہے، پلیز! نئی بائیک دلا دیں۔ کتنی بار اس کی مرمت کروا چکا ہوں، میرے کلاس فیلوز کے پاس زیرو میٹر کاریں ہیں اور میرے پاس ایک ڈھنگ کی بائیک بھی نہیں۔'' میں بائیک کے ٹائر پر ٹھوکر مارتے ہوئے بولا جو اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔

''بیٹا! ہم تمہیں حلال رزق کھلا رہے ہیں اور اس حلال کی کمائی سے دو وقت کی روٹی ہی کھائی جا سکتی ہے۔ ہم میں اتنی سکت نہیں کہ تمہاری فرمائشیں بھی پوری ہوں۔ جب تم کمانے لگو تو جو مرضی، کرنا۔ یہ بائیک تمہارے باپ نے بھلے وقتوں میں بی سی ڈال کر اپنی سہولت کے لیے لی تھی۔'' امی نے ناگواریت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہی نہیں کہ میں آپ کا اکلوتا بیٹا ہوں، آپ کا واحد مرکزِ نگاہ لیکن آپ ہمیشہ مجھے نظرانداز کرتی ہیں۔ مجھے آپ میں وہ محبت ہی محسوس نہیں ہوتی جو ایک ماں میں بیٹے کے لیے ہوتی ہے۔'' میرے لہجے کے نشتر سے اماں کی آنکھیں بھر گئیں۔ ایسے موقع پر وہ خاموش ہو جاتی تھیں۔

''نہیں بیٹا! ایسا نہیں۔''

''نہیں، ایسا ہی ہے۔'' میں غصے سے باہر نکل گیا۔

.........

''اب یار! ایسا بھی کیا غصہ، ختم کرو۔'' یاسر میری بات سن کر ہنستے ہوئے بولا اور کولڈ ڈرنک سے گلاس بھرنے لگا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو، ہم CA کے اسٹوڈنٹس ہیں، تمہیں معلوم ہے، ہماری اکیڈمی میں شہر کے امیر بچے آتے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک گاڑیوں کے مالک، پہناوے ایسے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ان سب کے سامنے جب میری پھٹ پھٹی خراب ہو کر چلنے کا نام نہیں لیتی تو اُس وقت سب مجھے بڑی حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا یہ سب۔ اب اگر میں نے نئی بائیک کی فرمائش کر دی تو کون سا گناہ کر دیا؟''

''دیکھو واثق! تم سے میرا بس یہی اختلاف ہے،''

ہم Module C کے اسٹوڈنٹس ہیں۔ کچھ ہی وقت باقی ہے پھر ہم فیلڈ میں ہوں گے' ایسی کاریں دو ماہ کی سیلری سے ہی ہمیں حاصل ہو جائیں گی۔ تم کلاس کے ہونہار طالب علم ہو' سیلف میڈ ہو' تمام اساتذہ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ اس قدر احساسِ کمتری کا شکار کیوں ہو جاتے ہو؟ تھوڑا انتظار کرو' وہ وقت دور نہیں جب تم خود اُن تمام چیزوں کے مالک بن جاؤ گے جن کی تم خواہش رکھتے ہو۔'' یاسر کی باتوں سے ہمیشہ کی طرح میرا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ وہ میرا واحد بہترین دوست اور کلاس فیلو تھا اور میری رگ رگ سے واقف تھا۔

شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی' ابھی میرا CA مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ مجھے مختلف کمپنیز سے آفرز ہونے لگیں۔ میں نے سوچ سمجھ کر اس میں سے ایک اچھی آفر قبول کر لی۔ کمپنی کی طرف سے مجھے بنگلہ' گاڑی ملی لیکن امی اُسی کچے مکان میں رہیں پھر مجھے تین سال کی ٹریننگ کے لیے ملک سے باہر جانا پڑا جس کے بعد میری سیلری میں دگنا اضافہ ہو جانا تھا۔ میں امی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر وہ راضی نہیں تھیں۔

''آخر آپ کو جانے میں کیا مسئلہ ہے؟'' میں انہیں سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا لیکن امی اپنی بات سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

''مسئلہ جانے کا نہیں' اس گھر کا ہے' میں یہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتی جہاں زندگی کے تیس برس گزارے ہیں' وہاں چند سال اور سہی۔ تمہارے ابا کو گزرے سال ہو گیا ہے' پتا بھی نہیں چلا۔'' وہ آہیں بھرنے لگیں۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میں بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی چند لمحے ہمارے درمیان رہی پھر وہ ڈبڈباتی نظروں سے میرے چہرے کو تھامتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا! اس گھر سے تیری ماں کے کئی اچھے برے دن جڑے ہیں۔ تیرے ابا کے ساتھ جب میں یہاں آئی تھی تو ایک کمرہ اور کچا صحن تھا جسے ہم نے اپنی محبت سے سجایا' سنوارا پھر تم ہماری زندگی میں آئے۔ اسی گھر میں تمہاری انگلی پکڑ کر ہم نے تمہیں چلنا سکھایا' لکھایا پڑھایا' اس گھر کی یادوں کو چھوڑ کر میں کیسے جا سکتی ہوں؟''

''امی! میں آپ کو یہاں اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اگلے ماہ میری فلائٹ ہے' میں آپ کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

''بیٹا! تم بھی نہ جاؤ۔'' امی نے میری آنکھوں میں دیکھا' میری نظریں جھک گئیں۔

''امی! یہ ٹریننگ مجھے ترقی کی بلندی تک پہنچا دے گی۔ میں یہ chance miss نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے نظریں چرا لیں۔

''بیٹا! تم اچھا کما رہے ہو۔ اللہ کا دیا بہت ہے۔ اسی پر راضی رہو۔'' امی کہہ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

''تو پھر آپ میرے ساتھ نہیں چل رہیں؟ ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔''

•.....•.....•.....•

دن گزرتے رہے' میں ایک اہم پوسٹ پر فائز تھا۔ میری بے شمار مصروفیت نے مجھے ایسا جکڑا کہ امی سے ملنے ایک بار بھی واپس نہ آ سکا۔ دل و دماغ کی خلش کو ہر ماہ امی کو بھیجی جانے والی رقم سے دور کر دیتا اور دل کو یہ کہہ کر تسلی دیتا۔ 'میں تو اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔'

ٹریننگ مکمل ہونے میں ایک سال باقی تھا کہ اطلاع آئی' امی اِس دنیا میں نہیں رہیں۔ میں اپنی ٹھنڈی چھاؤں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔



باوجود کوشش کے' میں اپنی ماں کو کندھا بھی نہ دے سکا۔ اُس دن میں بہت رویا' اپنی بے بسی پر گرتے آنسو دیکھنے والا صرف میرا اللہ تھا یا پھر وہ بے جان دیواریں جو میرے شاندار گھر کا حصہ تھیں۔ خوب پیسہ کمانے کی دھن نے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ اپنی ماں کی محبت کا حق ادا نہ کر پایا۔ میری ماں کے آخری دن اسی انتظار میں کٹے تھے کہ ایک روز اُس کا بیٹا آئے گا لیکن وہ ایک روز کبھی نہ آیا بلکہ ماں کا آخری لمحہ آ گیا۔ میں سوچ سوچ کر تھرانے لگا۔

•.....•.....•.....•

کائنات سے میری ملاقات پاکستان واپس آنے کے بعد ایک بزنس میٹنگ میں ہوئی تھی۔ وہ ایک حسین مگر مغرور لڑکی تھی جسے اپنی آزادی سب سے پیاری تھی۔ پہلی ہی نظر میں میرا دل اس کی محبت کی شبنم سے بھیگنے لگا تھا۔ ماں کے بعد زندگی کا اکیلا پن مجھے کاٹنے لگا تھا۔ میں نے اسے دوسری ملاقات میں ہی پرپوز کر دیا۔ افیئر کا میں قائل نہیں تھا نہ لڑکیوں سے دوستی کی خواہش۔ کائنات نے میری بات سن کر اپنے والدین سے ملنے کو کہا۔ اس نے یہ حق اپنے والدین کے سپرد کر رکھا تھا۔

وہ تین بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ MBA کرنے کے بعد اس نے اپنے والد کی کمپنی کو ہی جوائن کر لیا تھا۔ وہ ذہین تھی۔

بہرحال اس کے والدین مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور چند دن میں ہی ہماری شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ شادی کے بعد کائنات کی وہی روٹین رہی جو شادی سے پہلے تھی۔ اس نے پہلے ہی مجھ پر یہ باور کر دیا تھا کہ وہ اپنے والد کا بزنس نہیں چھوڑے گی۔ میرا خیال تھا' وقت کے ساتھ ساتھ ذمہ داری کا بوجھ اس کی روٹین بدل کر رکھ دے گا لیکن ایسا نہ ہوا' اس کی وہی روٹین تھی جو ایک بزنس وومن کی ہوتی ہے یعنی بزنس سنبھالنا اور پارٹیز یا کلب وغیرہ میں جانا۔

''کائنات..... !تم ایک شادی شدہ عورت ہو' روز روز یوں رات گئے کلب' پارٹی میں جانا تمہیں زیب نہیں دیتا۔'' ایک روز میں آفس سے تھکا ہارا آیا تو دیکھا' حسبِ معمول وہ کہیں جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا۔

''دیکھو واثق! دس از بزنس پارٹی اور سوشل رہنے سے بزنس ریلیشنز میں فرق پڑتا ہے۔'' کائنات بلش ان کا پچ دے کر آئینہ میں اپنا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے سکون سے بولی۔

''مجھے یہ سب پسند نہیں۔''

''سو واٹ؟''

''میرا دل چاہتا ہے' میں دفتر سے آؤں تو یہ تیاری تم میرے لیے کرو پھر ہم کہیں گھومنے پھرنے جائیں اور.....''

''زندگی بہت مختصر ہے واثق' اور تم جانتے ہو' میرے نزدیک وقت کی کتنی قدر ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے' ہم پھر کسی دن اس موضوع پر بات کریں گے' you look so upset, you should take rest." کہتی ہوئی نکل گئی اور میں عقب سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی روٹین نہ بدلنی تھی نہ بدلی' وہ اپنی دونوں بہنوں کی بہ نسبت ایک بزنس مائنڈڈ سرد جذبات رکھنے والی لڑکی تھی' وہ اپنے والد کے بزنس کو بہتر انداز میں چلا رہی تھی۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اپنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔ شادی کے چار سال بعد ہماری زندگی میں زوہیب کا اضافہ ہوا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اب میرا بیٹا ہی میری توجہ کا مرکز تھا۔ وہ تین سال کا تھا کہ مجھے اپنے ایک اسائنمنٹ کے سلسلے میں یورپ جانا پڑا پھر

میرے یورپ، جرمنی، فرانس کے دورے طویل ہونے لگے۔ میں اپنی کاروباری مصروفیت میں الجھا رہتا لیکن زوہیب کی خبر رکھتا' اس کو فون کرتا' اس کی باتیں سننا نہ بھولتا۔ کائنات کی وہی اپنی بزنس مصروفیت رہیں۔ میں بھی دولت بڑھانے کے چکر میں ایسا پھنس چکا تھا کہ زوہیب کی خیریت فون پر پوچھ کر بری الذمہ ہوجاتا پھر وہ دن بھی آیا جب آئینہ میں کھڑا میں اپنی ٹائی کی ناٹ درست کررہا تھا کہ میں نے دیکھا' میرے بالوں میں جابجا سفید بال جھانک رہے تھے۔

''لو' اب ہم بھی بڑھاپے کی دہلیز پر آ گئے۔'' میں نے مسکرا کر سوچا کہ آئینہ میں ایک اور عکس ابھرا۔

''ہیلو ڈیڈی!'' زوہیب کے پکارنے پر میں پلٹا جس کا قد مجھ سے بھی اونچا تھا۔ ''ڈیڈی' میری کار پرانے ماڈل کی ہوگئی ہے' مجھے نئی چاہیے۔'' بیٹے کی فرمائش پر میں نے ایک موٹی رقم کا چیک اسے کاٹ دیا۔ وہ خوش ہوگیا' اس کے چہرے کی مسکراہٹ مجھے مسرور کرگئی۔

اُس رات اپنی فائل پر کام کرتے ہوئے رات کے تین بج گئے۔ میں نے اپنی تھکی ماندہ آنکھوں کے آگے سے چشمہ اتارا اور فائل بند کردی۔ اچانک مخصوص ہارن کی آواز آئی' ایک گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ میں نے دیکھا' گاڑی سے زوہیب لہراتا ہوا نکل رہا ہے۔ یہ دیکھ کر غصے کی ایک لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی' دماغ شل ہونے لگا۔ میں تیزی سے نیچے گیا۔

''کہاں سے آرہے ہو؟'' میں کرخت لہجے میں بولا۔ زوہیب نے میری طرف حیرانی سے دیکھا' وہ اس لہجے کا عادی نہیں تھا۔

''دوستوں کی پارٹی سے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ اس کے انداز پر میرا ہاتھ اس کے رخسار پر زناٹے دار تھپڑ کی صورت پڑا' وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی کی کیفیت میں مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میری گرج دار آواز سن کر کائنات بھی کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

''کیا ہوگیا ہے' یہ کیسا شور ہے؟'' وہ بولی۔

''پوچھتی ہو' کیا ہوگیا ہے؟ میری غیر موجودگی میں یہ جب اس حالت میں رات گئے آتا ہوگا' تب کیوں اس سے نہیں پوچھا تم نے کہ کیا ہوا ہے اسے؟ یہ ہوٹل ہے یا گھر؟''

''واؤ..... ڈیڈی..... از بردست تقریر ہے آپ کی' آج آپ کو یہ احساس ہورہا ہے کہ یہ ہوٹل ہے یا گھر' خود آپ نے اس گھر کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ یہ ہوٹل ہی ہے جہاں آپ خود ہر چھ ماہ بعد آتے ہیں' چند دن ٹھہرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ آپ ہوں یا ممی' دونوں کی مصروفیت میں میری کوئی جگہ نہیں تھی اور اب بھی نہیں ہونی چاہیے۔ میرا تو یہ روز کا معمول ہے اور پلیز' جس دن آپ خود اسے ہوٹل سے گھر بنا لیں گے' تب مجھ سے ایسے سوال کیجیے گا۔ فی الحال آپ میری فکر نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔'' وہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی باتیں سن کر میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میرے دل میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں اور دماغ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا اور میں کسی شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح بے جان گرتا چلا گیا۔

''ہوش آ گیا ہے انہیں۔'' میں نے آنکھیں کھولیں تو ڈاکٹر کی آواز کانوں میں آئی۔ ''ان کا آدھا جسم مفلوج ہوگیا ہے۔ He is paralysed. نہ یہ بول سکتے ہیں اور نہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتے ہیں البتہ ان کے بائیں طرف کا حصہ کچھ حرکت کر



سکتا ہے۔ چند دنوں کی کوشش سے بایاں ہاتھ حرکت کے قابل ہوجائے گا۔'' ڈاکٹر' کائنات کو میری حالت بتا کر جاچکا تھا۔

''ہیلو ڈیئر' کیسے ہو؟ سب ٹھیک ہوجائے گا' تم پریشان مت ہونا۔ اس شہر کے سب سے مہنگے ہاسپٹل میں تمہارا علاج ہورہا ہے۔ میں نے لندن میں بھی تمہارا کیس بھجوایا ہے۔ ضرورت پڑی تو تمہیں وہاں لے جائیں گے۔ اچھا' اب تم آرام کرو۔ میری ایک میٹنگ ہے' او کے! I hope, you understand." وہ جا چکی تھی۔ میں خود غرضی سے بنے اس خوبصورت مجسمے کو دیکھنے پر مجبور تھا' یہ تماشہ اب مجھ بے بس لاش کو روز دیکھنا تھا۔ وہ نارمل حالات میں میرے سنگ نہ تھی تو آج کیوں ہوتی؟

آہ..... قسمت کے کھیل نرالے ہیں' میں نے اپنی خواہشوں کے حصول کی خاطر اپنی ماں کی محبت کی قدر نہ کی' ان کی محبت کو اہمیت نہ دی۔ میرا کشکول محبت سے کل بھی خالی تھا اور آج بھی۔

چند دن بعد میں اپنے گھر شفٹ ہوگیا تھا۔ ڈاکٹرز کی محنت سے میرا بایاں ہاتھ حرکت کے لائق ہوگیا تھا۔ میں اپنی کہانی اسی ہاتھ سے لکھ رہا ہوں' بس آپ سے یہی کہنا ہے کہ خدارا' اپنے رشتوں کی قدر کیجیے' ماں باپ' اولاد کی محبت چاہتے ہیں' اپنے لیے عزت چاہتے ہیں' اُن کو اولاد کی دولت سے غرض نہیں ہوتی۔ کاش' میں نے اپنی ماں کی محبت کی قدر کی ہوتی۔ یہ دولت' یہ مرتبہ آج میرے کسی کام کے نہیں' میں ایک بنجر زمین ہوں' میرے لیے محبت کی دو بوندیں ہی کافی ہیں لیکن میرے پاس کوئی نہیں سوائے خالی در و دیوار کے۔ آپ سب میرے لیے دعا کیجیے' اللہ میرے لیے آسانیاں پیدا فرمائے۔ (آمین!)

.....☆☆.....

## غزل

قصہ دل اتنا پُرانا نہیں ہوا
بچھڑے ہوئے اُسے زمانہ نہیں ہوا

آنکھوں میں نیند نہیں آئی رات بھر
نگاہ میں کوئی خواب سہانا نہیں ہوا

نکلتے گھر سے تو تجھے پا لیتے
لیکن ہمارا کہیں جانا نہیں ہوا

ابھی اشک ہیں محفوظ ان آنکھوں میں
ابھی ختم غم کا خزانہ نہیں ہوا

جس کے انتظار میں پتھرا گئیں آنکھیں
اُس کا مری چوکھٹ پہ آنا نہیں ہوا

جسے دیکھنے کو بے تاب ہوں فرہاد
اُس سے ملنے کا کوئی بہانہ نہیں ہوا

محمد راشد فرہاد

آپ بیتی یہ سچ بیتی سنانے والے آپ کے اور ہمارے درمیان ہی موجود ہیں

انیلا امام بخش

# میرا مہربان رب

الماس روحی کا خیال

میرے ہر سانس میں خوشبو ہے تری چاہت کی
دِل کی دھڑکن میں ترے پیار کی شہنائی ہے

خود سے مایوس ایک لڑکی کا فسانہ، اس پر خوشیوں کی بارش ہوئی تھی

''صنوبر، تم اپنی سب بہنوں سے بڑی ہو نا؟'' خالہ شریفہ کو پتا بھی ہے کہ میں بہنوں میں سب سے بڑی ہوں مگر پھر بھی ہر بار یہ بات پوچھنے سے باز نہیں آتیں۔ ''کیا تم پیدائشی ایسی ہو؟'' ایک اور چبھتا ہوا سوال میرے احساسات کو چھید گیا۔ وہ میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں، کتنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ ہیں، نازک سی کلائی جیسے چار سالہ بچی کے ہاتھ ہوں۔ ان کے الفاظ میرے دل پر کیسے تیر چلا رہے تھے، یہ جانے بغیر وہ ہنس ہنس کر آس پاس بیٹھی خواتین کو میرے ہاتھ دکھا رہی تھیں۔ آنسو تھے کہ میری آنکھوں سے نکلنے کو بے تاب تھے مگر ضبط سے کام لے رہی تھی کہ اپنا تماشا لگانا نہیں چاہتی تھی اس لیے اپنا ہاتھ چھڑا کر اٹھی اور سعیدہ باجی کو جانے کا کہہ کر گھر آ گئی۔

میرا نام صنوبر اقبال ہے۔ ہم پانچ بہنیں ہیں، میں سب سے بڑی ہوں۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں۔ ہم بہنوں کی شدید خواہش ہے کہ کاش ہمارا ایک بھائی ہوتا جس کا ہم مان اٹھاتے، وہ ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا ہوتا مگر ہمارے نصیب میں یہ نعمت نہیں تھی۔ اماں اٹھتے بیٹھتے ہر وقت مجھے طعنہ دیتیں کہ تمہاری جگہ ہمارا کوئی بیٹا ہوتا، اپنے باپ کا بازو بنتا، تم کس کام کی؟ اماں کے اس جملے پر میرے دل میں جیسے سوئی سی چبھتی تھی۔

واقعی میں کسی کام کی نہیں تھی، میرا قد بہت چھوٹا تھا اور اکثر بیمار رہتی تھی، زیادہ کام کاج بھی نہ کر سکتی تھی۔ میری زندگی ایک مذاق تھی۔ میرا خیال تھا، میری زندگی میں کوئی خوشی ہے نہ کبھی آئے گی حالانکہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے مگر میں ہو گئی تھی۔

پھر میرے مہربان رب نے شاہ میر کی صورت میں مجھے دنیا کی سب سے بڑی نعمت یعنی محبت دی، ایسی نعمت جو ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتی جسے پیسے کے زور پر خریدا نہیں جا سکتا۔ میرے رب نے مجھے اتنی بڑی خوشی دی، وہ بھی بن مانگے۔ میں احساسِ کمتری میں مبتلا لڑکی جس میں کوئی بھی پسند کی جانے والی بات نہیں تھی، تعلیم تو مڈل تک تھی، شکل وصورت واجبی سی، رنگت سانولی، مزاج میں چڑچڑا پن، کسی کی سیدھی بات بھی الٹی لگتی تھی، پوری کی پوری نفسیاتی مریضہ تھی اور قد اتنا بوٹا جیسے کوئی نابالغ بچی۔ ایسی پرسنالٹی کے ہوتے بھلا میری یہ مجال ہوتی کہ میں بڑے بڑے خواب دیکھ سکتی؟ ہمارا معاشرہ مجھ جیسی لڑکی کو خواب دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا مگر خوابوں پر کس کا زور چلا ہے؟ میری پھیکی بے رنگ زندگی میں شاہ میر کیا آیا، میری تو دنیا ہی بدل گئی، ہنسی ہر وقت میرے ہونٹوں پر کھیلنے لگی، چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمکنے لگا، خوشی میرے انگ انگ سے پھوٹتی، چڑچڑا پن، خوش مزاجی میں بدل گیا، کسی کی کڑوی بات بھی میٹھی گولی کی طرح نگل لیتی۔

شاہ میر میری گاؤں والی خالہ کا بڑا بیٹا تھا، وہ زندگی میں پہلی بار ہمارے گھر آیا تھا اور حیرت انگیز طور پر میں اسے پہلی ہی نظر میں پسند آ گئی تھی۔ میں تو کہیں سے بھی اس کے لائق نہیں تھی۔ وہ لمبا چوڑا، گبھرو جوان، ہر لحاظ سے پرفیکٹ، اس کے لیے تو لڑکی بھی ایسی ہونی چاہیے تھی جو اس کے ساتھ سوٹ کرے۔ اس کی منگیتر تھی، بھی ایسی ہی بے انتہا خوبصورت، قد کاٹھ بھی نارمل، اتنی خوبصورت منگیتر کے ہوتے ہوئے بھی اس کے دل میں، میں سما گئی تھی۔ وہ بھی پہلی ہی نظر میں مجھے پسند آ گیا تھا مگر میں اسے کیسے پسند آئی، یہ بات مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکی۔ یہ میرے رب کی مہربانی تھی کہ شاہ میر کا دل میری طرف پھیر دیا کیونکہ دلوں کا پھیرنا رب ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے شاہ میر کو سب ہی سے لڑنا پڑا اور وہ خوب ڈٹ کر لڑا بھی۔ اپنی تایازاد سے منگنی توڑی حالانکہ مجھے بڑا افسوس ہوا تھا اس کی منگنی ٹوٹنے کا۔ وہ بھی میری طرح ایک لڑکی ہی تھی۔ شاہ میر نے اپنی منگنی توڑی تو اس کی بہن کی بھی منگنی ٹوٹ گئی، وٹہ سٹہ میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ دونوں گھرانوں نے ایک دوسرے سے

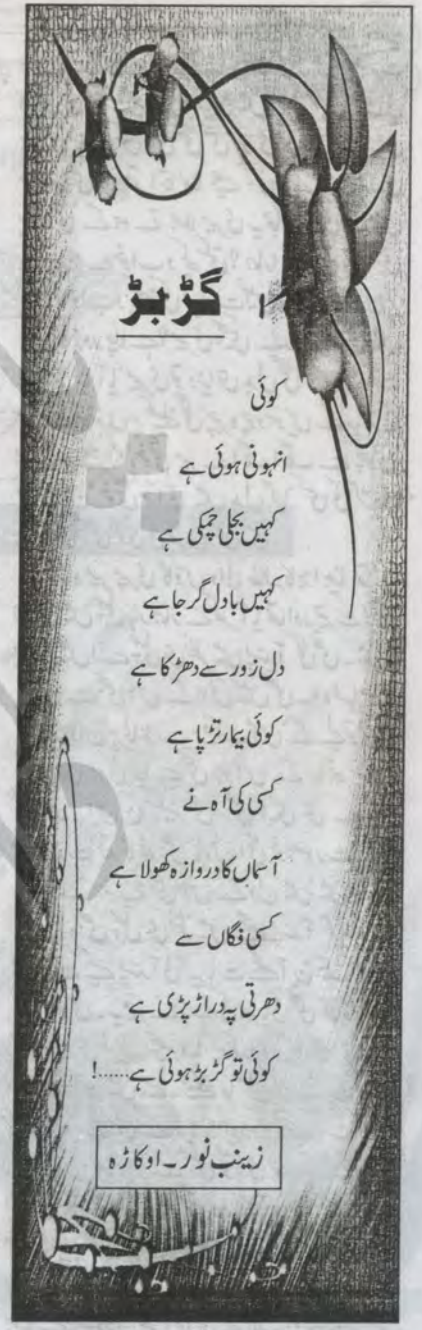

## گڑبڑ

کوئی
انہونی ہوئی ہے
کہیں بجلی چمکی ہے
کہیں بادل گرجا ہے
دل زور سے دھڑکا ہے
کوئی بیمار تڑپا ہے
کسی کی آہ نے
آسماں کا دروازہ کھولا ہے
کسی فگاں سے
دھرتی پہ دراڑ پڑی ہے
کوئی تو گڑبڑ ہوئی ہے......!

زینب نور۔ اوکاڑہ

قطع تعلق کرلیا۔ شاہ میر نے جیسے تیسے اپنے والد کو راضی کیا پھر ہمارا رشتہ طے ہوگیا۔ میرے ماں باپ بہت خوش تھے۔ ہماری منگنی نہایت سادگی سے ہوئی' سب ہی حیران تھے کہ مجھ جیسی لڑکی کے لیے شاہ میر نے اپنی منگنی کو توڑا' یہ بات اچنبھے سے کم نہیں تھی۔ شاہ میر کی پھوپھیاں وغیرہ جب بھی مجھے دیکھنے آتیں تو ان کی نظروں میں تمسخر ہوتا' وہ یوں دیکھتیں جیسے میں انسان نہیں' عجوبہ ہوں۔

چھ ماہ بعد ہماری شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ میں دلہن بن کر بالکل باربی ڈول لگ رہی تھی' یہ میں نہیں کہہ رہی بلکہ جس نے بھی مجھے دلہن کے روپ میں دیکھا' اُن سب نے یہی کہا تھا۔ میں جب رخصت ہوکر گاؤں آئی تو سارا گاؤں مجھے دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ میں نے جب بھی نظر اٹھا کر وہاں موجود عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں اپنے لیے تمسخر ہی دیکھا۔ کچھ منہ پھٹ عورتیں مجھ پر بے رحمانہ تبصرے بھی کررہی تھیں۔

''ہائے اللہ! شاہ میر کی اتنی چھوٹی سی دلہن' اس چھٹکی کے لیے شاہ میر نے اتنی پیاری منگیتر کو چھوڑا؟ بہت پچھتائے گا شاہ میر اس فیصلے پر۔'' وہ عورت بڑی سنگدلی سے کہہ رہی تھی یہ پروا کیے بغیر کہ اس کے الفاظ میرے دل پر کیسے ستم ڈھا رہے ہیں۔ میرا قد چھوٹا تھا تو اس میں میرا کیا قصور؟! اگر شاہ میر نے مجھے پسند کیا تو یہ میری خوش نصیبی تھی۔ بہرحال میں اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی ہوں۔ شاہ میر کی محبت نے مجھے سرتاپا بدل کر رکھ دیا۔ میری زندگی میں خوشیوں کی بہار آ گئی۔ میرے ساس سسر مجھ پر جان چھڑکتے ہیں' میری نندیں مجھے ''بھابھی! بھابھی!'' کہتی نہیں تھکتیں۔ میرے رَب نے مجھے بِن مانگے اتنی ساری محبتیں دیں' بس اس رَب سے یہی دُعا ہے کہ یہ محبتیں ہمیشہ قائم و دائم رہیں۔

میں اپنے مہربان رَب کا جس قدر بھی شکر ادا کروں' وہ کم ہے۔

......☆☆......

ممتاز احمد

# ہوسِ زر

محسن بھوپالی کا خیال

یہ عمر میری تمام کارِ زیاں میں گزری
میں تیرا محصول زندگی اب چکاؤں کیسے

**ایک حریص شخص کی کہانی' اس نے حقیقی دولت کی قدر نہ کی تھی**

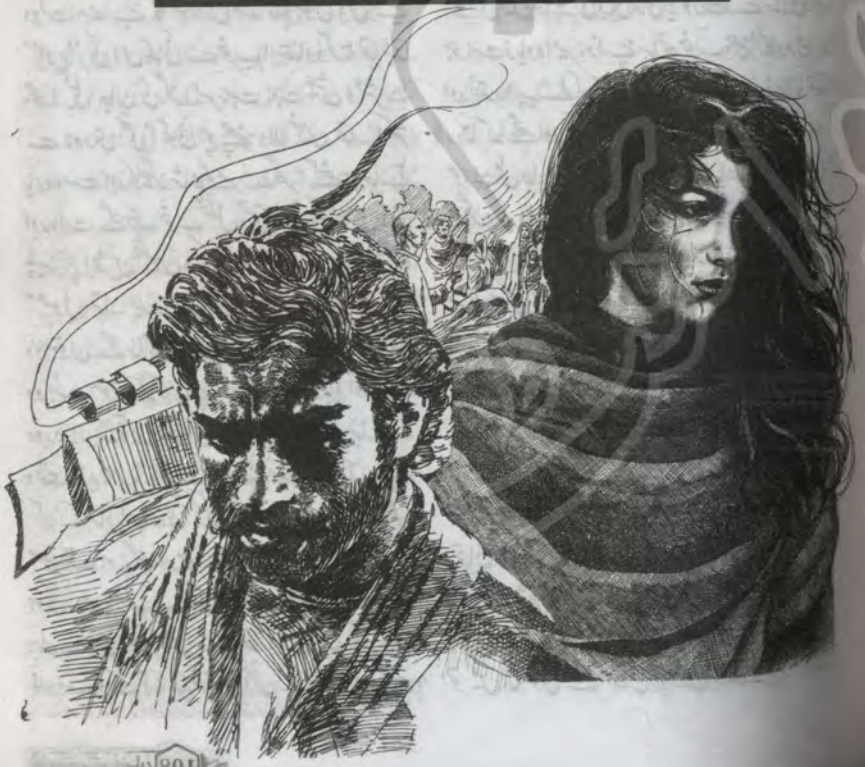

زیرِنظر کہانی کے مرکزی کردار سے میری ملاقات ایک ہسپتال میں ہوئی۔ چند ملاقاتوں میں اُس نے اپنی آپ بیتی کچھ یوں سنائی۔

میرا نام احسن شہزاد ہے۔ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ میں شروع سے ہی پڑھائی میں تیز تھا اور فرسٹ ڈویژن میں گریجویشن پاس کر لیا۔ اس دوران میرے والدین یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ اُن کی وفات کے بعد پانچ مرلے کا گھر جو کہ والد صاحب نے دورانِ ملازمت اپنی جمع پونجی اور ریٹائرمنٹ سے ملنے والی رقم سے بنوایا تھا' وہ میرے نام ہو گیا۔ گریجویشن کرتے ہی والد صاحب کے محکمے میں مجھے گیارہویں اسکیل کی جاب مل گئی۔ تنخواہ معمولی تھی اور محکمہ بھی ایسا کہ جہاں رشوت کی صورت میں خوب ہن برستا تھا چونکہ میں شروع سے ہی دولت مند بننے کا خواہش مند رہا ہوں اس لیے ''اوپر'' کی اس کمائی سے خوب استفادہ کرتا تھا لہٰذا مجھ اکیلی جان کی گزر بسر بہت بہت عیش و عشرت سے ہو رہی تھی' کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ اکثر یار دوست اور کولیگز شام کو میرے گھر اکٹھے ہو جاتے اور رات گئے تک خوب محفل جمتی' تاش کھیلنا' سی ڈی پلیئر پر انڈین فلمیں دیکھنا اور گپیں مارنا ہمارا روز کا معمول تھا۔ میرے پاس نئی موٹر سائیکل تھی لہٰذا دوستوں کے ساتھ خوب آوارہ گردی ہوتی۔ ہم تمام دوست موٹر سائیکلوں پر مری' ایبٹ آباد اور دیگر دور دراز علاقوں میں سیر و تفریح کے لیے جاتے۔ وقت گزرتا رہا' دوست احباب سب کی ایک ایک کر کے شادیاں ہوتی گئیں اور سب اپنے گھر بار میں مصروف ہو گئے اور میرے گھر جمنے والی محفل بھی ختم ہو گئی۔ میرا سب سے گہرا دوست اور کلاس فیلو امجد ہمارے ہی محلّہ میں رہتا تھا۔ اس کے گھر میرا بلا روک ٹوک آنا جانا تھا۔ اُس کے والدین مجھے اپنے سگے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ امجد کو بھی بہت اچھی جاب مل گئی تھی مگر اُس کی شادی بھی ابھی تک نہیں ہوئی تھی کیونکہ اُس کی ایک بڑی بہن اور دو بھائیوں کی شادی ابھی ہونا تھی لہٰذا اُس کی شادی میں ابھی بہت دیر تھی۔ اَب صرف امجد ہی مجھے کمپنی دیتا تھا' کبھی کبھار دوسرے دوست بھی تھوڑی دیر کے لیے آ جاتے۔

پھر دوستوں اور بالخصوص امجد کے گھر والوں نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا کہ اب میں بھی اپنا گھر بسا لوں چونکہ میری فطرت میں شروع سے ہی لالچ' حرص کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور مجھے بے تحاشا دولت کی ہوس تھی۔ میں راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھا کرتا اور شارٹ کٹ کے چکر میں تھا لہٰذا میں اس کوشش میں تھا کہ کسی ایسی لڑکی یا عورت سے شادی ہو جو بہت زیادہ امیر ہو' اپنے ساتھ خوب جہیز' کار وغیرہ اور نقد روپیہ لے کر آئے۔ میں ہر وقت یہ دُعا مانگتا رہتا کہ مجھے اور کچھ ملے نہ ملے' بس کوئی دولت مند عورت مل جائے خواہ وہ بیوہ ہو' طلاق یافتہ ہو جیسی بھی ہو مگر ہو کروڑ پتی دولت مند..... میرا دوست امجد اکثر مجھے سمجھاتا کہ دنیا میں سب کچھ دولت ہی نہیں ہے۔ میری اچھی جاب ہے' اپنا گھر ہے' خوشحالی ہے مگر میں اُس کی بات یہ کہتے ہوئے ہنس کر ٹال دیتا کہ پیارے' سب سُکھ' چین' آرام اور سکون صرف بے پناہ دولت سے ہی ملتا ہے مگر وہ میری اس بات کی نفی کرتا۔ اُن ہی دنوں امجد کے بڑے بھائی کی شادی تھی' وہ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا اور میں تنہائی کا شکار چونکہ وہ مجھے اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے لہٰذا میں نے شادی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ولیمے والے دن جب ہم خواتین کو کھانا کھلا رہے تھے تو میں خاموشی سے مہمان خواتین کو کھانا سرو کر رہا



تھا اور غیر ضروری طور پر خواتین اور لڑکیوں کو دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ مجھ میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ میں اپنے دوستوں اور جاننے والوں کی لڑکیوں کو بہن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ کبھی کسی کو غلط نگاہ سے نہیں دیکھا۔ کھانا سرو کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ایک بزرگ عورت مسلسل میری طرف متوجہ تھیں اور مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ جس ٹیبل پر وہ بیٹھی تھیں' وہاں سے نان اور پانی منگوائے گئے۔ اُس ٹیبل پر امجد کی والدہ صاحبہ بھی بیٹھی تھیں۔ جب میں نان اور پانی لے کر وہاں پہنچا تو اُس خاتون نے امجد کی امی سے میرے بارے میں پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے جس پر انہوں نے بتایا کہ یہ امجد کا گہرا دوست ہے اور میرے بیٹے جیسا ہے۔ میں نے اُن کو سلام کیا تو انہوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ میری شرافت سے بہت متاثر ہوئیں۔ امجد کی امی نے میری بہت تعریف کی۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہو گیا۔ ایک روز میں امجد کے گھر بیٹھا ہوا تھا تو امجد کی امی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور سمجھانے لگیں کہ میں شادی کر لوں اور اپنا گھر بسا لوں پھر انہوں نے بتایا کہ ولیمے والے دن جو خاتون میرے بارے میں پوچھ رہی تھیں' وہ امجد کی ممانی ہیں اور بیوہ ہیں۔ اُن کی ایک بیٹی ہے جو خوبصورت اور نیک سیرت ہونے کے ساتھ پڑھی لکھی اور سگھڑ ہے۔ وہ بیٹی کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ میں انہیں اچھا لگا تھا اور انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ امجد کی امی کہنے لگیں کہ یتیم بچی ہے' بہت نیک اور فرماں بردار ہے' میرے لیے اچھی بیوی ساتھی ثابت ہو گی۔

''وہ اتنی اچھی ہے تو آپ امجد کی شادی اُس سے کر دیں۔'' میں نے کہا۔

''بیٹا' امجد کی منگنی بچپن میں اُس کی پھوپھی زاد شائلہ سے طے ہو چکی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی امجد کی ممانی کی بیٹی شہناز سے ہو جائے چونکہ تم میرے بیٹے ہی جیسے ہو اس لیے اپنی فیملی میں تمہاری شادی کروانا چاہتی ہوں۔'' میں نے سوچنے کے لیے اُن سے کچھ دنوں کا ٹائم لیا اور گھر آ گیا چونکہ میں کسی امیر لڑکی کی تلاش میں تھا جو کہ اب تک مجھے مل نہیں سکی تھی' دوسرا گھر کی تنہائی بھی مجھے کاٹتی تھی چنانچہ دوستوں اور امجد کے گھر والوں کے سمجھانے پر میں نے بادلِ ناخواستہ شہناز سے شادی پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ امجد کی امی نے میرے رشتے کی بات چلائی اور پھر تین ماہ کے اندر میری شادی شہناز سے ہو گئی۔

میری شادی کا سارا انتظام امجد کے گھر والوں نے کیا اور سگے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی طرح تمام رسومات ادا کیں۔ اُن کے گھر کے ہر فرد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میری شادی کی تمام رسومات میں یوں بہت شاندار طریقے سے شادی کا مرحلہ بخیر و خوبی انجام پا گیا اور شہناز دلہن بن کر میرے گھر آ گئی مگر سچی بات ہے کہ مجھے کچھ خوشی نہیں تھی کیونکہ شہناز کا تعلق ایک غریب فیملی سے تھا' اُس کا باپ فوت ہو چکا تھا اور کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ شہناز کے والد کی پنشن سے اُن کے گھر کا خرچ چلتا تھا اس لیے وہ بہت معمولی اور واجبی سا جہیز ساتھ لائی تھی۔ میں دولت حاصل کرنے کے لیے پرائز بانڈ بھی خریدتا رہتا تھا مگر کبھی بھی میرا بانڈ نہیں لگا تھا۔ پچاس ہزار کی مالیت کے پرائز بانڈ جوں کے توں ہی پڑے تھے۔ شادی کے بعد شہناز نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ وہ پرائز بانڈ بیچ کر اس سے حاصل ہونے والی رقم سے پورے گھر کو رنگ و روغن کروایا' کارپٹ اور نئے

پردے ڈلوائے، باورچی خانے کی کچن کیبنٹ بنوائیں، نئے سرے سے سیٹنگ کی اور ایک مہینے میں گھر کا نقشہ بدل دیا۔ شہناز واقعی ایک انتہائی سلیقہ شعار اور محبت کرنے والی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے سگھڑپن سے چند دن میں ہی گھر کو جنت کا نمونہ بنا دیا تھا۔ میں نے شہناز کو کہہ دیا تھا کہ ابھی مجھے اولاد کی ضرورت نہیں ہے، میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا اس لیے ہم احتیاطی تدابیر اختیار کرتے۔ میرا خواب بہت بڑی کوٹھی، کار اور نوکر چاکر تھے۔ میں اٹھتے بیٹھتے اپنی محرومیوں کا ذکر کرتا جس پر شہناز مجھے قناعت کا درس دیتی مگر میری فطرت میں قناعت اور صبر نام کی کوئی چیز نہ تھی، میں بہت جلد باز تھا جبکہ شہناز اس کے برعکس تھی۔ وہ صوم وصلوٰۃ اور پردے کی پابند تھی۔ تہجد کی نماز باقاعدگی سے پڑھتی اور اُس کی یہ دُعا ہوتی کہ اللہ پاک اُسے حج وعُمرے کی سعادت نصیب کردے۔ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کی اُسے شدید تمنا تھی۔ میں اکثر اُس کا مذاق اڑاتا کہ حج، عُمرے کے لیے لاکھوں روپوں کی ضرورت ہوتی ہے، ہمارے پاس تو اتنے پیسے ہی نہیں ہیں لہٰذا یہ خواب نہ دیکھا کرو۔ اس پر وہ کہتی کہ بلاوا تو اللہ اور رسول پاک ﷺ کے پاک دَر سے آتا ہے۔ بعض پیسے والوں کو بھی یہ مقدس سفر نصیب نہیں ہوتا اور جب بلاوا آجائے تو ایسے لوگ بھی چلے جاتے ہیں جن کے پاس دو وقت کا کھانا بھی نہیں ہوتا۔ میں اُس کی اِن باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا۔ میری تمنا ڈھیر ساری دولت تھی چونکہ مجھے کوئی دولت مند عورت نہیں مل سکی تھی اس لیے میں نے رشوت کی کمائی میں اضافہ کردیا۔ جب رشوت کے پیسے لے کر گھر جاتا تو شہناز یہ پیسے لینے سے انکار کردیتی اور کہتی کہ یہ حرام کی کمائی لے کر گھر نہ آیا کرو اور رشوت لینی چھوڑ دو جس پر میری اُس سے لڑائی ہوجاتی، میں اُس کو دقیانوسی خیالات کا کہتا۔

اُسے کم جہیز لانے اور اُس کے غریب ہونے پر طعنے بھی دیتا مگر وہ بے چاری خاموشی سے سب سنتی رہتی، اف تک نہ کرتی مگر رشوت کے پیسوں کو ہاتھ تک نہ لگاتی۔ وہ صرف میری تنخواہ سے گھر کے اخراجات پورے کرتی۔ وہ ہر حال میں صبر اور شُکر کرنے والی عورت تھی مگر مجھے روز بروز اُس سے چڑ ہوتی جارہی تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد شہناز کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ ہم اُن کی تدفین کے لیے جہلم گئے۔ میں تو دو تین دن بعد ہی واپس آگیا جبکہ اُسے چالیسواں کرنے کے بعد آنا تھا۔ اس طرح وقتی طور پر میں پھر سے اکیلا ہوگیا اسی لیے دفتری ٹائم کے بعد خوب آوارہ گردی کرتا۔ ایک دن میں اپنے دوست جو کہ واپڈا میں ملازم تھا، سے ملنے اُس کے آفس گیا تو وہاں ایک خوبصورت لڑکی اپنا بجلی کا بل لے کر آئی، وہ اصرار کررہی تھی کہ دو ہزار کا بل زیادہ ہے اُسے ٹھیک کردیں۔

''جتنے یونٹ آپ نے خرچ کیے ہیں، اُس کے حساب سے بل ٹھیک ہے، اس میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔'' وہ میرے دوست کی بات پر پریشان ہوگئی کیونکہ اُس کے پاس صرف آٹھ سو روپے تھے۔ اُس روز بل جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی۔ اگر بل جمع نہ ہوتا تو کنکشن کٹ جاتا۔ مجھے اُس لڑکی پر بہت ترس آیا جب وہ باہر چلی گئی تو میں اپنے دوست سے ضروری کام کا کہہ کر واپڈا آفس سے باہر آگیا۔ وہ لڑکی سڑک کے ساتھ پیدل چلی جارہی تھی۔ میں نے اُس کے پاس جاکر موٹر سائیکل روکی اور اسے کہا کہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ کے بل کا مسئلہ حل کردیتا ہوں۔

''وہ کیسے؟'' اُس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''آپ کا یہ بل میں جمع کروا دیتا ہوں، جب آپ کے پاس پیسے ہوں تو مجھے لوٹا دیجیے۔'' اور



تھوڑی سی پس وپیش کے بعد وہ مان گئی۔ میں نے اُس کو اپنی موٹر بائیک پر بٹھایا اور سیدھا بینک جاکر اُس کا بل جمع کروایا۔ دوپہر کا ٹائم تھا، میں نے بہت خلوص سے اُسے لنچ کی دعوت دی اور میرے بہت اصرار پر اُس نے قبول کرلی۔ ہم وہاں سے سیدھے ایک ریسٹورنٹ میں گئے، کھانا کھایا، اس دوران ایک دوسرے کے ساتھ تفصیلی تعارف ہوا۔ اُس کا نام عظمیٰ تھا۔ وہ ایک قریبی گاؤں میں رہتی تھی اور گاؤں کے ایک پرائیویٹ اسکول میں چار ہزار ماہانہ پر ٹیچر تھی۔ اُس کی ماں فوت ہوچکی تھی، گھر میں وہ اور اُس کا بیمار بوڑھا باپ تھا جو تمام وقت گھر میں ہی رہتا تھا۔ گھر کی گزر بسر عظمیٰ کی تنخواہ سے ہوتی تھی۔ میں نے بھی اپنا تعارف کروایا اور پھر میری اور اُس کی دوستی ہوگئی۔ اُس کے پاس فون وغیرہ نہیں تھا، میں نے اُسے ایک نیا موبائل فون اور سم لے کر دی جو کہ اُس نے اپنے نام پر رجسٹرڈ کروالی پھر میں اُسے اُس کے گاؤں چھوڑ آیا۔ اب ہماری فون پر روزانہ گھنٹوں بات ہوتی چونکہ میں بھی گھر میں اکیلا ہوتا لہٰذا پوری آزادی سے خوب باتیں ہوتیں۔ وہ اکثر دوسرے، تیسرے دن مجھے ملنے کے لیے شہر آتی۔ ہم ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں ملتے۔ میں اُسے شاپنگ کرواتا اور اپنی بائیک پر خوب سیر کرواتا۔ وہ بہت خوبصورت اور پُرکشش تھی، اُس میں ادائیں بھی تھیں اور ناز وانداز بھی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگنے لگی تھی مگر میرے لیے دکھ کی بات یہ تھی کہ وہ بہت غریب تھی۔ بہر حال میں اُس کی مالی مدد کرتا، اُس کو تحفے دیتا جن میں جوتے، کپڑے اور میک اپ وغیرہ کا سامان شامل ہوتا۔ میں نے ہی اُس کے باپ کو اسپیشلسٹ کو دکھایا اور اُن کا مہنگا علاج شروع کروایا۔ ان سب کاموں کے لیے میرا رشوت کا پیسہ کام آرہا تھا۔

ایک روز اس نے کہا۔ ''میں غربت کی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ مجھ سے شادی کرلو۔ میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں۔''

''میں تو پہلے سے شادی شدہ ہوں مگر دولت مند بننے کے لیے کسی امیر کبیر عورت کی تلاش میں ہوں۔'' میری بات پر وہ بہت ہنسی۔

''میں بھی کسی امیر آدمی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''تم اپنے حسن اور اداؤں سے یقیناً کسی دولت مند شخص کو پھانس سکتی ہو، اس سے شادی کرکے خوب عیش کرنا۔'' میری بات پر وہ کِھل گئی تھی۔

چالیسیوں کے بعد شہناز گھر آگئی مگر میرے شب وروز اُسی طرح گزرتے رہے۔ عظمیٰ سے میری دوستی کو ایک سال ہوگیا اور ہمارے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک دن عظمیٰ نے بتایا کہ ایک رانگ نمبر سے کوئی شخص بہت تنگ کررہا ہے اور دوستی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ امیر آدمی ہے تو اس سے دوستی کرلو۔ میرے مشورے پر عظمیٰ نے اُس سے ٹیلی فونک دوستی کرلی۔ اب عظمیٰ مجھے اُس کی تمام باتیں بتاتی۔ ایک روز کہنے لگی کہ وہ مجھ سے ملنے کی بہت ضد کررہا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کو بلالو۔ دوسرے دن وہ اپنی مہنگی کار میں عظمیٰ سے ملنے سرگودھا آیا۔ ان کی ملاقات ایک مہنگے ہوٹل میں طے تھی۔ اُس روز عظمیٰ خوب بن سنور کر شہر اس سے ملنے آئی تھی۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس شخص کا نام نعیم تھا، وہ ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا مگر اُس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ نعیم رنڈوا تھا، اس کی ایک بیٹی تھی جو شادی کے بعد امریکہ میں سیٹل تھی۔ نعیم کا اپنا کاروبار تھا، وہ کروڑ پتی تھا، اس کی رہائش لاہور گارڈن ٹاؤن کی کوٹھی میں تھی۔ پہلی ملاقات ہی میں اس نے عظمیٰ کو پسند کرلیا اور شادی کی خواہش کا اظہار کردیا۔ اس نے عظمیٰ کو ڈھیر ساری

شاپنگ بھی کروائی۔ عظمیٰ نے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا۔ بعد میں عظمیٰ نے یہ ساری باتیں مجھے بتائیں اور مجھ سے مشورہ مانگا۔

''دیکھو اس کی آفر پر ہاں کرنے سے پہلے نعیم کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں کہ وہ واقعی امیر ہے یا جھوٹ بول رہا ہے؟'' میں نے کہا پھر میں نے ہی لاہور جا کر نعیم کے متعلق تحقیقات کیں جس سے تصدیق ہوگئی کہ جو کچھ نعیم نے اپنے متعلق بتایا تھا' وہ بالکل سچ تھا چنانچہ عظمیٰ نے نعیم سے شادی کے لیے رضامندی ظاہر کردی مگر اس سے پہلے کہ شادی کے معاملات میں پیش رفت ہوتی' عظمیٰ کے والد کا انتقال ہوگیا' تاہم اس کے دو ماہ بعد عظمیٰ اور نعیم کی شادی ہوگئی۔ میں بھی اس شادی میں شریک ہوا اور اپنے آپ کو عظمیٰ کا کزن ظاہر کیا۔ عظمیٰ بیاہ کر لاہور چلی گئی اور اپنے گاؤں والے مکان کی چابی مجھے دے دی کہ مہینے میں ایک آدھ بار مکان کا چکر لگا لیا کروں۔ مکان کیا تھا' بس ایک چھوٹا سا کمرہ' باورچی خانہ اور ایک باتھ روم تھا۔ عظمیٰ ہر دوسرے' تیسرے دن مجھ سے فون پر بات کرتی۔ مجھے اُس پر رشک آتا کہ اسے اس کے خواب کی تعبیر مل گئی تھی لیکن وہ ابھی بھی مجھ سے محبت کرتی تھی' اس کا مجھ سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں مہینے میں ایک دو بار اس سے ملنے لاہور جاتا تھا اور بیوی سے بہانہ بناتا کہ دفتر کے کام سے لاہور جا رہا ہوں۔ اس طرح تین سال گزر گئے۔ عظمیٰ اپنے گھر میں بہت خوش تھی مگر مجھے نہیں بھولی تھی۔ اچھی خوراک اور عیش و آرام سے وہ روز بروز نکھرتی جا رہی تھی' مزید پرکشش اور خوبصورت ہوگئی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر آہیں بھرتا اور دن رات دُعائیں کرتا کہ عظمیٰ کا خاوند فوت ہو جائے اور میں اس سے شادی کرلوں۔

ادھر شادی کے ساڑھے تین سال گزرنے کے بعد احتیاطی تدابیر کی وجہ سے ہم اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ شہناز مجھ سے دبے لفظوں بچے کی خواہش کا اظہار کرتی تو میں سختی سے کہتا کہ مجھے اولاد نہیں چاہیے۔ ابھی میری حرام کی کمائی بھی روز بروز بڑھ رہی تھی' خوب رشوت لیتا جبکہ شہناز دن رات اللہ کی خوب عبادت کرتی۔ میں عظمیٰ کے خاوند کے مرنے کی دعا کرتا اور پھر میری دعائیں رنگ لائیں' عظمیٰ کے شوہر کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ جب عظمیٰ نے مجھے نعیم کی وفات کی خبر دی تو میں دل ہی دل میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ میری مراد بر آئی تھی مگر دکھاوے کے لیے عظمیٰ کے پاس اس کی دلجوئی اور نعیم کی تعزیت کے لیے گیا اور اس کو دلاسہ اور پرسہ دیا جبکہ اندر سے میں بہت مسرور تھا۔ نعیم کی بیٹی کو امریکہ اطلاع دی گئی اور وہ تیسرے دن لاہور پہنچی چونکہ عظمیٰ نے سب کو میرے بارے میں یہ بتایا ہوا تھا کہ میں اس کا کزن ہوں لہٰذا میں نے نعیم کی تدفین اور دیگر کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ عظمیٰ عدت میں بیٹھ گئی۔ نعیم کی بیٹی نے سارے کاروبار کا جائزہ لیا چونکہ وہ امریکہ میں سیٹل تھی' وہیں اس کا شوہر اور بچے تھے' اس کا کروڑوں کا بزنس امریکہ میں تھا لہٰذا نعیم کے تمام بزنس کی وارث قانونی طور پر اب عظمیٰ تھی۔ نعیم کی بیٹی نے اپنا حصہ لے کر تمام بزنس عظمیٰ کے نام کروا دیا اور ہمیشہ کے لیے امریکہ چلی گئی۔

اب تمام بزنس' کوٹھی اور بینک بیلنس عظمیٰ کو مل گیا۔ میرا اب زیادہ وقت لاہور میں عظمیٰ کے پاس ہی گزرتا تھا۔ میں ہر طرح سے اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا اور اس سے اپنی محبت جتاتا۔ اسی دوران میں اپنے گھر سے مکمل طور پر غافل ہو چکا تھا۔ شہناز مجھے فون کرتی تو اسے بری طرح جھڑک دیتا اور دفتری مصروفیات کا بہانہ بنا دیتا۔ جب کئی کئی روز



بعد سرگودھا اپنے گھر آتا تو شہناز مجھ سے غیر حاضری کی شکایت کرتی تو میں اسے جھاڑ دیتا۔ امجد اور اس کی والدہ نے بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کی تو میں شہناز میں ہی کیڑے نکالتا اور اس وقت کو کوستا جب میں نے شہناز سے شادی کی تھی۔ جب عظمیٰ کی عدت پوری ہوگئی تو میں نے اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کردیا۔ اس نے کہا کہ میری پہلی بیوی کا کیا ہوگا؟ میں نے کہا کہ اُس کو طلاق دے دوں گا۔ اب تو میرا خواب پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ کروڑ پتی' خوب صورت جوان بیوہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں گرنے والی تھی۔ اب شہناز میرے کس کام کی تھی' تب عظمیٰ نے کہا کہ اپنے تمام معاملات نپٹا کر آ جاؤ' ہم شادی کر لیتے ہیں۔ میں نے سرگودھا آ کر سب سے پہلے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور شہناز سے دوٹوک بات کی کہ میں اسے طلاق دے رہا ہوں۔ میری بات پر وہ بہت روئی' میری منتیں کیں' میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کہنے لگی کہ میں بے شک دوسری شادی کرلوں مگر اسے طلاق نہ دوں مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے طلاق دے دی۔ وہ روتی ہوئی امجد کے گھر چلی گئی۔ میں نے اس کے جہیز کا سامان بھی اسے دے دیا پھر فوری طور پر بیس لاکھ روپے میں مکان فروخت کیا اور اگلے دن لاہور پہنچ گیا۔ چند روز بعد ایک مختصر اور باوقار تقریب میں ہمارا نکاح ہوگیا۔ میں نے عظمیٰ کو منہ دکھائی میں نئی زیرو میٹر پندرہ لاکھ روپے کی مالیت کی گاڑی اور پانچ لاکھ روپے کے کچھ زیور تحفے میں دیئے۔ اب میرے پاس کوئی پیسہ نہیں بچا تھا مگر مجھے کوئی افسوس نہ تھا کیونکہ جو کچھ عظمیٰ کا تھا' وہ اب میرا ہی تو تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہم نے خوب سیر و تفریح کی' پورا ایک مہینہ مری' کاغان' ایبٹ آباد' گلگت اور کراچی گھومے اور زندگی کا اصل لطف اٹھایا۔ میں بہت خوش تھا کیونکہ بغیر کسی محنت مشقت کے مجھے میری منزل مل گئی تھی۔ سیر سپاٹے سے فرصت ملی تو ہم دونوں نے مل کر بزنس کو سنبھالنا شروع کردیا۔ عظمیٰ' نعیم کی زندگی میں ہی آفس جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ بزنس کے تمام امور بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہی تھی کیونکہ وہ پڑھی لکھی بھی تھی۔ عظمیٰ نے سارا کاروبار میرے حوالے کرنے کی بجائے اپنے پاس رکھا۔ اس نے صرف ایک شعبے کا سربراہ مجھے مقرر کیا' باقی تمام معاملات' اکاؤنٹس وغیرہ اس کے انڈر میں تھے۔ بزنس کا سارا پیسہ عظمیٰ کے اکاؤنٹ میں جاتا تھا' مجھے اپنی ضرورت کے لیے عظمیٰ سے پیسے مانگنا پڑتے تھے۔ میں جتنی رقم مانگتا' وہ بخوشی دے دیتی۔ عظمیٰ گھر میں بھی اچھی بیوی ثابت ہو رہی تھی مگر میں اس کوشش میں تھا کہ سارا کاروبار میرے کنٹرول میں آ جائے لیکن عظمیٰ اس پر رضامند نہ تھی' وہ بزنس پر بھرپور توجہ دیتی جس کی وجہ سے کاروبار خوب پھیل رہا تھا اور ترقی کر رہا تھا۔ اسی طرح ہنسی خوشی عیش و عشرت میں تین سال گزر گئے۔ کاروبار سے خوب منافع مل رہا تھا مگر ہماری زندگی میں ایک بہت بڑا خلا تھا کہ ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے' عظمیٰ کو بچے کی شدید خواہش ہونے لگی تھی۔ جب وہ مجھ سے بات کرتی تو میں کہتا کہ اللہ کی مرضی پھر اُس کے شدید اصرار پر ہم نے اپنا میڈیکل چیک اپ کروایا۔ عظمیٰ تو بالکل نارمل تھی مگر جب میری رپورٹ آئی تو پتہ چلا کہ میں باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ اس میڈیکل رپورٹ سے میں بہت پریشان ہوگیا' کئی ڈاکٹروں کو دکھایا مگر سب نے مایوسی کا اظہار کیا۔ میں نے بہت سے حکیموں سے بھی علاج کے لیے رجوع کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ الٹا نقصان یہ ہوا کہ مختلف دوائیاں کھانے کی وجہ سے مجھے ہائی بلڈ پریشر رہنے

لگا۔ عظمیٰ بھی اب خاموش اور اداس رہنے لگی تھی۔ اسے اولاد کی شدید خواہش تھی۔ میں نے بہت سے عاملوں، پیروں، فقیروں سے رجوع کیا، کئی مزارات پر حاضری دی مگر کہیں سے میری مراد پوری نہ ہوئی۔ میں ڈپریشن کا شکار ہوگیا، رفتہ رفتہ میری صحت گرنے لگی اور پھر ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ مجھے شوگر کا مرض بھی لاحق ہو چکا ہے۔ اب میں بہت روتا اور گڑگڑاتا۔ اکثر سوچتا کہ جب شہناز اولاد کی آرزو کرتی تو میں اسے کہتا تھا کہ مجھے اولاد نہیں چاہیے، صرف دولت چاہیے اور آج بے پناہ دولت تھی مگر میں اولاد کی نعمت کو ترس رہا تھا۔ اب میں اُن لمحوں کو کوستا تھا جب میں کہا کرتا تھا کہ مجھے اولاد نہیں چاہیے۔ اس دکھ کی وجہ سے مجھ میں چڑچڑاپن آ گیا تھا، آفس میں معمولی معمولی باتوں پر اسٹاف کو جھاڑ دیتا، ان کی بے عزتی کر دیتا، مجھ پر شدید جھنجھلاہٹ طاری ہو جاتی، میرا رویہ روز بروز لوگوں سے خراب ہوتا گیا۔ عظمیٰ بھی اب مجھ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ ہر وقت ہنسنے مسکرانے والی عظمیٰ اب سنجیدہ رہتی تھی اور صبح سے رات گئے تک کاروباری معاملات میں مصروف رہتی۔ اس کی اس سنجیدگی اور مصروفیت سے مجھے شدید کوفت ہوتی اور اکثر ہماری نوک جھونک اور تلخی ہو جاتی۔ گھریلو ملازمین سے بھی میرا رویہ خراب رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں سب کے لیے ایک ناپسندیدہ انسان بن گیا ہوں۔ میرے بال تیزی سے سفید ہو رہے تھے اور گر رہے تھے، میرا شوگر لیول اور بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا تھا، رات کو نیند نہ آتی تھی، کئی کئی گولیاں کھاتا مگر تھوڑی دیر کے لیے سو پاتا۔ ایک روز دفتر میں ٹائپسٹ کی معمولی غلطی کی وجہ سے اُس کو بہت بے عزت کیا اور فوری طور پر اسے نوکری سے نکال دیا۔ جب عظمیٰ کو اس بات کا پتا چلا تو اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں اس سے بھی الجھ پڑا اور غصے میں گھر آ گیا۔ دو دن بعد آفس گیا تو اس ٹائپسٹ کو دفتر میں کام کرتے دیکھ کر میں اشتعال میں آ گیا اور اسے برا بھلا کہنے لگا اور خوب ہنگامہ مچایا۔ ملازم کہنے لگا کہ مجھے میڈم عظمیٰ نے نوکری پر رکھا تھا، ان کے حکم کے بغیر مجھے کوئی ملازمت سے نہیں نکال سکتا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری کوئی اوقات نہیں تھی۔ عظمیٰ گودام میں مال چیک کرنے گئی ہوئی تھی۔ میں غصے میں گھر آ گیا۔ اُس روز عظمیٰ شام کو جلدی گھر آ گئی۔ ہم ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ عظمیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے دفتر میں ہنگامہ کیوں مچایا تھا؟ ذرا سی بات پر کسی انسان کی بے عزتی کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ ابھی ہماری بات چیت ہو رہی تھی کہ خانساماں چائے لے کر آ گیا اور غلطی سے میری چائے کے کپ میں چینی ڈال دی۔ میں غصے سے جھنجلایا ہوا تو پہلے ہی تھا، فوراً چائے کا کپ اٹھا کر خانساماں پر پھینک دیا اور اس کو گالیاں دینے لگا۔ میری اس حرکت پر عظمیٰ کو غصہ آ گیا۔

''دیکھو، تم انسانوں والی حرکتیں نہیں کر رہے ہو، تم میں اور ایک جاہل، اجڈ، گنوار انسان میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' اس پر میں عظمیٰ سے الجھ پڑا اور اس کو بھی گالیاں دینے لگا۔

''میں جانور اور اجڈ ہوں، تمہیں شرم نہیں آتی کہ نوکروں کے سامنے میری بے عزتی کر رہی ہو؟''

''نوکر بھی انسان ہیں، جب تم اُن کی بے عزتی کرتے ہو تو کیا تمہیں شرم آتی ہے؟'' عظمیٰ کی اس بات پر میرا پارہ ہائی ہوگیا اور غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ میں نے عظمیٰ کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ گھریلو نوکر یہ سب دیکھ رہے تھے تھپڑ کھا کر عظمیٰ بھی غصے سے لال پیلی ہوگئی اور اُس نے بھی منہ میں جو کچھ آیا، کہہ دیا، مجھے خوب سنائیں، مجھے طعنے دیئے اور میری اوقات یاد دلائی۔ میں پاگل سا ہوگیا۔ میں نے میز پر رکھے سارے برتن توڑ دیئے اور غصے میں آگ بگولہ ہو کر عظمیٰ کو طلاق دے دی۔ پورے گھر میں ایک دم سناٹا چھا گیا اور عظمیٰ رونے لگی اور بیڈروم میں جا کر بیڈ پر گر گئی۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تو میں کمرے میں گیا اور اپنا ہاتھ عظمیٰ کے شانے پر رکھا۔ اُس نے فوراً میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

''میں اب نامحرم ہوں، خبردار جو مجھے چھونے کی کوشش کی.....'' اس نے مجھے کمرے سے باہر نکل جانے کو کہا۔ جب میں باہر آیا تو اُس نے اندر سے دروازہ لاک کر لیا۔ وہ رات میں نے گیسٹ روم میں کانٹوں پر گزاری۔

صبح عظمیٰ نے کہا۔ ''اب ہمارا کوئی رشتہ نہیں رہا، میں اب نامحرم ہوں اور ہم ایک چھت کے نیچے اکٹھے نہیں رہ سکتے۔'' اُس نے مجھے فوراً گھر چھوڑ دینے کا حکم دے دیا۔ مجھے اب ہوش آ چکا تھا، میں اُس کے آگے بہت گڑگڑایا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

''عظمیٰ.....! میں اب کہاں جاؤں گا؟'' میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''یہ سوچنا اب تمہارا کام ہے۔ تم واپس اپنے شہر لوٹ جاؤ۔'' پھر اُس نے اپنے گاؤں والا مکان مجھے دے دیا اور کچھ نقد رقم دے کر گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔

''میرے گاؤں چلے جاؤ اور اُس پرائیویٹ اسکول میں جہاں میں پڑھاتی رہی ہوں، اُس کے پرنسپل کو مل لو، وہ تمہاری نوکری کا بندوبست کر دے گا۔ میں اُسے فون کر دوں گی۔''

میں بوجھل دل سے اپنے شہر لوٹ آیا۔ اپنے محلے میں گیا، ہر چیز بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ اپنے پرانے گھر کے سامنے کھڑا ہو کر خوب رویا۔ امجد کے گھر دستک دی تو امجد کے بھائی نے دروازہ کھولا اور مجھے اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے امجد کی امی سے ملنے کا کہا تو امجد کے بھائی نے بتایا کہ جب میں نے شہناز کو طلاق دی تھی تو امی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں، انہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ ایک ہفتہ ہسپتال میں رہنے کے بعد اُن کی وفات ہوگئی۔ شہناز کی عدت پوری ہونے کے چھ ماہ بعد امجد نے اپنی محبت چھوڑ کر شہناز سے نکاح کر لیا اور پھر ایک سال بعد امجد کو سعودی عرب میں ایک بہت اچھی جاب مل گئی، وہ شہناز کو لے کر سعودی عرب چلا گیا۔ وہاں وہ کئی حج اور عمرے کر چکے ہیں۔ امجد کے دو خوبصورت بچے ہیں۔ اللہ نے اُن کو خوشحالی سے نوازا ہے۔ امجد کے تمام بہن بھائیوں کی شادی ہوگئی تھی اور اُن کے والد عمرہ کرنے امجد کے پاس گئے ہوئے تھے۔ میں وہاں سے اداس دل لے کر عظمیٰ کے گاؤں پہنچا۔ اُس کا مکان کھولا اور خود ہی صفائی ستھرائی کی۔ اگلے دن پرائیویٹ اسکول کے پرنسپل سے ملا۔ اُس نے بطور چپراسی مجھے رکھ لیا کیونکہ فی الحال اُس کے پاس اور کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ چاروناچار میں نے یہ ملازمت قبول کر لی۔ اب میں خود ہی اپنے سارے کام کرتا، خود ہی کھانا پکاتا اور دن رات اپنے ماضی کو یاد کر کے خوب روتا مگر مجھے نہ تو سکون ملتا اور نہ ہی قرار۔ چپراسی کی ڈیوٹی کرتے ہوئے میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ مجھے بہت شرم آتی ہے۔ شہناز سے کی گئی زیادتیاں یاد آتیں تو دھاڑیں مار مار کر روتا۔ امجد کی امی جنہوں نے ہمیشہ مجھے اپنے سگے بیٹوں کی طرح پیار کیا اور مجھے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی، وہ میری وجہ سے ہی فوت ہوئیں۔ میں بہت پچھتاتا کہ میں نے اتنے انمول اور پیار کرنے والے رشتوں کی قدر نہ کی، شہناز کی پاکیزہ اور سچی محبت کی قدر نہ کی اور دولت کی ہوس اور لالچ میں اتنا اندھا ہوگیا کہ آج اسی ہوس کی وجہ سے ذلت کی گہرائی میں گر گیا۔ عظمیٰ نے آخر دم تک مجھے

## دردِ دل

دردِ رگ رگ میں اُترا جارہا ہے
دل میرا آج ڈوبا جارہا ہے

یہ میرے ملک پہ کیسی نظر ہے
کہ ہر سمت ہی اندھیرا چھا رہا ہے

الٰہی ہر طرف ہے شور برپا
میرا گھر کیوں اُجاڑا جارہا ہے

کسی مزدور نے ہے کیا بگاڑا؟
کیوں اس کا گھر جلایا جارہا ہے

نہیں محفوظ ہے مسجد بھی اب تو
اسے بم سے اُڑایا جارہا ہے

گلی میں کھیلتے بچے ہیں کم سن
انہیں گولی سے بھونا جارہا ہے

ہر طرف خون ریزی، بم دھماکے
ہر طرف خون بکھرا جارہا ہے

مرے چہار سو ہے خون بکھرا
دل بھی اب خون روتا جارہا ہے

خودکشی کررہا ہے کوئی بے بس
کہیں بچوں کو بیچا جارہا ہے

مرے اقبال نے جو خواب دیکھا
وطن تعبیر کھوتا جارہا ہے

بتولؔ اب تو یہی خواہش ہے میری
نہ ہو اب تک جو ہوتا آرہا ہے

نازیہ بتولؔ رضا

اپنا مجازی خدا سمجھا مگر میں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ یہ سب میری زیادتیوں اور بداعمالیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ میں صاحب سے چپراسی بن کر ایک پسماندہ گاؤں میں اپنی دوسری بیوی کا خیرات کی صورت میں دیئے ہوئے گھر میں تنہائی اور بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ عظمیٰ مجھے بہت یاد آتی' اس گھر کے درودیوار سے اُس کی خوشبو آتی تھی۔ اسی کسمپرسی میں ایک سال گزر گیا' میری شوگر انتہائی خطرناک لیول پر پہنچ گئی' نتیجتاً میرے دونوں گردے فیل ہوگئے ہیں اور اب میں لاوارث سا ہسپتال میں پڑا ہوں۔''

اپنی روداد سنا کر احسن شہزاد بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا اور مجھ سے التجا کی کہ یہ کہانی لکھ کر کسی ڈائجسٹ میں شائع کرواؤں تاکہ لوگ پڑھ کر عبرت حاصل کریں۔ ہوسکتا ہے کہ شاید شہناز کی نظر سے یہ کہانی گزرے اور وہ مجھے معاف کردے۔

احسن شہزاد نے اپیل کی تھی کہ اگر شہناز یہ کہانی پڑھے تو مجھے صدقِ دل سے معاف کردے۔ شاید اس کی پشیمانی دور ہوجائے اور اس کی روح کو قرار مل جائے۔ اُس روز میں احسن شہزاد سے جلد دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے واپس چلا آیا مگر اپنی مصروفیات کی وجہ سے ہسپتال نہ جاسکا۔ تقریباً دس روز بعد ہسپتال گیا تو مجھے احسن شہزاد کہیں نظر نہ آیا۔ ہسپتال کی انتظامیہ نے بتایا کہ پانچ روز پہلے اُس کا انتقال ہوگیا تھا۔ اُس کی میت لینے کے لیے کوئی نہ آیا اور لاش لاوارث پڑی رہی' تب ایک رفاحی ادارے نے اُس کی کفن دفن کا انتظام کیا۔ اس طرح احسن شہزاد کی کہانی ختم ہوئی۔ اب میں اُس سے کیا وعدہ پورا کررہا ہوں اور یہ کہانی لکھ دی ہے۔ اگر شہناز کی نظر سے یہ کہانی گزرے تو اُس سے التجا ہے کہ وہ احسن شہزاد کو دل سے معاف کردے۔

☆☆



نزہت جبین ضیاء

# وہ ایک بوجھ

سعدیہ حریم کا خیال

سزا جو مجھ کو ملی ہے وہ کس خطا پہ ملی
یہ اہلِ عقل پہ عقدہ نہیں کھلا اب تک

**رشتوں کی ڈور سے بندھی وہ ایک بیٹی تھی اور یہی اس کا قصور تھا**

دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ ابھی کچھ دیر میں ہی بچے اسکول سے آنے والے تھے۔ میں لنچ تیار کر کے ظہر کی نماز سے فارغ ہوئی تھی کہ بچے آ گئے۔ ابھی ٹیبل پر کھانا لگایا تھا کہ اچانک گلی سے عجیب قسم کی چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔

''مما.....! کیا ہوا ہے باہر؟'' سب سے چھوٹے التمش نے پوچھا۔

''میں دیکھتی ہوں' تم لوگ کھانا کھانے بیٹھو۔'' یہ کہتی ہوئی میں باہر کی طرف چل دی' تب ہی ہماری کام والی ماسی حواس باختہ سی اندر آئی۔

''باجی.....! باجی.....! آپ کی پڑوسن ہیں ناں' صالحہ بی بی' انہوں نے خودکشی کی ہے۔''

''ہائیں.....'' میں دیوانہ وار باہر کی جانب لپکی۔ احمد صاحب کے گھر میں ہنگامہ سا بپا تھا۔ احمد صاحب' ان کے چاروں بیٹے' دو بہوئیں اور ان کی بیگم دھاڑیں مار رہے تھے۔ میں لوگوں کی بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھی۔

اف خدایا.....! وہ منظر شاید ہی بھول سکوں' صالحہ کمرے کی دیوار کے ساتھ چپکی کھڑی تھی' اس کا پورا جسم تقریباً جل چکا تھا' چہرہ بھی متاثر تھا۔ اس کے بھائی اور باپ اس کو ہسپتال لے جانا چاہ رہے تھے مگر وہ اس حالت میں کسی کو قریب نہیں آنے دے رہی تھی' اس کی آنکھوں میں بے بسی اور مُردنی سی تھی۔ مجھے دیکھ کر لمحے بھر کو اس کی آنکھوں میں روشنی سی آئی۔ میں اپنی تمام ہمتیں جمع کر کے آگے بڑھی۔

''پلیز صالحہ! ہسپتال چلو۔'' میں نے اس سے التجا کی۔

''نہیں..... مجھے نہیں جینا ہے..... آپا.....! تم جانتی ہوں ناں' ان سے کہو..... ان سب..... سے کہہ دو' ڈرامہ نہ کریں..... اب..... تو قصہ ختم..... اب کیوں رو رہے ہیں.....؟ سب سے بڑا بوجھ..... ختم..... بس..... قصہ ختم..... قصہ ختم.....'' اس نے میری جانب ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی اور اسی لمحے اس کا ناتا اس ظالم دنیا سے ٹوٹ گیا۔

''صالحہ.....!!'' ضبط کے باوجود دلخراش چیخ بلند ہوئی اور میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ گھر میں ہر طرف آہوں' سسکیوں اور چیخوں کا طوفان ابلنے لگا اور میں اپنے بکھرے وجود کو بمشکل گھسیٹتی ہوئی گھر واپس آ گئی۔

''مما.....! مما.....! کیا ہوا؟ مما.....! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' میرے بچے مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ تیرہ سالہ کسوئی جو سب سے بڑی تھی' میرے لیے Cal-C گھول کر لے آئی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''بیٹا.....! صالحہ آنٹی..... کا انتقال ہو گیا۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''ہائیں.....!'' کسوئی بھی شاکڈ ہو گئی۔

تدفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں ایک کونے میں بیٹھی صالحہ کے بھائیوں' اماں اور ابا کو دیکھ رہی تھی۔ آج سارے تڑپ رہے تھے' بلک رہے تھے' صالحہ کی میت سے معافی مانگ رہے تھے لیکن کل تک تو وہ سب پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ اُس کا جنازہ تیار ہو چکا تھا۔ میں سیپارہ لے کر بیٹھی تھی۔ میری آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں ایک بے بس لڑکی کی بے بس موت پر کہ جسے اپنوں نے بوجھ سمجھا۔

''جنازے کا دیدار کر لیں۔'' مجمع سے کسی نے آواز لگائی۔ لوگ آگے کی طرف بڑھے۔ میں خاموشی سے اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دی۔ مجھ میں اس کا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں تھی' میں کیا دیکھتی؟ کس منہ سے دیکھتی؟ میں..... میں بھی کچھ نہ کر سکی



اس معصوم لڑکی کے لیے۔ دل پہ بھاری بوجھ لیے شکستہ قدموں سے میں گھر میں داخل ہوئی۔ بیٹی کسوئی نے میرے شوہر کو فون کر کے بلا لیا تھا تاکہ وہ تدفین میں شرکت کر سکے۔ میں مستقل رو رہی تھی۔ صالحہ کا معصوم چہرہ' اس کی باتیں' اس کی بے بس آنکھیں' اس کی باتوں میں چھپی مایوسی' اس کا ایک ایک انداز' ایک ایک حرکت مجھے تڑپا رہے تھے۔ میں خود پر قابو نہ رکھ سکتی تھی۔ بچے پریشان تھے' تب مجھے احساس ہوا' التمش اور عائشہ جو چھ اور آٹھ سال کے تھے' مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہمت کی اور باتھ روم جا کر بہت سارا رو لیا پھر منہ دھو کر باہر آئی تو خود کو قدرے نارمل کیا۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ نمیر بھی میری کیفیت سے واقف تھے مگر وہ بھی چپ سے تھے کہ اگر مجھ سے کچھ کہتے تو یقیناً میں اپنا ضبط کھو بیٹھتی۔

رات کو بستر پر لیٹی تو صالحہ ایک بار پھر شدت سے یاد آئی اور میں منہ چھپا کر بے آواز رونے لگی۔ نمیر اکیلے تھے اور ابو جی کے آفس میں جاب کرتے تھے۔ ابو جی کو نیک' سیدھے اور شریف نمیر بہت پسند تھے اور نمیر بھی ابو جی کی بہت عزت کرتے تھے' یوں انہوں نے ابو سے مجھے مانگا اور ہماری شادی ہو گئی۔ متوسط طبقے کی آبادی میں نمیر کا چھوٹا سا گھر تھا جسے ہم دونوں نے باہم محنت اور محبت سے سنوارا تھا۔ زندگی بہت مطمئن گزر رہی تھی۔ بچوں کی صورت میں پہلے کسوئی پھر عائشہ اور پھر التمش نے ہمارے گھر کی رونقیں بڑھا دی تھیں۔ محلے کے تمام لوگ اچھے اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ پانچ سال پہلے پڑوسی رمضان صاحب کی فیملی سعودی عرب منتقل ہوئی تو اُن کا گھر احمد صاحب نے خرید لیا۔ احمد صاحب کی فیملی' اُن کی بیوی' چار بیٹے اور ایک بیٹی صالحہ پر مشتمل تھی۔ اُس روز میں سبزی لے رہی تھی کہ پڑوس کی آنٹی بھی باہر آ گئیں۔

''السلام علیکم!'' میں نے کہا۔

''جیتی رہو! کیسی ہو بیٹی؟ کبھی آؤ ناں۔'' انہوں نے دعوت دے ڈالی۔

''جی آنٹی.....! ٹائم نہیں ملتا' آپ آئیں ناں۔'' میں نے جواباً کہا' تب ہی ایک چوبیس' پچیس سالہ لڑکی بھی دروازے سے جھانکنے لگی۔ سیدھی سادی' عام سی شکل وصورت اور اداس آنکھیں۔

''یہ بیٹی ہے آپ کی؟''

''ہاں' بیٹی ہے میری' صالحہ..... اور چار بیٹے ہیں۔'' خاتون نے جلدی سے کہا۔

''اچھا! آؤ ناں صالحہ! کبھی ٹائم نکال کر' میں اکیلی ہی ہوتی ہوں گھر پر۔'' نہ جانے کیوں پہلی نظر میں ہی لڑکی سے میرا بات کرنے کو جی چاہا۔

''جی' ضرور۔'' کہہ کر وہ جلدی سے واپس مڑ گئی اور میں بھی سبزی کا شاپر لیے اندر آ گئی۔

دوسرے دن میں کپڑے پھیلانے چھت پر گئی تو وہ بھی آ گئی۔

''آپا.....! کیسی ہو؟'' اس نے آواز لگائی۔

''اچھی ہوں..... تم کیسی ہو؟'' میں بھی مسکرائی۔

''آپ کے بچے بہت پیارے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''اچھا! شکریہ۔'' میں خوشدلی سے بولی۔

پھر وہ اکثر ہمارے گھر آنے لگی۔ میں نے ایک بات محسوس کی' وہ بولتے بولتے چپ ہو جاتی تھی' اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر جاتی تھیں۔

ایک روز میں نے باتوں باتوں میں کہا۔

''صالحہ.....! تم..... التمش اور عائشہ کو اتنا پیار کرتی ہو' کل کو تمہاری شادی ہو جائے گی تو..... میں تو پریشان

ہو جاؤں گی۔'' اُس وقت وہ عائشہ کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

''شادی..... نہیں آپا.....! میری شادی کہاں ہوگی بھلا؟'' اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔

''وہ کیوں بھلا؟'' میں چونکی۔

''اچھا آپا.....! میں چلوں' اماں کی چائے کا ٹائم ہوگیا۔'' وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور میں الجھ سی گئی۔

پھر کافی دن وہ نہیں آئی۔ میں نے سوچا' میں اُس کی خیریت معلوم کرنے جاؤں گی لیکن اُسی روز وہ خود آ گئی۔

''کہاں تھیں تم؟'' میں نے خفگی سے کہا۔

''وہ..... بیمار تھی میں.....'' اس نے کہا۔

اُس کے چاروں بھائی کسی فیکٹری میں معمولی سی جاب کرتے تھے۔ احمد صاحب کسی دکان پر بیٹھتے تھے لہٰذا اُن کی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی' بس ٹھیک ہی تھی۔ ایک روز میں نے پھر اُسے چھیڑا۔

''صالحہ.....! تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی ہو؟ تم اکیلی ہو' تمہارے چار بھائی ہیں' انکل ہیں پھر؟''

''کرنا کون نہیں چاہتا آپا.....! مگر کیسے ہو؟ کوئی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ بھائیوں کو اپنے اپنے گھر بسانے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے' ابا کے پاس اتنا نہیں ہے اور..... اور..... میں اکیلی..... نہیں آپا! مجھ سے چھوٹی بہن بھی تھی' طاہرہ جس نے بھاگ کر شادی کر لی' تب ہی تو ہم وہ محلہ چھوڑ کر آ گئے ہیں۔ آپا.....! وہ بہادر تھی..... میں..... میں بہت کمزور ہوں ناں' ابھی پچھلے دنوں ساتھ والی آنٹی صغریٰ بھی اپنے دیور کا رشتہ لے کر آئی تھیں مگر ابا نے کہہ دیا کہ ابھی نہیں کرنی شادی' ہمیشہ ابا اور بھائیوں میں میری شادی کے معاملے پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ میں..... میں..... بوجھ ہوں اُن پر.....'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''یہ..... یہ..... کیا کہہ رہی ہو تم؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' مجھے حیرت تھی۔ بھائی تو کتنی چاہت' کتنے ارمانوں سے بہنوں کی ڈولیاں سجاتے ہیں' انہیں قرآنِ پاک کے سائے میں رخصت کرتے ہیں اور یہاں چار چار بھائی تھے' باپ تھا اور..... اور..... ''پلیز صالحہ.....! رونا بند کرو.....'' میں نے اُسے پانی پلایا پھر ایک روز اُس کا رشتہ آیا اور بات طے ہوگئی۔ اُس روز صالحہ بہت خوش تھی۔ میں نے اُس کو پہلی بار اس طرح ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ میں بھی بہت خوش تھی اور اُس کو خوب ساری دُعائیں دی تھیں۔

ایک روز سننے میں آیا کہ اُس کے دو بھائیوں نے لڑکیاں پسند کر لی ہیں اور رشتہ طے ہوگیا ہے لیکن بھائی چاہتے تھے' پہلے اُن کی شادیاں ہوں' بعد میں صالحہ کی کیونکہ پیسا اتنا نہیں تھا کہ تینوں بہن بھائیوں کی شادی ایک ساتھ ہوتی پھر اُن کے گھر میں دو بھابیاں آ گئیں۔ صالحہ کا رشتہ طے ہوئے بھی کافی ٹائم ہوگیا تھا' اب اُدھر سے شادی کا اصرار تھا لیکن یہاں پر تو پائی پیسا ہی نہ تھا۔ آئے دن گھر میں بھائیوں اور باپ میں جھگڑے ہوتے۔ ہر کوئی اپنا دامن جھٹک کر دوسرے پر ذمہ داری ڈال دیتا۔ صالحہ نے سلائی شروع کر دی تھی لیکن وہ کہاں تک اور کتنی رقم جمع کر سکتی تھی؟ روز روز کی چخ چخ سے وہ تنگ آ جاتی' گھنٹوں میرے پاس بیٹھتی۔ میں اُسے تسلیاں دیتی' اُسے آنے والے اچھے دنوں کے جھوٹے خواب دکھاتی اور اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں بے بسی عود کر آتی مگر میں کیا کر سکتی تھی سوائے دُعا کے؟

اُس روز اُس کے گھر میں اس کی شادی کے مسئلے پر خوب جھگڑا ہوا تھا۔ صبح صبح بھائیوں میں تلخ کلامی بڑھی تو ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی' مسئلہ وہی تھا' مالی وسائل کی کمی کا۔ آخر میں احمد صاحب نے کہہ دیا کہ لڑکے والوں سے کہہ دو' ہمیں شادی نہیں کرنی۔

اُس شام وہ آئی تو بہت اداس تھی۔ ''آپا.....! ہم لڑکیوں کے نصیب اچھے کیوں نہیں ہوتے؟ ہم دنیا میں آتے ہی کیوں ہیں؟ اگر ہم اپنے سگوں پر' اپنے پیاروں پر بوجھ بن جائیں تو ہمارا مر جانا ہی بہتر ہے ناں.....''

''پاگل ہوئی ہو کیا؟ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا سب۔'' میں نے کہا۔

''نہیں آپا.....! کچھ اچھا نہیں ہونے والا۔ آپا.....! میں..... کتنی بدنصیب ہوں ناں؟ کتنی بے بس اور لاچار..... میں اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتی ناں' کاش..... کاش میں طاہرہ جیسی ہوتی.....'' اور کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔

اور دوسرے دن اُس نے اِس ظالم دنیا کو چھوڑ دیا..... کیا کرتی جی کر؟ زندہ رہتی تو کس لیے؟ وہ تو ایک ایسا بوجھ تھی جو مصیبت کی صورت میں باپ اور بھائیوں کے شانوں پر دھرا تھا اور وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے پہلو تہی کر رہے تھے۔ اس میں بھلا بے چاری صالحہ کا کیا قصور تھا؟ وہ اپنی مرضی سے تو نہیں آئی تھی دنیا میں؟

''آپا.....! میں بے کار ہوں' میں بوجھ ہوں' میں سب کے لیے مسئلہ ہوں ناں' نہ میں رہوں گی نہ مسائل ہوں گے۔'' اُس کے لبوں سے نکلے اِن آخری الفاظ کی گونج سے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اُس وقت اذانِ فجر ہو رہی تھی۔ میں دوپٹے سے آنکھیں پونچھتی ہوئی نمیر اور بچوں کو اٹھانے چل دی۔ دل کا بوجھ ہنوز اُسی طرح برقرار تھا۔

☆☆

## غزل

دریا مجھے ملتے ہیں سمندر نہیں ملتے
ہر سمت مجھے درد کے لشکر نہیں ملتے

ہیں مدِمقابل بھی مرے شہر کے بونے
یہ لوگ مرے قد کے برابر نہیں ملتے

کیوں ہاتھ لکیروں میں انہیں دیکھ رہی ہوں
کیوں اُن سے ہمارے یہ مقدر نہیں ملتے

ہم لوگ فقط اُن کی محبت کے طلب گار
ہم جیسے زمانے میں سکندر نہیں ملتے

میں آج بھی حیرت میں کھڑی سوچ رہی ہوں
ہر شخص کے ہاتھوں میں یہ پتھر نہیں ملتے

مقفل ہیں دریچے بھی بہت دیر سے فوزی
کیوں شہرِ محبت میں وہ اکثر نہیں ملتے

فوزیہ احسان رانا

سید ابو محمد آزاد

# خود پرستی سے جو نکلے

منیر نیازی کا خیال

دل کی خلش تو ساتھ رہے گی تمام عمر
دریائے غم کے پار اتر جائیں ہم تو کیا

**اُس خود پرست لڑکی کا قصہ جسے صرف اپنی ذات ہی عزیز تھی**

ہر چیز کی زیادتی خراب ہوتی ہے۔ والدین کی بے جا محبت سے بھی بچے خودسر اور سرکش بن جاتے ہیں' ایسے بچے خودستائشی میں مبتلا ہو کر احساسِ برتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بے شک والدین کے لیے سب سے عزیز اور قیمتی شئے اولاد ہی ہے۔ یہی والدین' بچے کے معمار ہوتے ہیں۔ آغازِ زندگی میں بچوں میں جیسی عادت ڈالی جائے گی' ویسی ہی اس کی شخصیت کی عمارت کھڑی ہوگی۔ والدین کی غلط انداز سے اپنی اولاد کی پرورش و تربیت سے کس طرح زندگی اجیرن بن جاتی ہے اور والدین کس طرح جیتے جی مر جاتے ہیں' ذیل کی کہانی اس حوالے سے ایک سبق ہے۔

منظور کے گھر میں ایک مدت بعد چاند سی خوبصورت بچی پیدا ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی اس کی پیدائش پر بہت خوش تھے۔ جب بچی سوا ماہ کی ہوئی تو منظور نے خاندان بھر کے لوگوں کو کھانے کی دعوت پر بلایا۔ گھر کو جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے سجایا گیا۔ اس تقریب میں بچی کا نام ماہ نور رکھا گیا۔ مہمانوں نے بچی کو تحفے تحائف دیئے اور اسے لمبی عمر کی دُعائیں بھی دیں۔

یوں دل بہلانے کے لیے اللہ نے ماہ نور کی صورت میں منظور اور اُن کی بیگم کو ایک کھلونا عطا کر دیا تھا۔ دونوں میاں بیوی اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ یہ بچی اپنے ماں باپ کی آنکھ کا تارا بن گئی تھی۔ اس کے لیے نت نئے قسم کے کھلونے آتے' طرح طرح کے ننھے منے جوڑے اس کے لیے تیار کیے جاتے۔ جب ماہ نور کچھ شعور کی منزل تک پہنچی تو طرح طرح کی فرمائشیں اپنی توتلی زبان سے کرنے لگی۔ والدین بہت محظوظ ہوتے۔ زندگی کا پہیہ چلتا گیا اور ماہ نور کے نخرے بھی بڑھتے گئے' مجال نہیں کہ وہ کسی چیز کی فرمائش کرے اور منظور صاحب اسے پورا نہ کریں۔ وہ اپنے ماں باپ کے دل پر راج کر رہی تھی۔ قدرت کا عجب کھیل' بیگم منظور چند دنوں کی علالت کے بعد اچانک اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ یہ صدمہ منظور صاحب کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ان کو سنبھالنے کے لیے کوئی اور نہیں تھا سوائے ننھی منی سی بچی ماہ نور تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بے حد جڑے ہوئے تھے کہ ان ہی جیسے میاں بیوی کے لیے کہا گیا ہے کہ میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں' اگر دونوں میں ذہنی ہم آہنگی ہو تو زندگی کی گاڑی خوب خوش اسلوبی سے چلتی ہے۔ ماہ نور تھی تو چار سال کی لیکن حالات نے اس کو بہت سمجھدار بنا دیا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے پاپا سے چمٹی رہتی' اپنی پیاری پیاری باتوں سے انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اس طرح ان کا دل بہلتا رہتا۔ بیگم کے اس دنیا سے چلے جانے پر منظور صاحب کا مسکراتا چہرہ بے شک اب افسردہ نظر آتا تھا لیکن ان کو اداسیوں سے نکالنے کے لیے دوست احباب تھے۔ ایک دن ان کے دوست اکبر ان کے پاس آئے اور ان کو دوسری شادی کرنے کے لیے تیار کر لیا۔

منظور صاحب کا عقدِ ثانی ایک شریف گھرانے کی خاتون سے کر دیا گیا۔ یوں منظور صاحب کی تنہائی جاتی رہی اور ماہ نور کو بھی ایک ماں مل گئی تھی۔ آنے والی ماں کے حسنِ سلوک سے ماہ نور اپنی حقیقی ماں کا غم بھول گئی تھی۔ وہ اپنی نئی ماما سے جو فرمائش کرتی' وہ آسانی سے پوری ہو جاتی نتیجتاً اس بے جا لاڈ و پیار سے وہ خود پرستی کا شکار ہو گئی۔ محبت و پیار پر وہ صرف اپنا حق سمجھنے لگی۔ ماہ نور کو اپنے ماں باپ کے درمیان محبت و پیار بھی برا لگنے لگا تھا۔ وقت کی

سوئی آگے بڑھتی گئی' ماہ نور نے میٹرک پاس کرلیا تو منظور صاحب کو بیٹی کی شادی کی فکر ہوئی۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی بیگم سے مشورہ کیا تھا۔

منظور صاحب نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے دفتر شادیات سے بھی رجوع کرلیا تھا۔ اس حوالے سے ماہ نور بھی باخبر تھی۔ ایک دن گھر کی بیل بجی تو سامنے دفتر شادیات کے وحید صاحب کھڑے تھے۔ منظور صاحب نے اُن کو اندر بٹھایا۔

وحید صاحب نے بہت معذرت خواہانہ انداز میں منظور صاحب سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ آپ کی بیٹی کا اب تک کوئی معقول رشتہ نہ مل سکا۔ فی الحال دو حہ سے ایک صاحب کا رشتہ ہے۔ لڑکا شادی شدہ' بال بچے دار ہے۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا اپنا کاروبار ہے۔ کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے سوائے والدین کے۔ اس کے والدین حیات نہیں ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کو حقیقی والدین جیسی محبت دے تو وہ اُن کو تاحیات ایک نیک فرماں بردار بیٹا بن کر دکھائے گا۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو اس رشتے کے لیے بات آگے بڑھاؤں؟'' وحید صاحب نے جواب طلب نظروں سے منظور صاحب کو دیکھا۔

''دیکھیے وحید صاحب! اس رشتے میں بظاہر تو کوئی خرابی نظر نہیں آرہی' تاہم میں اپنی بیٹی کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر آپ کے پاس لڑکے کی تصویر وغیرہ ہو تو دے دیں۔'' وحید صاحب تصویر اپنے ہمراہ لائے تھے جو انہوں نے فوراً منظور صاحب کو دے دی۔

تصویر میں شفیع خاصا خوش شکل نظر آرہا تھا۔ اس تصویر کو گھر کے تمام لوگوں نے دیکھا۔ ماہ نور نے بھی اس تصویر کو دیکھا تو شفیع اس کے دل میں گھر کر گئے۔

چنانچہ جب منظور صاحب نے اس کی مرضی معلوم کی تو اس نے شرماتے' جھجکتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار کردیا۔

اس اقرار پر چند دنوں میں جھٹ پٹ ماہ نور اور شفیع رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ شفیع ایک ماہ کی چھٹی پر کراچی آیا تھا اور یہ ایک مہینہ سیر و تفریح میں یوں گزر گیا کہ پتا ہی نہ چلا پھر شفیع کی واپسی کا وقت قریب آیا تو ماہ نور کا چہرہ اترا ہوا تھا مگر جانا تو تھا' سو وہ چلا گیا۔

شفیع کو گئے ہوئے چار دن ہو چکے تھے مگر اس کی کوئی کال نہیں آئی تھی۔ گھر والوں کو اس کی کال کا شدت سے انتظار تھا۔ نئی نئی شادی کا خیال کرتے ہوئے منظور صاحب کے گھر سے شفیع کو فون کرنا مناسب نہیں سمجھا جارہا تھا۔ ماہ نور کے دل کی کیفیت تو سب سے جدا تھی' وہ اداس اداس سی تھی پھر ایک روز شفیع کا فون آیا تو وہ کھل پڑی' اس نے بہت جذباتی انداز میں ریسیور کو ہاتھ میں لیا اور چپکے چپکے وہ سب اپنے محبوب شوہر کو سنا دیا جو اس کے دل پر گزر رہی تھی۔

ماہ نور اپنی شادی سے پہلے گریجویشن کرنا چاہتی تھی لیکن اب فرصت ملی تو اس نے کالج میں داخلہ لے لیا اور وہ مصروف ہوگئی۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا' زندگی بہت خوشگوار گزرنے لگی تھی۔ شفیع کے فون کا آنا جانا بھی لگا ہوا تھا۔ اسی طرح تین ماہ گزر گئے۔

ایک صبح دروازہ کی گھنٹی بجی' دروازہ کھلا تو سامنے شفیع اپنے سامان کے ساتھ کھڑا تھا۔

گلابو بوا دوڑی دوڑی بیگم منظور کے پاس آئی اور کہا۔ ''دولہا بابو آئے ہیں۔'' ماہ نور دروازے کی طرف لپکتے ہوئے گئی۔ اس کے دل میں خوشی کے لڈو



پھوٹ رہے تھے۔ بیگم منظور نے شفیع کی خیر خیریت کے بعد اس کی اچانک آمد کے متعلق پوچھا۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں آپ لوگوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا' میں یہاں ایک ماہ کی رخصت پر آیا ہوں۔'' اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''انکل (منظور صاحب) کہاں ہیں؟''

''وہ آفس گئے ہوئے ہیں۔'' بیگم منظور نے جواب دیا اور وہاں سے اٹھتے ہوئے انہوں نے ماہ نور کو اشارہ کیا کہ وہ شفیع کو اپنے کمرے میں لے جائے۔ کچھ دیر بعد ماہ نور واپس آکر شفیع کے لیے ناشتہ لے گئی۔ دونوں چھوٹی بہنیں نجمہ اور سلمٰی بھی اپنے بہنوئی کے پاس کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈھیر سارے تحفے لے کر ماہ نور اپنی امی کے پاس آئی اور سوٹ کیس سے کپڑے نکال کر دیتے ہوئے اپنی امی سے کہا۔

''ایک سوٹ آپ کے لیے اور ایک سوٹ کا کپڑا ابو کا ہے۔ کھلونے اور ٹافیاں نجمہ اور سلمٰی کے لیے ہیں اور یہ جوڑے گلابو بوا کے ہیں۔'' تحفے دیکھتے ہوئے بیگم منظور نے شفیع کا شکریہ ادا کیا۔

شفیع کی آمد سے گھر میں رونق آگئی تھی اور ہر وقت گھر میں قہقہے گونجتے تھے۔ روز کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے کا پروگرام بنتا تھا۔ ان سیر سپاٹوں میں شفیع کا زیادہ تر وقت اپنے ساس سسر اور دونوں چھوٹی سالیوں کے ساتھ گزرتا تھا جس پر ماہ نور خفا خفا سی نظر آتی تھی' اسے گوارا نہیں تھا کہ اس کے شوہر کے پیار میں کوئی حصہ دار بنے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی' بس یہ اس کی اپنی سوچ تھی۔

اُس روز بھی جب سب لوگ سمندر کی سیر سے رات کو واپس لوٹے تو سسر اور داماد یعنی منظور صاحب اور شفیع کافی دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اس دوران ماہ نور بے چینی کے عالم میں بار بار اپنے کمرے سے باہر آتی رہی اور شفیع کو دیکھ کر پھر واپس چلی جاتی تھی۔ منظور صاحب کو ماہ نور کی بے چینی کا اندازہ ہوگیا تھا۔ انہوں نے اٹھتے ہوئے داماد سے کہا۔

''اچھا میاں! پھر باتیں ہوں گی۔'' شفیع بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کمرے سے ماہ نور کی ناراضگی کی آواز آنے لگی تھی۔ شفیع یہ کہتے ہوئے سنے جارہے تھے کہ تمہارے ابو کی باتوں میں اپنے والد جیسا مزہ محسوس کررہا تھا' اس وجہ سے آنے میں دیر ہوئی۔

دوسرے دن شفیع ناشتہ کے بعد اپنی دونوں سالیوں نجمہ اور سلمٰی کو بازار لے کر گئے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شفیع بہت اچھا انسان تھا۔ اس نے دونوں سالیوں کے لیے ڈھیر سے کھلونے اور قیمتی کپڑوں کے جوڑے خریدے۔ انہیں الہ دین پارک میں گھمایا' خوب سیر سپاٹے کیے' واپس آئے تو گھر والے اتنا سامان دیکھ کر حیران رہ گئے۔ نجمہ اور سلمٰی اپنے کھلونے لیے ماہ نور کے پاس گئیں۔

''اپیا' اپیا' آج جی جو بھائی نے ہم دونوں کو خوب سیر کرائی اور دیکھیے ناں' اتنے سارے کھلونے دلائے اور ہاں اپیا' ہم دونوں کو بہت خوبصورت جوڑے بھی دلائے ہیں۔ جی جو بہت سوئیٹ ہیں۔'' ماہ نور یہ باتیں سن کر صرف ہاں ہوں کرتی رہی تھی۔

منظور صاحب اتنے کھلونوں کو دیکھ کر بولے۔

''آخر اتنی فضول خرچی کیوں؟''

''نہیں' یہ تو ان بچیوں کا حق ہے۔'' شفیع نے

کہا۔ بچیاں اپنے تحفے دیکھنے میں مگن تھیں۔ منظور صاحب اور شفیع بھی انہیں خوش دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے پھر دونوں سسر داماد ایسے باتوں میں گم ہوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ شفیع اپنے کمرہ میں بھی نہ جاسکا اور اس دوران رات کا کھانا لگا دیا گیا تھا پھر رات گئے وہ اپنے کمرے میں گیا جہاں ماہ نور منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

دوسرے دن شفیع ناشتے پر کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ منظور صاحب نے اپنے داماد سے پوچھ ہی لیا کہ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں' گزشتہ رات سونے میں دیر ہوگئی تھی۔'' شفیع نے جواب دیا۔

منظور صاحب نے مزید پوچھا۔ ''آج کا کیا پروگرام ہے؟''

''آج میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں باہر جاؤں گا۔'' شفیع نے کہا۔ ماہ نور کے چہرے سے تناؤ معلوم ہو رہا تھا' وہ کبھی اپنے والد کو اور کبھی اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ شفیع ناشتے سے فارغ ہو کر باہر چلا گیا اور ماہ نور اپنے کمرے میں۔ ''ہفتہ کی رخصت پر ہیں۔'' منظور صاحب کی بیگم ان کے قریب آ کر ماہ نور کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''معلوم ہوتا ہے' گزشتہ رات بھی دونوں میاں بیوی میں جنگ ہوئی ہے۔ ماہ نور کی بدمزاجی سے میں بہت خوف زدہ ہوں' دونوں کی گاڑی چلتی ہوئی نظر نہیں آتی۔''

''کیوں' آخر وجہ کیا ہے؟ شفیع بہت محبت کرنے والا' ملنسار انسان ہے۔ میرے پاس جب بھی وہ بیٹھا' ہمیشہ اس نے خلوص' محبت سے بات کی ہے۔ اس کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرماں بردار بیٹا ہم سے ہم کلام ہے۔'' منظور صاحب نے



دل بہت پریشان تھا۔ منظور صاحب بھی ان حالات سے بے خبر نہیں تھے' وہ جانتے تھے کہ ان کی بے جا محبت سے ماہ نور خود پرست' خودسر اور خود ستائشی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے علاوہ کسی اور کو شفیع کی محبت کا حق دار نہیں مانتی حتیٰ کہ اس کی محبت کا تیسرا حق دار منظور صاحب ہی کیوں نہ ہوں۔ شفیع کو گئے ہوئے دوسرا روز تھا کہ ایک رجسٹری آئی جو ماہ نور کے نام تھی۔ گلابو بوا کے ہاتھوں سے رجسٹری لیتے ہوئے ماہ نور جان گئی تھی' اس میں کیا ہے۔ لفافہ کھول کر دیکھنے سے ماہ نور کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا' اس میں ماہ نور کو شفیع کی طرف سے دی گئی طلاق تھی۔ یہ طلاق ماہ نور نے خود مانگی تھی۔ وہ طلاق کے کاغذات ہاتھ میں لیے گم صم' کھوئی کھوئی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ اسی اثناء بیگم منظور اِدھر آ گئیں' انہوں نے ماہ نور سے پوچھا۔ ''خیریت ہے؟'' اور اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔

''شفیع نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور پھر وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ یہ جان کر بیگم منظور فرط حیرت میں ڈوب گئیں کہ مذکورہ طلاق ماہ نور کی خواہش پر دی گئی تھی۔ طلاق نامہ کی تفصیل یہی بتاتی تھی۔

گردشِ ایام کا سفر جاری رہا اور منظور صاحب کا گھر نئی تبدیلی کے کٹھن کو برداشت کرنا سیکھ گیا تھا۔ ان کے احباب کا حلقہ غنیمت تھا۔ ماہ نور کی طلاق کو ایک سال بیت گیا تھا۔ اس کی دوسری شادی کے لیے منظور صاحب اپنے واقف کار محمود صاحب دفتر شادیات کو کہہ چکے تھے۔ نظامِ قدرت ہے' ہر تاریکی کے بعد اجالا اور ہر غم کے بعد خوشی آتی ہے۔ ایک شام محمود صاحب' ماہ نور کے رشتے کا پیغام لائے۔ لڑکا پہلے دوحہ میں ملازم تھا' اب کراچی میں اس کا اپنا کاروبار تھا۔ گھر کے سوگ نما ماحول اور اداسیوں سے منظور صاحب پہلے ہی بے زار بیٹھے تھے' اندھا کھوجے دو آنکھ کے مصداق' انہوں نے بغیر کسی تعامل کے' رشتے کو منظور کیا۔ چند دنوں میں ضروری امور و دیگر باتیں طے ہوگئیں اور ماہ نور کا نکاح سرفراز سے ہوگیا۔ ماہ نور کو اپنے سابقہ رویے اور خود پرستی سے سبق حاصل ہو چکا تھا اور اب وہ خود میں تبدیلی لانے کی خواہش مند تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا' زندگی کی راحت و سکون شوہر کی رضا میں کھوجنا ہوگا پھر واقعی شوہر کی چند دنوں کی قربت میں ماہ نور کا رویہ بالکل تبدیل ہوگیا۔ سرفراز کی تابع داری میں اسے سکون محسوس ہونے لگا۔ شوہر کی خدمت اس کی عبادت بن گئی۔ اس کے کپڑوں کی دھلائی' استری' ناشتہ' کھانا' الغرض ہر ضروریاتِ زندگی کو احسن طریقے سے پورا کرنا اس کے لیے فرضِ اولین بن گیا تھا۔ دوسری طرف سرفراز بھی اس کی دلجوئی میں لگا رہتا تھا۔ وہ ماہ نور کو شہر کے مشہور شاپنگ سینٹرز پر خریداری کے لیے لے جاتا تھا پھر ان دونوں کی محبت کا پھل ایک خوبصورت بچے کی صورت میں قدرت نے انہیں دیا۔ بچہ جب سوا ماہ کا ہوا تو عزیز و اقارب کی منظور صاحب نے بہت شاندار دعوت کی۔ گھر کو خوبصورت رنگ برنگی جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے سجایا گیا۔ اس موقع پر بچہ کا نام نوراللہ رکھا گیا۔

ماہ نور اور سرفراز کے شب و روز بہت خوش گوار گزر رہے تھے۔ ایک روز معمول کے خلاف سرفراز جلد ہی گھر آ گیا۔ اس کی طبیعت ناساز تھی پھر روز بہ روز سرفراز کی طبیعت خراب ہوتی چلی گئی۔ جوں جوں دوا کی' مرض بڑھتا گیا۔ کئی دن گزر گئے مگر مرض کی تشخیص نہ ہوسکی۔ کئی ڈاکٹروں کے بعد شہر کے

# غزل

سلگتے رہنا ہی اب صبح و شام ٹھہرا ہے
کہ ہجر وصل کا قائم مقام ٹھہرا ہے

کرے گزشت سے پیوست میرے جیون کو
جو لاشعور میں گزرا مقام ٹھہرا ہے

یہ جسم مظہرِ رب ہے جہانِ ظاہر میں
سو میرے واسطے ذی احترام ٹھہرا ہے

ورائے حرف و بیاں جب سے پایا جذبوں کو
سکوت ہی مرا طرزِ کلام ٹھہرا ہے

ہم اپنے وقت کے قیدی ہیں اس جہاں اندر
کہ مستقل یہاں کب، کس کا نام ٹھہرا ہے

کسی کے امر کی تکمیل کو یہاں احمد
کسی کا چلنا، کسی کا قیام ٹھہرا ہے

احمد نواز

معروف اسپیشلسٹ کو دکھایا گیا۔ بہت سارے ٹیسٹ اور ایکس رے کے بعد تشخیص ہوئی کہ سرفراز کو کینسر ہے۔ یہ جان کر تو ماہ نور کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ مذکورہ رپورٹ کے بعد اب سرفراز کے لیے دواؤں سے بڑھ کر دُعاؤں کی ضرورت تھی۔

ماہ نور بہت ضبط و تحمل کے ساتھ ایک وفاشعار بیوی کی طرح سرفراز کی خدمت و تیمارداری کرتی رہی۔ ایک دن سرفراز نے ماہ نور کو اپنے قریب بلایا اور کہا۔

''اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ ہم دونوں کی شادی کے لیے درپردہ کوشش کس کی تھی؟ میرے تعلقات شفیع صاحب سے بہت دیرینہ ہیں' وہ بہت نیک' خداترس انسان ہیں۔ میری ملاقات اُن سے دوحہ میں ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں تم سے شادی کرلوں' اُن کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں نے ہامی بھرلی پھر محمود صاحب کو اعتماد میں لیتے ہوئے ہماری شادی انجام پائی۔ شفیع صاحب بہت اچھے اور عظیم انسان ہیں۔ تم سے علیحدگی سے پہلے ایک مجازی بیٹے کی حیثیت سے انہوں نے تمہارے والدین کے لیے جو کچھ کیا' ویسا ہی کرنے کا مجھے بھی پابند کیا تھا حالانکہ تم نے ان سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔'' سرفراز سربستہ راز سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ اُدھر ماہ نور کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی جاری تھی' زبان پر چپ لگی ہوئی تھی۔ یکا یک ماہ نور کی نظر سرفراز پر پڑی تو دیکھا کہ سرفراز کا سر دوسری طرف ڈھلک گیا تھا' نبض تھم گئی تھی اور دل کی دھڑکن بھی بند تھی اور وہ راہیِ ملکِ عدم ہو چکا تھا۔

.....☆☆.....



## جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

اُمِ عادل

# دھوپ چھاؤں

تبسم نواز وڑائچ کا خیال

آبلہ پا ہی رہی دشتِ بلا میں ہر دم
زندگی اپنے لیے وادیِ پرخار ہی رہی

**اس عورت کی کہانی جس نے صحرائے زندگی کو کڑی دھوپ میں پار کیا تھا**

''میڈم اسفر.....! میڈم.....!''

میں جس اسکول سے وابستہ تھی' اُس کے چپے چپے میں اس نام کی گونج تھی اور کیوں نہ ہوتی' میڈم اسفر کی شخصیت ہی ایسی تھی' ہنس مکھ' ملنسار' ہمدرد' پھرتیلی' دوسروں کا دکھ درد محسوس کرنے والی' ہر کام میں آگے' ہر کام میں ماہر' ہر وقت' ہر مسئلہ حل کرنے میں وہ بنفسِ نفیس پیش پیش رہتیں' کوئی کام کسی پر نہ چھوڑتیں۔ اسکول لائبریری کی کتابوں کی خریداری ہو یا سائنس لیب کے سامان کی یا پھر بورڈ آفس کا کوئی کام ہو' وہ ہر کام بوتل کے جن کی طرح سرانجام دیتیں۔ خوش لباس وخوش گفتار اتنی کہ اسکول اونر سے اسٹاف ممبران اور ماسی' چوکیدار تک سے ہمیشہ خوش مزاجی سے بات کرتیں۔ مجھے اُن کے ماتحت کام کرتے چار سال ہو چلے تھے' کبھی کسی کولیگ کو اُن کی شکایت کرتے نہ دیکھا۔ میں اکثر اُن کے مردانہ نام کے متعلق سوچتی۔ ایک دن میں نے اپنی ایک ساتھی ٹیچر سے پوچھا۔

''عذرا' کیا میڈم کا اصل نام یہی ہے؟ یہ تو مردانہ نام ہے؟''

اُس نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں بھئی' میڈم کا اپنا نام تو بہت پیارا یعنی رُوبی ہے مگر وہ خود کو شوہر کے حوالے سے مسز اسفر کہلوانا پسند کرتی ہیں۔ اب اسکول میں میڈم اسفر ہوگئی ہیں۔''

میڈم اسفر کی گھریلو زندگی میں بھی سوائے اس کمی کے کہ وہ گزشتہ بارہ سال سے بیوگی کی زندگی گزار رہی تھیں اور کوئی کمی نہ تھی' اُن کے دو بچے ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھے جب وہ بیوہ ہوئیں۔ بیٹی بارہ سال کی اور بیٹا دس سال کا تھا۔ بیٹی نے جیسے ہی گریجویشن مکمل کیا' میڈم اسفر نے اچھی' خوش حال' پڑھی لکھی فیملی میں اُس کی شادی کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئیں۔ اب ماشاء اللہ ایک خوبصورت نواسے کی نانی جان بھی بن چکی تھیں مگر میڈم کی شخصیت اور عمر دیکھ کر کوئی بھی مشکل سے یقین کرتا کہ وہ نانی بن چکی ہیں۔ میں نے اکثر اُن کے حسین مسکراتے چہرے اور غلافی آنکھوں کی گہرائی میں دکھ اور یاس کی پرچھائیاں دیکھی تھیں۔ اکثر میں اسے اپنا وہم سمجھتی مگر میں اُن کے گزرے ماضی سے متعلق جان کر اپنے مشاہدے کی تصدیق یا تردید چاہتی تھی لیکن اس کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔ اسکول میں وہ خود کبھی فرصت سے چند گھڑیاں بیٹھتی تھیں اور دوسروں کو بھی اپنے کام میں مصروف رکھتی تھیں جس کی وجہ سے ہمارا اسکول تعلیمی معیار کے لحاظ سے علاقے میں نمبرون جا رہا تھا۔ مجھے اُن کے کام کرنے کا انداز بہت پسند تھا۔ میں اُن کے ہی انداز پر اپنے پیپرز اور رزلٹ باقی تمام ساتھیوں سے قبل تیار کر لیتی تھی جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ مجھے سراہتی اور پسند کرتی تھیں۔ وہ اکثر اسکول میں اسٹاف ممبران کے لیے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ بنا کر لاتیں۔ ایک دن وہ حلوہ لے کر آئیں۔ میں نے زندگی میں کئی طرح کے حلوے پکائے اور کھائے تھے مگر اُس حلوے کا ذائقہ ہی نرالا تھا۔ میں نے حلوے کی تعریف کرتے ہوئے میڈم سے اُس کی ریسپی پوچھی۔ وہ حسبِ عادت مسکرا کر بولیں۔

''کسی دن گھر تشریف لائیے اور حلوہ بنانا سیکھ لیجیے۔ اُس سن ڈے میں فارغ ہوں اور تنہا بھی لہٰذا آپ آجائیے۔ مجھے بھی اچھا لگے گا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا تو انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''دو ہفتے سے بیٹی نائلہ اپنے بیٹے کے ساتھ لاہور سے آئی ہوئی تھی' کل ہی بیٹا تیمور انہیں چھوڑنے لاہور گیا ہے اس لیے چار پانچ دن کے لیے اکیلی ہوں۔'' میں نے اُن کی دعوت قبول کرتے ہوئے سن ڈے کو آنے کا وعدہ کر



لیا اور سوچ بھی لیا کہ میڈم کی گزری زندگی کے متعلق بھی ضرور پوچھوں گی۔

اتوار کو دس بجے اُن کا فون آ گیا۔ وہ میرے آنے سے متعلق پوچھ رہی تھیں' ساتھ ہی دوپہر کے کھانے کی دعوت بھی دے رہی تھیں۔ میں نے اپنی ساس سے اجازت چاہی۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا بنانے کی ذمہ داری لیتے ہوئے بخوشی اجازت دے دی۔ شکر ہے' میری ساس' روایتی ساس نہ تھیں بلکہ بہت حد تک میرے جذبات و احساسات کا خیال رکھتی تھیں۔ میڈم اسفر کا گھر تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی' میں نے جیسے ہی ڈور بیل پر ہاتھ رکھا' فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ میڈم صحن میں بنی کیاری میں پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔ مجھے ساتھ لیے گھر کے اندر آ گئیں۔ قرینے اور سلیقے سے سجا میڈم کا گھر بہت پرسکون تھا۔ انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا پھر کولڈ ڈرنک لا کر میرے آگے رکھی اور خود میرے سامنے بیٹھ کر میرا حال احوال پوچھنے لگیں اور بولیں۔

''مجھے خبر ملی ہے' آپ کا تعلق قلم سے بھی ہے؟''

''جی میڈم' الحمدللہ' کئی رسائل میں میری کہانیاں چھپتی ہیں۔'' میں نے تصدیق کی۔

''مگر آپ نے کبھی مجھے نہیں بتایا؟'' وہ بولیں۔

''اسکول میں کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ یہ بات ہو سکے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''ہاں' یہ تو ہے' اسکول کی اپنی ذمہ داریاں ہیں' وہاں ہم اپنی ذاتی باتیں ڈسکس کرنے تو نہیں جاتے۔ اچھا خیر' آج میں آپ کو حلوہ بنانے کے ساتھ اپنی گزری ہوئی بلکہ کچلی ہوئی زندگی کی کہانی بھی سناؤں گی اور آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ اُسے ضبطِ تحریر میں ضرور لائیں تاکہ میری کرب ناک زندگی اور ذات کا دکھ پڑھنے والے بھی محسوس کر سکیں بلکہ مجھے یقین ہے' آپ میری کہانی سن کر میرے اس خیال کی تصدیق کریں گی کہ میری آپ آپ بیتی صرف میری ہی نہیں' معاشرے کی ہر دوسری عورت اپنی ذات کی نفی کے دکھ سے یا تو دوچار رہ چکی ہے یا اس دکھ سے گزر رہی ہے۔''

میڈم کی بات سن کر میرے تو دل کی مراد بر آئی' میں جو راستے میں سوچ رہی تھی' میڈم سے اُن کی گزری زندگی کے بارے میں کیسے دریافت کروں گی؟ میرا مسئلہ انہوں نے خود ہی حل کر دیا تھا۔ پہلے ہم نے کچن میں حلوہ بنانا سیکھا جو کہ واقعی خاصا مشکل تھا پھر میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر حلوہ کھانے اور چائے پیتے ہوئے میڈم اسفر کی داستانِ حیات سنی جو کچھ اس طرح تھی۔

''میرے والد احمد علی تین بہنوں کے سب سے چھوٹے اور اکلوتے بھائی تھے۔ جب وہ ایک سال کے تھے تو اُن کی والدہ اچانک فوت ہوگئیں۔ ابو کی دادی حیات تھیں۔ انہوں نے بچوں کو سنبھالا۔ کچھ عرصہ گزرنے پر انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ شادی کر لو تاکہ تمہاری اور بچوں کی دیکھ بھال ہو سکے۔

''شادی.....!'' دادا ابو نے چونک کر کہا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا' تمہاری دوسری شادی کوئی انہونی بات ہے؟'' دادی نے غصے سے پوچھا۔

''نہیں اماں.....! یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''ماں.....! اچھی ماں! اس کی دو بڑی وجوہات ہیں' ایک تو چار بچوں کے ساتھ اس عمر میں کوئی اپنی بیٹی دے گا' نہیں۔''

''کیا مطلب' کیوں نہیں دے گا؟'' دادی نے

بیچ سے بات اُچکی۔ ”مشکل سے تو ابھی بتیس سال کا ہوا ہے۔ وہ میری بچپن کی سہیلی صغراں کی بیٹی حاجرہ ہے نا۔“ دادی نے لڑکی کی نشاندہی کی۔

”توبہ کریں اماں.....! حاجرہ مجھ سے کتنی چھوٹی ہے‘ میری مریم گیارہ کی ہے اور حاجرہ مشکل سے اٹھارہ کی رہی ہوگی پھر وہ اپنی ماں کی اکلوتی نازوں پلی ہے‘ بھلا خالہ صغراں مانیں گی؟ حاجرہ مجھ سے پورے چودہ سال چھوٹی ہے۔ اماں.....! نہ ایسا سوچنا اور نہ خالہ صغراں سے کہنا ورنہ آپ اور اُن کی بچپن کی دوستی ٹوٹ جائے گی‘ وہ ناراض ہو جائیں گی۔“ ابا نے سمجھایا۔

”اچھا چل‘ وہ نہ سہی‘ کوئی اور سہی‘ گاؤں میں کیا لڑکیاں ختم ہوگئی ہیں؟“ دادی آج بیٹے کو ہر صورت راضی کرنے کے درپے تھیں۔

”مگر اماں.....! دوسری وجہ تو آپ نے سنی نہیں۔“ دادا ابو عاجز آ کر بولے۔

”ہاں‘ دوسری وجہ بھی بتا دے‘ وہ کیا ہے بھلا سنوں تو؟“

”اماں جان.....! عزیزہ سے زندگی میں میرا وعدہ تھا کہ اُس کی موت کے بعد میں دوسری شادی کسی قیمت پر نہیں کروں گا۔“

”اب تُو ایسی ایسی باتیں کرے گا کہ میں نے کون سی مرنے والی سے تصدیق کر لینی ہے‘ تیری مرضی‘ جو جی میں آئے‘ کر مگر اب مجھ سے زیادہ کام نہیں ہوتا۔“ دادی کہتے ہوئے اٹھ گئیں۔

”مگر اماں.....! مریم اب سمجھ دار ہو چکی ہے‘ گھر کے کام اُس سے کروایا کریں۔“

”اچھا‘ اچھا‘ مجھے مت سمجھا۔“ کہہ کر دادی کمرے سے نکل گئیں۔

وقت جیسے تیسے گزرنے لگا۔ تینوں بیٹیاں جیسے جیسے سولہ سولہ سال کی عمر کو پہنچیں‘ دادی اماں نے اچھے گھر دیکھ کر انہیں رخصت کر دیا۔ اب دادی اور بھی بوڑھی اور کمزور ہو چکی تھیں۔ میرے والد احمد علی بھی اٹھارہ سال کے جوان ہو چکے تھے۔ خوب قد کاٹھ نکالا تھا اور دیکھنے میں بائیس‘ تیئس کے لگتے تھے۔ اب دادی کی شدید خواہش تھی کہ وہ پوتے کے سر پر بھی سہرا سجا کر زندگی کے بقیہ دن آرام سے گزر سکیں۔ دادی کی بچپن کی سہیلی دادی صغراں سخت بیمار تھیں‘ لگتا تھا‘ چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔ ایک روز انہوں نے دادی کو بلوایا‘ رو رو کر بتایا کہ انہوں نے اپنے نخروں کی وجہ سے اپنی اکلوتی بیٹی حاجرہ کی شادی ابھی تک نہ کی تھی۔ اب وہ 35 سال کی ہو چکی تھی یعنی اُس کی شادی کی عمر گزر چکی تھی۔ دادی‘ صغراں دادی کے گھر سے آئیں تو سخت پریشان تھیں‘ وہ سیدھی اپنے بیٹے کے کمرے میں گئیں۔ وہ بیٹے کے کمرے میں صرف اُس وقت جاتی تھیں جب انہیں کوئی بہت اہم کام ہوتا تھا۔ ان کے بیٹے حامد تسبیح پڑھ رہے تھے۔ دادی بغیر تمہید باندھے شروع ہو گئیں۔

”صغراں سخت بیمار ہے‘ کسی وقت بھی اُس کا بلاوا آ سکتا ہے۔“ دادی ابھی یہاں تک ہی بولی تھیں کہ میرے ابا احمد علی انہیں تلاش کرتے اپنے والد کے کمرے میں چلے آئے۔ دادی نے کہا۔

”اچھا ہوا‘ تم بھی آ گئے۔ بیٹھو‘ تمہارے متعلق ہی بات ہے۔ ہاں تو وہ بیٹی کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔“ دادی اماں نے سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”وہ رو رو کر مجھ سے حاجرہ کو اپنے گھر لے جانے کی التجا کر رہی تھی۔ میں نے بہت سوچا‘ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ میں حاجرہ کی شادی احمد علی سے کر دوں۔“ اماں نے دھماکہ کر دیا۔

”کیا.....! خالہ حاجرہ کی شادی مجھ سے؟“

”ہاں بیٹا! مجھے اپنی تربیت پہ ناز ہے‘ مجھے معلوم



ہے‘ وہ تم سے سولہ سال بڑی ہے مگر مجھے یہ بھی مان ہے کہ تمہیں اس کو اور تمہارے باپ کو کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ شام کو تم دونوں میرے ساتھ صغراں کے گھر چلو تاکہ اُس کی زندگی میں یہ کام ہو جائے تو وہ سکون سے مر سکے۔“ احمد علی‘ دادی کے اس اچانک فیصلے سے گھبرا اٹھے پھر کچھ سوچ کر انہوں نے دادی کی بات کی لاج رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو گھر کے تینوں افراد دو گواہوں اور قاضی صاحب کے ہمراہ دادی صغراں کے گھر گئے۔

نکاح سے قبل میرے والد احمد علی نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی دادی کے فیصلے سے انحراف نہیں کر سکتا مگر نکاح سے پہلے میری بھی ایک شرط ہے جو نکاح نامے میں درج ہوگی۔“

”ہاں بیٹا! بول‘ کیا شرط ہے؟ میں تیری ہر شرط مانوں گی۔“ دادی صغراں نے اکھڑی سانسوں سے پوچھا۔

”آئندہ زندگی میں مجھے اپنی ہم عمر سے دوسری شادی کرنے کا اختیار ہوگا؟“

”ہاں‘ ہاں بیٹا! تم ایسا کر سکتے ہو۔ حاجرہ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

اور یوں اس شرط پر حاجرہ‘ احمد علی کی بیوی بن کر اُن کے گھر آ گئیں۔ چند دن بعد دادی صغراں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میرے بابا‘ احمد علی نے حاجرہ بی بی سے شادی تو کر لی تھی مگر وہ انہیں بیوی کا درجہ نہیں دے پا رہے تھے۔ جنہیں وہ کل تک خالہ حاجرہ کہتے تھے آج وہ اُن کی بیوی بن چکی تھیں۔ تقدیر نے اُن کے ساتھ اچھا مذاق کیا تھا مگر شادی کے خاصے عرصہ بعد اور دادی کے دن رات سمجھانے پر رفتہ رفتہ ابا انہیں بیوی تسلیم کر سکے اور یوں شادی کے دو سال بعد جب ابا صرف اکیس سال کے اور اماں 37 برس کی تھیں کہ میں اُن کی زندگی میں آئی۔ ابا بہت خوش تھے مگر اماں بجائے شکر کرنے کے ناخوش تھیں۔ انہیں بیٹا چاہیے تھا‘ جب میں تین برس کی ہوئی تو چالیس سال کی عمر میں اللہ نے اُن کی بیٹے کی آرزو بھی پوری کر دی۔ بیٹا پا کر اماں پھولے نہ سماتی تھیں۔ اماں چونکہ بابا جانی کی رشتہ میں خالہ تھیں اور عمروں کے اتنے فرق نے زندگی بھر تبدیلی نہ آنے دی تھی لہٰذا اماں نے ہمیشہ ابا کو دبا کر رکھا یعنی ہمیشہ بچہ سمجھ کر ٹریٹ کیا۔ بابا کم عمر تھے لہٰذا اماں کی ہر بات بلا چوں چراں مان لیتے۔ اماں نک چڑھی اور انا پرست خاتون تھیں جبکہ بابا جانی رحم دل‘ دوسروں کا احساس کرنے والے انسان تھے۔ اماں اور بابا کی کبھی نہ بنتی تھی مگر ہتھیار ہمیشہ ابا کو ہی ڈالنے پڑتے اور اماں اپنی فتح پر کچھ اور زیادہ مغرور ہو جاتیں۔

میری پیدائش کے چند روز بعد دادی ایک دن سوئیں تو پھر دوبارہ نہ اٹھیں۔ اماں نے شکر کیا کہ ساس سے نجات ملی۔ اب وہ اور کھل کر من مانی کر سکتی تھیں۔ تینوں پھوپھیاں اسی گاؤں میں رہتی تھیں۔ وہ جب کبھی میکے آتیں‘ اماں ناک بھوں چڑھا کر اپنے کمرے میں گھس جاتیں۔ وہ بے چاریاں بغیر کچھ کھائے پیے دادی اور اپنے باپ سے مل کر واپس چلی جاتیں مگر دادی کے بعد تو اُن کے آنے پر بالکل پابندی لگ گئی۔ ابا کو بہنوں کی یاد آتی تو مل آتے۔ دادا ابو ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اُس سال بڑی منتوں اور آرزوؤں کے ساتھ وہ سفرِ حج پر جانے والے تھے۔

ایک دن انہوں نے بابا جانی کو کہا۔ ”بیٹا! میری شدید خواہش ہے کہ میں اس سفر کے دوران وفات پاؤں اور عرب کی مقدس سرزمین میں دفن کیا جاؤں۔ اگر اللہ میری یہ تمنا پوری کر دے تو تم صبر کرنا اور مجھے پاکستان لانے کی کوشش نہ کرنا۔“ پتا نہیں وہ قبولیت کا وقت تھا کہ دورانِ حج واپسی سے صرف

تین دن قبل اچانک دادا کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ اُن کے ساتھی انہیں ہسپتال لے جا رہے تھے کہ دادا نے جان دے دی۔ اپنے ہم سفروں کو وہ پہلے ہی اِس مقدس سرزمین پر تدفین کی ہدایات کر چکے تھے لہٰذا انہیں وہیں دفنا دیا گیا۔

اب اماں کی گھر میں مکمل حکمرانی تھی۔ ابا تو پہلے ہی اُن کے سامنے بیٹا نما شوہر تھے۔ اب اماں کو گاؤں میں رہنا پسند نہ تھا اور انہوں نے کراچی آ کر ہی دم لیا۔ انہوں نے گاؤں والا گھر بیچ کر کراچی میں گھر خرید لیا اور مکمل آزادی و خودمختاری سے رہنے لگیں۔ اس دوران وہ سمجھ رہی تھیں کہ پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے' احمد علی اب مکمل میرے کنٹرول میں ہے اس لیے دوسری شادی کا کبھی ذکر نہیں کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا' کراچی آنا اماں کو مہنگا اس طرح پڑا کہ گاؤں میں تو سب لوگ جانتے تھے کہ اماں' ابا کی شادی ہوئی ہے یہاں مگر شہر میں جو کوئی انہیں دیکھتا' ابا سے پوچھتا۔ ''احمد علی' یہ آپ کی اماں ہیں؟ ابا کہاں ہیں؟'' شروع میں محلے والیوں نے اماں سے بھی کئی بار کہا۔ ''آپ اپنے بیٹے سے سودا منگوا دیں۔''

وہ کہتیں۔ ''یہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے' سامان نہیں لا سکتا۔''

''یہ والا نہیں بہن' وہ بڑا والا لا دے گا۔'' اماں اُس پڑوسن کو غرا کر کہتی۔ ''وہ میرا شوہر ہے۔'' محلے والیاں عجیب انداز میں دیکھتے ہوئے چلی جاتیں۔

اس صورت حال نے ابا کو دوسری شادی پر راغب کیا اور اماں کے ساتھ ان کا دوسری شادی کروانے کا مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ چار و ناچار اماں نے ایک میمن فیملی میں ابا جانی کی ہم عمر لڑکی سے شادی کروا دی مگر نکاح سے قبل اماں نے چند کڑی شرائط لکھوا کر ابا سے دستخط کروا لیے مثلاً یہ کہ گھر صرف میرا اور میرے بچوں کا ہے' اس سے تمہاری دوسری بیوی کا کوئی تعلق نہ ہوگا اور تم زندگی بھر خواہ کیسے ہی حالات ہوں' اسے اس گھر میں نہیں لاؤ گے۔ جس طرح تم اپنی پوری کمائی لا کر میرے ہاتھ پر رکھتے ہو' ایسے ہی کرو گے۔ میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیوی کے لیے خرچہ دوں گی۔ تمام جمع پونجی میرے قبضہ میں ہوگی اور تم انصاف سے مجھے اور میرے بچوں کو وقت دو گے۔

بابا جانی وعدے کے پکے انسان ثابت ہوئے' انہوں نے مرتے دم تک یہ تمام شرائط نبھائیں' دوسری بیوی کو ہمارے علاقے سے دور رہائش دلوائی۔ محلے کے لوگوں کو ابا کی شادی کی سن گن لگ چکی تھی مگر اماں کے جارحانہ اور درشت رویے کی وجہ سے کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ تصدیق کرتے۔ اماں نے ہمیں بھی اس بات کی ہوا نہ لگنے دی۔ ابا جانی ایک ہفتہ اپنی دوسری بیوی کے ہاں رہتے اور دوسرے ہفتے ہمارے پاس ہوتے۔ ہم اماں سے پوچھتے تو وہ کہتیں۔ ''ایک ہفتہ تمہارے ابو کی دن رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔'' ہم ناسمجھ تھے' اسی کو سچ مان لیتے۔ اس دوران اماں کی بچپن کی ایک پکی سہیلی فاطمہ بھی اپنی چھ بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ہمراہ کراچی میں ہمارے ہی محلے میں شفٹ ہو گئیں۔ اس کے آنے سے اماں کی تو عید ہو گئی' وہ بہت ہی خوش تھیں۔ انہوں نے ہم بچوں کو بتایا کہ یہ میری بہنوں جیسی سہیلی اور تمہاری خالہ ہے۔ اماں کو پہلے بھی گھر اور بچوں کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' وہ روٹھ کر کھانا پکا کر ہمیں دیتیں۔ میں اب دس برس کی ہو چکی تھی۔ اماں نے میرا بچپن کہیں گم کر کے کھانا پکانے کے علاوہ باقی تمام ذمہ داریاں مجھ پر ڈال رکھی تھیں۔ بھائی کے کاموں کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہی تھی۔ پہلے اماں کا پسندیدہ مشغلہ آرام کرنا اور کہانیوں کی کتابیں پڑھنا تھا اور اب خالہ فاطمہ کے



گھر بھاگ بھاگ کر جانا اُن کا کام تھا۔ گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے وہ گھر اور بچوں سے بالکل غافل ہو گئی تھیں۔ خالہ اور اُن کے بچے اماں کی جھوٹی تعریفیں کر کر کے اُن سے کھانے پینے کی اشیاء اور پیسے لٹواتے رہتے۔ اس دوران خالہ نے اپنی چار بیٹیوں کی شادی گاؤں میں ہی کر دی۔ بیٹے کی شادی کے لیے انہوں نے میرے لیے اماں کو شیشے میں اتار لیا۔ اماں کو خالہ فاطمہ کے بیٹے اسفر میں دنیا جہاں کی خوبیاں نظر آتی تھیں۔ خالہ نے اس رشتے کے لیے اماں کو مکمل اپنے قبضے میں لے رکھا تھا مگر ابا کو اسفر پسند نہ تھا۔ انہیں اسفر سخت گیر اور کام چور لگتا تھا۔ سخت گیر تو وہ تھا' اس کی تو میں خود گواہ تھی' اپنی چھوٹی بہنوں کی ذرا سی غلطی پر وہ انہیں بری طرح مارتا تھا مگر اماں کے سامنے ہمیشہ نرم خو رہتا۔ وہ کام چور بھی تھا۔ خالہ فاطمہ نے اسے گھر کے قریب کریانے کی دکان بنا کر دی تھی جسے وہ اپنی مرضی سے کبھی کبھار ہی کھولتا تھا مگر خالہ ہمیشہ اماں کے سامنے اس کی کمائی کا ذکر کرتی رہتی تھیں۔ بابا جانی ہمیشہ اس رشتے کی مخالفت کرتے۔ اماں اور بابا جان کی زوردار لڑائی ہوتی۔

اماں کہتیں۔ ''تم اپنی کسی بہن سے ناتا جوڑنے کے چکر میں ہو گے' ایسا میں ہونے نہ دوں گی۔'' اسی کشمکش میں' میں اٹھارہ اور اسفر تیس سال کا ہو گیا۔ خالہ فاطمہ کی آخری دونوں بیٹیوں کی منگنیاں بھی ہو چکی تھیں اور اب وہ تینوں بچوں کی شادی ایک ہی ساتھ نمٹانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اماں پر دباؤ ڈالا۔ حسبِ روایت ایک زوردار معرکے میں اماں کی جیت ہوئی اور ابا خاموش ہو گئے۔ وہ اسفر جیسے سخت گیر اور نکھٹو شخص کے ہاتھوں اپنی بیٹی کی تقدیر دینے کو تیار نہ تھے مگر اماں ہمیشہ سے زبردست رہی تھیں' سو شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مجھ سے کسی نے مرضی معلوم کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ میرا گریجویشن مکمل ہو گیا تھا۔ میں ابھی مزید پڑھنا چاہتی تھی مگر میری تقدیر کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ خوش نہ ہونے کے باوجود ابا نے میرے جہیز کے سامان میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ میرے جہیز کے سامان سے خالہ فاطمہ کا گھر بھر گیا۔

شادی کی رات اسفر نے انکشاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں جب سے کراچی آیا اور تمہیں دیکھا' میں تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں نے ہی اماں کو کہہ رکھا تھا' میں شادی صرف روبی سے کروں گا۔'' یہ سن کر مجھے کچھ طمانیت ہوئی کہ جو شخص محبت کا دعوے دار ہے' اس کے ساتھ زندگی سہل گزر سکتی ہے مگر گزرتے وقت نے اس کی محبت کا دعویٰ غلط ثابت کر دیا' اسفر نے مجھ سے نجانے کس جنم کا بدلہ لیا' اس نے ابا امی کی گزری زندگی کا ہر واقعہ میرے لیے ایک طعنہ بنا ڈالا۔ شادی کے ابتدائی چند ماہ تو وہ ٹھیک رہا پھر اس نے امی کی انا پرستی' پھوہڑ پن' سخت مزاجی اور ابا پر حاکمیت' ہر معاملے پر مجھے طعنے دینے شروع کر دیے۔ وہ کسی کا بھی خیر خواہ نہ تھا۔ بابا جانی جن کی عادات کو زمانہ سراہتا اور ان کی عزت کرتا تھا' اسفر کو بابا ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ ان کے ہر اچھے عمل میں بھی کیڑے نکالتا۔ اگر کبھی بابا میری محبت میں مجھ سے ملنے میرے گھر چلے آتے' وہ سلام کا جواب تک نہ دیتا۔ اس کے چہرے سے صاف ناگواریت محسوس ہوتی مگر بابا کبھی مجھ سے شکایت نہ کرتے۔ وہ مجھ سے شدید محبت کرتے تھے گو کہ میں نے کبھی بابا یا اماں سے اسفر کے رویے کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا مگر ابا میری حالت سمجھتے تھے لیکن وہ بے بس تھے۔ میں اسفر کے گھر ایک نوکرانی تھی' سارا دن گھر کا کام کرتی' اس کے بدلے صرف روٹی کھانے کو ملتی۔ بیوی کی دیگر ضروریات کیا ہیں' اسفر کو پروا نہیں تھی۔ وہ کہتا' شادی میں دونوں اطراف سے جو جوتے کپڑے

ملے ہیں' وہ تمام عمر کے لیے کافی ہیں۔ کبھی عید تہوار پر بھی کپڑے دلوانا ضروری نہ سمجھتا مگر میرے بابا بنا مانگے ہر موقع پر میرے لیے کپڑے' جوتے' چوڑیاں اور ضرورت کی دوسری اشیاء لے کر آتے جنہیں دیکھتے ہی اسفر کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ بابا کے جاتے ہی بابا کو گالیاں دینے لگتا' بیٹی کا چچہ کہتا' سامان اٹھا کر اِدھر اُدھر پھینک دیتا' زیادہ غصے میں آجاتا تو مجھے دو چار تھپڑ بھی مار دیتا اور پھر کئی کئی دن تک قطع کلامی کر لیتا مگر میں معمول کے مطابق اس کی خدمت کرتی رہتی۔ ایک ہی محلے میں رہتے ہوئے میری ماں کو مجھ پر ظلم نظر نہ آتا۔ اس نے کبھی میری اجڑی' اداس صورت دیکھ کر مجھ سے میرا حالِ دل جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی ماں سے کیا شکایت کرتی جس نے کبھی اُس وقت پیار اور توجہ نہ دی جب میں اُس کے گھر تھی۔ اُسے صرف مجھ سے یہ غرض تھی کہ میں ہر وقت کاموں میں جتی رہوں۔ میں کبھی بیمار ہوتی تو وہ دوا تک لا کر دینا ضروری نہ سمجھتی۔ ایسی انا پرست ماں جو خود بیٹی کے دل میں نہ جھانک سکے' اسے اپنے حالات بتانا بے مقصد تھا۔ اسے اسفر میں کوئی برائی نظر نہ آتی اور وہ بھی پیٹھ پیچھے اماں کو لاکھ برا بھلا کہتا مگر اماں کی سختی سے ڈرتا بھی تھا اس لیے اماں کے منہ پر چاپلوسی سے کام لیتا۔ اسفر نے کبھی مجھے بیوی یا زندگی کے ساتھی کا درجہ نہ دیا' کبھی مجھے کہیں ساتھ لے کر نہ جاتا حتیٰ کہ والدین کا گھر محلے میں ہونے کے باجود وہ میرے ہمراہ کبھی میرے میکے نہ گیا۔ عید تہوار پر' کھانے پر اگر دعوت ہوتی تو مجھے اور اپنی ماں کو بھیج دیتا' خود گھر میں پڑا رہتا۔ اماں' بھائی کے ہاتھ اُس کا کھانا گھر بھجوا دیتی۔ بابا سب کو عیدی دیتے' اسے عیدی دینے خود چل کر گھر آتے۔ وہ ناک بھوں چڑھا کر بڑی نخوت سے پیسے پکڑ لیتا مگر بابا کو بیٹھنے کے لیے بھی نہ کہتا۔ وہ عیدی دے کر کھڑے کھڑے واپس چلے جاتے۔ نام کی جو دکان داری تھی' اس میں جب سامان ڈالنا ہوتا تو بڑے طمطراق سے مجھے آرڈر ہوتا' جاؤ' جا کر اپنے باپ سے کہو' گاڑی نکالے مجھے سامان ڈالنا ہے۔ میرے مہربان بابا چپ چاپ اسے لے کر چل پڑتے۔ سامان لا کر اسفر کے ساتھ دکان میں رکھنے میں مدد دیتے اور جواب میں اسفر ایک لفظ شکریہ ادا نہ کرتا۔ اسفر نے اپنی بہنوں کے ساتھ بھی یہی واجبی سا رویہ رکھا ہوا تھا۔ کبھی ان کے گھر نہ جاتا۔ اگر ان کے سسرال میں کوئی مسئلہ ہوتا تو بڑی مشکلوں سے ماں کے ساتھ جاتا تھا مگر مجھے تو زندگی بھر کبھی کسی نند کے گھر نہ لے کر گیا۔

زندگی بڑی مشکلوں اور مصیبتوں سے گزر رہی تھی کہ خدا نے یکے بعد دیگرے بیٹی اور بیٹے کی صورت میں میری زندگی میں بہار کا سامان پیدا کر دیا۔ میں بچوں کو پا کر اور اُن میں گم ہو کر کسی حد تک اسفر کے رویئے کو بھولتی جا رہی تھی مگر نصیب میں سکھ ہو تو سکھ ملتا ہے۔ اسفر کو اپنے بچوں سے بھی کوئی لگاؤ نہ تھا بلکہ بچوں کے ساتھ میری والہانہ محبت بھی اسے نہ بھاتی تھی۔

وہ کہتا تھا۔ ''تم انہیں بگاڑ دو گی' یہ برباد ہو جائیں گے۔'' مگر مجھے اپنے بچے اور اُن کی خوشیاں دنیا بھر کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھے۔ میں تو پرائی بیٹی تھی' حد تو یہ ہے کہ اسفر کو اپنے بچوں کی ضروریات کا بھی کچھ خیال نہ تھا۔ وہ میرے ساتھ بچوں کے لیے بھی عید وغیرہ پر جوتے' کپڑے دلانا ضروری خیال نہ کرتا تھا۔ میں اپنا تو جیسے تیسے وقت گزار رہی تھی مگر بچوں کی مایوسی اور حسرت مجھ سے دیکھی نہ گئی اور میں نے اُن کی خاطر اسکول میں جاب کرنے کا فیصلہ کیا مگر اسفر نے اسے اپنی انا اور مردانگی پر ایک تازیانہ سمجھتے ہوئے شدید مخالفت کرتے ہوئے میرے



کردار پر بھی بے بنیاد الزامات لگانے سے بھی گریز نہ کیا مگر میں اپنے بچوں کو ضروریاتِ زندگی کے لیے ترستا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی لہٰذا گھر پر محلے کے بچوں کو ٹیوشن دینے کی راہ نکالی مگر اس میں بھی اسفر کی شدید مخالفت کو برداشت کیا مگر میں بچوں کی خاطر اس محاذ پر ڈٹ گئی۔ اب مہینے بعد میرے پاس تھوڑے پیسے آجاتے جن سے میں بچوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری کر لیتی۔ انہی حالات میں جب بچے ذرا سمجھدار ہوئے تو وہ ہر بات مجھ سے شیئر کرنے لگے۔ باپ تو انہیں بسکٹ اور ٹافی مانگنے پر بھی جھڑک دیتا تھا۔ اسفر جیسے انا پرست اور گھمنڈی شخص کو بچوں سے بھی شکایت رہنے لگی اور وہ اچھی تربیت کے نام پر اُن پر زیادہ سختی کرنے لگا' نتیجتاً بچے بھی دن بدن باپ سے متنفر ہونے لگے جس کا سارا الزام بھی وہ میرے سر ڈالنے لگا۔ اسی کشمکش میں زندگی کی گاڑی رینگ رہی تھی کہ ایک شام اسفر کو معمولی بخار ہو گیا۔ اس کی ماں ڈاکٹر کو گھر بلا لائی۔ ڈاکٹر نے دوا کے ساتھ انجکشن بھی اسفر کو لگا دیا۔ انجکشن شاید غلط تھا یا پھر اسفر کا وقت پورا ہو چکا تھا' دوسری شام آنے تک وہ اپنے سفرِ آخرت پر جا چکا تھا۔ کیسا بھی تھا' میرے سر اور بچوں اور اپنی ماں کے سر کا سائبان تھا۔ سب آئے۔ میں اپنے بابا کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔ اُس دن اُن کے چہرے پر میں نے بہت دکھ کے ساتھ کہیں ہلکا سا طمانیت کا احساس بھی محسوس کیا جسے میں کوئی نام نہ دے سکی۔ چالیسویں تک ابا اور بھیا نے مل کر سنبھالا مگر اب مسائل کا ایک انبار تھا جو مجھے خود ہی دیکھنا تھا۔ اس مشکل میں بابا نے بہت ساتھ دیا' وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے' انہوں نے اسفر کی دکان چلا کر ہمارے گھر کا کرایہ اور خرچہ چلانا شروع کر دیا۔ میں عدت کے بعد بی ایڈ کر کے اسکول میں ملازمت کا پکا ارادہ کر چکی تھی۔ اماں کو بابا کا اسفر کی دکان چلانا پسند نہ آ رہا تھا۔

وہ کہتیں۔ ''لوگ کیا کہیں گے' سسر نے داماد کی دکان پر قبضہ کر لیا۔'' حالانکہ سب جانتے تھے' بابا کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ وہ تو صرف بیٹی کی خاطر یہ کر رہے تھے۔ جیسے ہی میری عدت ختم ہوئی' میں نے ڈھونڈ کر اپنی ڈگری نکالی اور بی ایڈ میں ایڈمیشن لے لیا اور بابا سے کہا کہ صرف ایک سال میں میرا بی ایڈ مکمل ہو جائے گا پھر آپ یہ دکان داری چھوڑ دیجیے گا۔ بابا نے کہا کہ بیٹا.....! تم فکر نہ کرو' میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم نے محسوس کیا ہو گا' اس ساری آپ بیتی میں' میں نے ساس کا کوئی ذکر نہیں کیا' وہ اس لیے کہ مجھے اُن سے کبھی کوئی دکھ نہیں پہنچا' مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں' وہ ذاتی طور پر ایک اچھی عورت تھیں' وہ بیٹے سے ڈرتی تھیں مگر کبھی کبھار اُسے ٹوک بھی دیا کرتی تھیں۔ اسفر کی موت کے بعد میری ساس نے مجھ پر اور میرے بچوں پر جو سب سے بڑا احسان کیا' وہ یہ کہ گاؤں جا کر اپنی حویلی فروخت کر کے یہ گھر جہاں ہم بیٹھے ہیں' منہ مانگے داموں خرید کر میرے نام کر دیا کیونکہ بچے ابھی چھوٹے تھے۔ میری ساس نے بچنے والی رقم اپنی چھ بیٹیوں میں برابر برابر تقسیم کر دی۔

سال پلک جھپکتے گزر گیا۔ میں نے بہت اعلیٰ نمبروں سے بی ایڈ مکمل کر لیا۔ اس دوران ہی میری ایک ساتھی اسٹوڈنٹ اور موجودہ اسکول کی اونر نفیسہ بیگم جو کہ بس وقت گزاری کے لیے شوقیہ بی ایڈ کر رہی تھیں' اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اپنا ذاتی اسکول بنانا چاہتی تھی' انہوں نے اسکول قائم کر کے مجھے اُس کی پرنسپل بنانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ عمارت اُن کے پاس پہلے سے موجود تھی لہٰذا نئے تعلیمی سال کے ساتھ ہی انہوں نے اسکول کا آغاز کر دیا اور مجھے بطورِ پرنسپل رکھ لیا۔ میں نے اُن کے اس احسان کا

# غزلہ

پستی سے اونچائی تک
پہنچے لوگ خدائی تک

چلتے چلتے آ پہنچا ہوں
پھر اپنی پرچھائی تک

ایک محبت سو افسانے
چلمن سے رسوائی تک

ظلمت ظلمت رات کا عالم
سورج کی انگڑائی تک

تنہا تنہا رہتا ہوں
محفل سے تنہائی تک

ایک لکیر کی دوری ہے
بچپن سے دانائی تک

قطرہ قطرہ پگھلیں آنکھیں
بین کریں شہنائی تک

خواب میں آنکھیں جلتی دیکھیں
پہنچی بات جدائی تک

یاسر دلاور خان۔ کراچی

بدلہ دن رات محنت کر کے دوسرے ہی سال اسکول کو علاقے کا مقبول ترین اور نمبر ون اسکول بنا کر دیا جس پر اسکول کی اونر اکثر فخریہ اپنے شوہر سے کہتیں کہ دیکھا، میں نے کیسے ماسٹر پیس کا انتخاب کیا ہے۔

گھر اپنا ہو چکا تھا لہٰذا اب کرائے کی بھی فکر نہ تھی۔ اسکول اسٹارٹ ہوتے ہی میں نے بابا جان کو دکان داری سے روک دیا تھا اور دکان کا سامان سیل کر کے حاصل ہونے والی رقم بینک میں جمع کر دی تھی جو کسی مشکل وقت کام آ سکتی تھی۔ اس ایک سال کے عرصے میں تین اور اہم تبدیلیاں ہماری زندگی میں رونما ہوئی تھیں۔ میری عدت ختم ہوتے ہی اماں جان، بھائی کی شادی کر کے بہو گھر لے آئی تھیں کیونکہ اب وہ کافی ضعیف ہو چکی تھیں۔ بھائی کی شادی کے بعد اُن کا وقت بھی پورا ہو گیا۔ جب مجھے اسکول سے پہلی تنخواہ ملی تو میری مہربان ساس مجھے اور بچوں کو سکھی رہنے کی دُعائیں دیتے ہوئے گاؤں اپنی بیٹیوں کے پاس چلی گئیں۔ میں نے بہت روکا مگر انہوں نے کہا۔

''میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔''

بابا جان حیات ہیں، وہ کبھی اپنی دوسری فیملی جو دو بچوں اور بیوی پر مشتمل تھی، کے پاس چلے جاتے ہیں مگر زیادہ تر بھیا بھابھی کے پاس رہتے ہیں۔ بھابھی اچھی اور خدمت گزار ہیں، سب سے محبت کرتی ہیں اور میرے بچوں کو بھی عزیز رکھتی ہیں۔'' مسز اسفر کی کہانی مکمل ہوئی تو گھڑی تین بجا رہی تھی۔ انہوں نے سوری کہہ کر جلدی سے کھانا لگایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اجازت چاہی اور دل سے دُعا کرتی گھر پہنچی کہ یا خدا! میڈم اسفر پر کڑی دھوپ کے بعد ملنے والی چھاؤں ہمیشہ برقرار رکھنا۔ (آمین!)

.....☆☆.....

# جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

شمرین ادریس

## گھر کی بات

گلنار آفرین کا خیال
سوچتی ہوں تو اور الجھتی ہوں
اک یقین بھی مرے گمان میں ہے

**ایک پروفیشنل ماں کی کہانی وہ اپنے بچوں سے غافل ہو گئی تھی**

"ارے میری جان شاہ بانو! تم یہ بات understand کرنے کی کوشش کرو کہ وہ مر جائے گی مگر اُس آٹھویں اولاد کو جنم ضرور دے گی۔ ہم جتنا بھی سمجھا لیں، کچھ فرق نہ پڑے گا، اُس کو اپنی موت کی بال برابر بھی پروا نہیں ہے۔" ارم نے غصے سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

"کیوں، اس کی زندگی پر اس کا کوئی حق نہیں، وہ مر جائے گی۔" شاہ بانو کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"مرے یا نا مرے، اگر وہ abort کروائے گی تو اُسے divorce کا تحفہ ملے گا۔ ہماری society ایسے ہی built ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" فاروق نے ارم، شاہ بانو نواز کی باتوں سے اختلاف کیا تھا۔

ارم، شاہ بانو اور فاروق ایک سرکاری اسپتال میں ہاؤس جاب کر رہے تھے، چند ماہ بعد انہوں نے MBBS ڈاکٹر بن جانا تھا۔ یہ تینوں دوست ہونے کے علاوہ پڑوسی بھی تھے۔ شاہ بانو کی منگنی ایک درمیانے طبقے کی فیملی میں ہو چکی تھی۔ اس کا منگیتر ایک شپنگ کمپنی سے وابستہ تھا، دوسری طرف ارم اور فاروق ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے اور شریکِ زندگی بننے کے خواب بھی دیکھ رہے تھے۔

"افسوس، صد افسوس، وہ مر گئی، اس کا آٹھواں بچہ پنا ماں کے رہ گیا۔" شاہ بانو نے بہت اداسی سے کہا تھا۔

"ارے بیٹا! ہم سب کو ایک دن موت سے ملاقات کرنی ہے تو غم کاہے کا؟ اور انسان کی زندگی میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اسے ہنس کر یا رو کر قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔" ہمیشہ سے مسکراتے اور ہمت دلاتے ڈاکٹر شبیر نے شاہ بانو کو سمجھایا تھا۔

•.....•.....•.....•

زندگی کے آسمان پر وقت کی پرواز جاری رہی تھی اور وہ دن بھی آئے تھے جب فاروق مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ اور ارم چائلڈ اسپیشلسٹ بن گئی تھی جبکہ پروفیشن کے حوالے سے شاہ بانو نے الٹرا ساؤنڈ والے شعبے کا انتخاب کیا تھا۔ نجی زندگی میں فاروق اور ارم میاں بیوی بن گئے تھے اور شاہ بانو کی شادی اپنے منگیتر سے ہو گئی تھی۔

•.....•.....•.....•

وقت کے پرندے نے ایک اور اڑان بھری تھی تو فاروق اور ارم آئرلینڈ میں سیٹ ہو چکے تھے جبکہ اس دوران میں شاہ بانو دو بیٹیوں شگفتہ اور ماہ نور کی ماں بن چکی تھی۔ اُس کی موبائل الٹرا ساؤنڈ سروس دن رات جاری تھی۔ شاہ بانو کا میاں اچانک ہی شپ کی نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ خود اپنے پروفیشن کے ذریعے پیسا کمانے کی مشین بنی ہوئی تھی۔ اُس کا مقصد صرف اور صرف اپنی بیٹیوں کو پڑھا لکھا کر اُن کا مستقبل اعلیٰ بنانا تھا تاکہ وہ زندگی کے ہر امتحان میں سرخرو ہوں مگر قدرت کو تو شاہ بانو کے ہی امتحان مقصود تھے شاید!

•.....•.....•.....•

"شانی، مانی، تم دونوں نے اپنے روم کی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" شاہ بانو نے اپنی بیٹیوں کے کمرے کی بے ترتیبی اور پھوہڑ پن دیکھ کر انہیں آواز دی تھی۔

"مما، کیا مصیبت ہے، کیوں چیخ رہی ہیں؟ ہم بہرے ہیں کیا؟" شانی نے غصے بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"ایسے بات کرتے ہیں ماں سے؟ اتنی مہنگی تعلیم سے یہ سیکھ رہی ہو تم؟ میں سارا دن محنت کرتی ہوں تم دونوں کو اچھا لائف اسٹائل دینے کے لیے!" شاہ بانو نے ناراض ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"تو ہم کیا کریں، آپ نے کوئی احسان تو نہیں کیا؟ دنیا کے سارے والدین ایسا ہی کرتے ہیں اور ہاں! میں اب تیرہ سال کی ہوں اور مانی چودہ سال کی ہے، ہم grown-up بچے ہیں، آپ کو ہم سے ہر وقت ایسے ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرنی چاہیے۔" شگفتہ



نے الٹا شاہ بانو کو بہت کچھ سنا دیا تھا۔

"تمہاری grown-up کی ایسی کی تیسی، اپنی الماری سمیٹو فوراً اور آج سے تم دونوں کچن اور گھر کے کاموں میں میری مدد کرو گی، بس!" شاہ بانو نے گویا حکم نامہ جاری کیا تھا۔

"my foot kitchen chores." اور ہمارے پاس بہن جی والے کاموں کے لیے ٹائم نہیں ہے، آپ کو تو صرف لیکچر دینا اور پیسے کمانا آتا ہے، کیوں شانی، بولو، میں صحیح کہہ رہی ہوں نا؟"

"Yes, you are right Sis!" شانی نے بہن کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"تم دونوں تو بہت ہی زیادہ بدتمیز ہو گئی ہو، اپنی ماں کی ذرا قدر اور لحاظ نہیں ہے کہ میں صبح پانچ بجے اٹھتی ہوں، گھر کے سارے کام کر کے کلینک جاتی ہوں اور گھر کے حوالے سے باہر کے تمام کام بھی نمٹاتی ہوں، تمہارے پاپا تو سوائے آرام کے کچھ کرتے نہیں ہیں۔"

"مما، آپ نے جو کیا، وہ اپنی مرضی سے کیا، پپا کو آپ نے خود دست و کاہل بنایا، اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے، یہ ٹھیک ہے، آپ گھر کے سب کام کرتی ہیں مگر آپ کے پاس ہمارے لیے تو کبھی بھی ٹائم نہیں رہا ہے اور ہاں! کل آپ میری E-mail کیوں چیک کر رہی تھیں؟ کبھی آپ ہمارے cell پر آئے sms چیک کرتی ہیں! آخر یہ سب کیا ہے؟" شگفتہ نے بدتمیزی سے پوچھا تھا اور پھر ماں کی بات یا جواب سنے بغیر پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

شاہ بانو کی آنکھوں سے بے ساختہ ہی آنسو جاری ہو گئے تھے اور پھر وہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی اور روتے ہوئے ہی اپنے اللہ کو پکارا تھا۔

"اے اللہ! اولاد دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور اس کی اچھی تربیت ماں باپ کے لیے سب سے زیادہ ضروری کام ہے۔ میں نے اِن کی ہر خواہش پوری کی، ہر آسائش دی، اعلیٰ تعلیم بھی دی مگر ماں کی طرف سے اولاد کے لیے سب سے بڑا تحفہ تو اچھی تربیت اور مذہبی تعلیم ہے۔ آج کل کے نام نہاد انگریزی تعلیمی ادارے بہت بڑی بڑی فیسیں لیتے ہیں، فرنگی زبان کا کورس بھی رکھتے ہیں مگر تعلیم کے صحیح معنی تک نہیں جانتے۔ میں اپنی اولاد اُن کے حوالے کر کے خود بے بہرہ ہو گئی تھی۔ اے اللہ! تو مجھے معاف کر دے۔ میرے مالک! میرے رب العالمین! مجھ پر اپنا کرم کر۔" انہی آنسوؤں بھری دُعاؤں کے درمیان اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

اذانِ مغرب کی آواز سے شاہ بانو کی آنکھ کھلی تھی۔ امام صاحب پکار رہے تھے۔ "آؤ فلاح کی طرف!" یہ بات دل کو لگی تھی اور پھر دل نے ہی اُس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ "شاہ بانو! تو نے بہت عرصے سے نماز نہیں پڑھی۔ آج تو جائے نماز پر بیٹھ جا۔ وہ بڑا مہربان ہے، تجھ پر ضرور رحم کرے گا۔"

شاہ بانو نے نماز شروع ہی کی تھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور جب دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے تو آواز کانپ رہی تھی، کچھ بولا نہ گیا تھا، بس وہ ہچکیاں لے کر روتی ہی رہی تھی۔

یہ دوسرے دن کی بات ہے، شاہ بانو کسی کام کے لیے گھر سے نکلی تھی تو اُس کی اپنی ایک پرانی دوست ثمرین سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی تھی۔ باتوں باتوں میں اُس نے ثمرین سے اپنی بیٹیوں کا مسئلہ بیان کیا تھا تو اُس نے ایک کتاب "Bringing up your children in Islam" شاہ بانو کو پڑھنے کے لیے دی تھی اور کہا تھا کہ اپنی بچیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو، ابھی بھی وقت گیا نہیں ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

شاہ بانو نے وہ کتاب پڑھی تھی، اُس کتاب میں

مولانا صاحب نے بچوں کے تمام مسائل پر روشنی ڈالی تھی۔ یہ کتاب انگریزی میں تھی مگر بہت اچھی تھی۔ اس میں بچوں کی تربیت کیسے اور کس طرح کی جائے' وضاحت سے بیان کیا گیا تھا اور بچوں خصوصاً بیٹیوں کی پرورش کے سلسلے میں والدین خاص طور پر ماں کے فرائض بتائے گئے تھے۔

شاہ بانو نے جب اپنے ماضی پر نگاہ ڈالی تھی تو اُسے احساس ہوا تھا کہ وہ تو اِن باتوں اور فرائض سے دور نہیں' بہت دور رہی تھی لیکن اَب اُس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اَب اپنی بیٹیوں کو مکمل وقت دیتے ہوئے اُن کی تربیت کرے گی۔''

اُس روز دوپہر میں شاہ بانو نجانے کتنے عرصے کے بعد دوپہر کے وقت کا کھانا تیار کرنے کے بعد ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھی۔

''یہ کھانا ہم نے نہیں کھانا۔ ہم ہوم ڈلیوری سے پیزا منگا کر کھائیں گے۔'' دونوں بہنوں نے بیک وقت کہا تھا۔

''آج تو lunch میں گھر کا یہی کھانا ملے گا' کھاؤ نہ کھاؤ' مرضی تمہاری ہے!'' شاہ بانو نے اپنی پلیٹ میں سبزی کا سالن نکالتے ہوئے کہا تھا۔

''ہونہہ۔'' مانی نے برا سا منہ بنایا تھا پھر جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ ''مما' تین دن سے ہماری maid بشیراں' ہمارا روم کیوں صاف نہیں کر رہی؟''

''میں نے ہی بشیراں کو منع کیا تھا کہ اپنا کمرا اب تم دونوں خود صاف کرو گی۔'' شاہ بانو نے بہت رسان سے جواب دیا تھا۔

''مما! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' شانی نے غصے سے بھڑکتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میری بیٹیوں کی طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے' غلطی میری ہے کہ تم دونوں بہنوں کو اتنی آزادی دے دی کہ تم میرے سر پر بیٹھنے کی کوشش کرتی ہو' یہ بھول جاتی ہو کہ میں تمہاری ماں ہوں' نوکرانی نہیں!'' شاہ بانو نے بہت ٹھنڈے اور سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

"What is wrong with you Mom?" دونوں بیٹیوں کے منہ سے ایک ساتھ یہ جملہ ادا ہوا تھا۔

"nothing is wrong with me my dear!" بس ذرا دیر سے اپنی غلطی کے احساس کے ساتھ تمہاری تربیت کا خیال آیا ہے۔''

شاہ بانو نے اَب گھر اور بیٹیوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے کے ساتھ اُن پر نظر رکھنی شروع کر دی ہے کہ وہ کیا کرتی ہیں؟..... اُن کا دن کیسے گزرتا ہے؟..... اُن کے کون دوست ہیں؟ کمپیوٹر پر کیا دیکھتی ہیں؟ ان تمام چیزوں پر نظر رکھنے کے بعد شاہ بانو کو یہ جان کر بے حد افسوس ہوا ہے کہ دونوں بیٹیاں کافی حد تک spoil ہو چکی ہیں مگر وہ کوشش کر رہی ہے کہ جو نقصان ہو چکا ہے' اَب اُس کی تلافی ہو جائے!! وہ بہت پیار' محبت اور شفقت کے ساتھ اپنی بیٹیوں کو بدلنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ پیار میں بہت طاقت ہے۔ اُسے یقین ہے کہ ایک دن شانی اور مانی اُس کی بہت اچھی بیٹیاں بن جائیں گی.....!

آپ تمام پڑھنے والے بھی شاہ بانو کے لیے اُس کے مقصد میں کامیابی کی دُعا ضرور کریں اور اگر اپنے آس پاس کوئی شاہ بانو جیسی پریشان ماں دیکھیں تو اُس کی مدد ضرور کیجیے گا۔ ہم مغرب کی نقالی میں اپنی بہترین اقدار سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ''معاشرہ بگڑ گیا ہے۔'' یہ کہنا بہت آسان ہے اور معاشرے کو اچھا بنانا بہت مشکل ہے مگر ہم کوشش تو کر سکتے ہیں ناں؟ اور کیوں نا اس کوشش کی ابتدا اپنے گھر سے کی جائے؟؟ کہ یہ اپنے گھر کی بات تو ہے!

.....☆☆.....



## جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

شیخ معظم الٰہی

# مجھے اونچا اُڑنا ہے

قابل اجمیری کا خیال

اجل بھی اس کی بلندی کو چھو نہیں سکتی

وہ زندگی جسے احساسِ زندگی ہو جائے

وہ رفعت کی آرزو میں ذلت کی پستی میں جا گرا تھا

انسان کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تمام مخلوقات سے اعلیٰ وارفع مقام عطا کیا ہے حتیٰ کہ فرشتوں کو بھی اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا یعنی انسان کا رتبہ فرشتوں سے بھی اونچا ہے مگر انسان خود اپنے اعمال کے ہاتھوں ذلت کی گہرائی میں گر جاتا ہے۔ وہ نیکی کے راستوں پر چلنے کے بجائے برائیوں کی راہ کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی آنکھ تب کھلتی ہے جب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

یہ سچی کہانی بھی ایک ایسے ہی انسان کے متعلق ہے جو کہ میرا دوست تھا۔ یہاں میں اس کا فرضی نام امتیاز لکھ رہا ہوں۔ امتیاز کا اور میرا بچپن اکٹھا ہی گزرا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ وہ اپنے تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ بہن کوئی نہیں تھی۔ اس کی ماں کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا جبکہ والد کا کپڑے کا کاروبار تھا اسی لیے گھر میں خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ اس کے دونوں بھائی اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹاتے تھے اور امتیاز ابھی پڑھ رہا تھا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ ''دیکھنا' میں ایک دن بڑا آدمی بنوں گا چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے' کچھ بھی کا مطلب غلط راہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔'' جب وہ اس طرح کی باتیں کرتا تھا تو میں سمجھاتا کہ اس قسم کی راہوں پر چلنے سے انجام میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملتا مگر وہ ہمیشہ میری باتوں کو مذاق میں اڑا دیتا تھا۔

دن گزرتے رہے' ہم دونوں نے ایف اے اور پھر بی اے اکٹھے ہی کیا تھا۔ بی اے کے بعد امتیاز نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا کہ وہ اب خوب پیسہ کمانا چاہتا تھا مگر میں نے بی اے کرنے کے بعد سی ایس ایس کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر کے محکمۂ پولیس میں ملازمت جوائن کر لی اور ٹریننگ کے لیے چلا گیا۔

جب تین سال بعد اے ایس پی آفیسر کی حیثیت سے میری واپسی ہوئی تو وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ چلو اب تم پولیس آفیسر بن گئے ہو اب تمہاری مدد کی جب ضرورت ہوگی تو تم کام آ جاؤ گے۔''

اس ملاقات کے بعد میری اور امتیاز کی ملاقات پھر نہ ہو سکی کیونکہ میرا تبادلہ مختلف شہروں میں ہوتا رہتا تھا۔ میں ایک فرض شناس پولیس آفیسر تھا جس شہر میں بھی جاتا' وہاں جرائم کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کرتا تھا اور اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہتا تھا۔ اسی طرح جرائم کا قلع قمع کرتے بارہ سال بیت گئے' اس وقت میں ایس ایس پی کے عہدے پر پہنچ چکا تھا پھر ایک روز میری ڈیوٹی میرے شہر میں لگ گئی۔ اس وقت شہر کے حالات بہت زیادہ خراب تھے' ہر طرف لوٹ مار اور اسٹریٹ کرائمز کا بہت زور تھا' لوگ ان وارداتوں سے تنگ آ چکے تھے' رات کے وقت لوگ گھر سے نکلنے سے ڈرتے تھے' روزانہ دس' پندرہ افراد لٹنا عام سی بات تھی' کسی کا موبائل فون چھین لیا جاتا تو کوئی اپنی موٹر سائیکل سے محروم کر دیا جاتا۔ اگر کوئی مزاحمت کرتا تو لٹیرے اسے قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ ان جرائم کے باعث پولیس پر بہت زیادہ دباؤ تھا' اس پر تنقید ہو رہی تھی' میڈیا شور مچا رہا تھا کہ پولیس اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھا رہی ہے' لوگوں کی جان و مال کا تحفظ ختم ہو چکا ہے۔

جب میرا تبادلہ یہاں ہوا تو میں نے فوری طور پر جرائم کے خاتمے کے لیے کچھ ضروری اقدامات کیے جن سے ہمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ کچھ مجرم پکڑے گئے' ان پر کیس چلے اور انہیں سزائیں ہوئیں۔ پولیس کی کامیابی سے چند ماہ امن و امان سے گزر گئے اور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا مگر کچھ عرصہ بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا اور



وارداتوں میں پہلے سے زیادہ شدت آ گئی پھر ہاہا کار مچ گئی۔ اس صورتِ حال میں چند ایمان دار پولیس آفیسروں کے ساتھ میں نے ایک اہم میٹنگ کی جس میں ان جرائم پر قابو پانے کا حل تلاش کیا گیا۔ اس میٹنگ میں ایک خفیہ مشن تشکیل دیا گیا جس کے بارے میں ڈیپارٹمنٹ کے صرف چند افسران کو ہی آگاہ کیا گیا تھا۔ ہمارے اس خفیہ مشن کے بہترین اثرات مرتب ہوئے اور شہر میں کافی حد تک جرائم میں کمی آ گئی جہاں روز پندرہ وارداتیں ہوتی تھیں' اب وہاں گھٹ کر صرف دو یا تین رہ گئیں۔ میڈیا اور پریس والے بھی آرام سے بیٹھ گئے اور عوام نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا حسبِ معمول اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھا کہ ایک تھانے دار چند سپاہیوں کے ساتھ ایک شخص کو گرفتار کیے میرے دفتر میں داخل ہوا۔

''سر.....! یہ شخص ان وارداتوں کا سرغنہ ہے جو گزشتہ ماہ شہر میں ہوتی رہی ہیں۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے اور پورے گروہ کو گرفتار کیا ہے۔''

''اسے کہاں سے گرفتار کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سر.....! ہمیں فون پر اطلاع ملی کہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہوٹل میں ایک شخص ٹھہرا ہوا ہے' اس کی حرکتیں مشکوک ہیں۔ میں فوراً چند سپاہیوں کے ساتھ اس ہوٹل پر پہنچا اور اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے ساری وارداتوں کے علاوہ متعدد قتل کی وارداتوں کا بھی اعتراف کیا ہے جو گزشتہ ماہ ہوئی تھیں۔''

تھانے دار کی باتیں سننے کے بعد میں اس شخص کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے پر ہلکی پھلکی داڑھی تھی' وہ شکل سے اچھے گھرانے کا ضرور لگتا تھا۔ اچانک میں چونکا کیونکہ وہ کوئی اور نہیں' میرا بچپن کا دوست امتیاز تھا جو بہت اونچا اڑنے کی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کوئی شناسائی نہیں تھی' وہ مجھے پہچان نہیں پایا تھا کیونکہ بارہ سال کے عرصے میں میری شکل کافی بدل گئی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میرے سوال پر اس نے اپنا نام امتیاز بتایا۔

''کیا تم نے مجھے پہچانا' میں کون ہوں؟ ذرا غور سے میری شکل دیکھو۔'' اس نے سر اٹھا کر جب میری طرف غور سے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک چمک لہرائی مگر اگلے ہی لمحے ایک دم غائب ہو گئی۔

''امتیاز.....! تم اس برے راستے پر کیوں چل پڑے؟ تمہارے والد تو خود ایک بہت بڑے بزنس مین تھے؟''

''میں بہت اوپر جانا چاہتا تھا اور بہت امیر بننا میرا خواب تھا۔''

''اب دیکھ لیا ان کاموں کا انجام؟ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا' قانون کے مطابق تمہیں سزا ہوگی۔ ممکن ہے' تمہیں پھانسی ہو جائے کیونکہ تم نے تقریباً بارہ آدمیوں کا ناحق خون بھی کیا ہے۔'' وہ سر جھکائے میری باتیں سن رہا تھا پھر تھانے دار اسے لے گیا۔

عدالت نے امتیاز کو بارہ مرتبہ سزائے موت اور بیس لاکھ روپے جرمانے کی سزا دی اور اس طرح اونچائی پر اڑنے کی خواہش رکھنے والا ایک انسان موت کی پستیوں میں جا گرا۔ جب بھی میں امتیاز کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے بہت دکھ اور افسوس ہوتا ہے۔ میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔ (آمین!)

.....☆☆.....

محمد سلیم اختر

# ماں تجھے سلام

عارف شفیق کا خیال

مر گئی ہے جب سے ماں
تک رہا ہوں آسماں

**دنیا کی اس عظیم ہستی کی کہانی جس کا پیار خالص ہوتا ہے**

وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ اور ٹھٹھرتی ہوئی صبح تھی۔ میں اپنا بستہ بغل میں دبائے تیز تیز اسکول کی طرف جا رہا تھا۔ رفتار کی تیزی نے سردی کی شدت میں کمی کر دی تھی پھر بھی میں وقت پر اسکول نہ پہنچا۔ جب میں اسکول پہنچا تو اسمبلی ہو چکی تھی اور ہیڈ ماسٹر صاحب بنفسِ نفیس لڑکوں کے یونیفارم اور ان کی صفائی ملاحظہ فرما رہے تھے۔ میں ڈرتے ڈرتے اسکول کے صحن میں داخل ہوا۔ میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی نظروں سے چھپ کر لڑکوں کے پیچھے دبک کر بیٹھ جانا چاہتا تھا لیکن میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی عقابی نظروں سے نہ بچ سکا۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی لائن میں کھڑا کر دیا۔ میرا یونیفارم گندہ تھا اور میرے پھٹے ہوئے جوتوں پر پالش بھی نہ تھی لہٰذا مجھے بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ ماسٹر صاحب کا موٹا بید ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں پر تلوار کی سی کاٹ سے پڑا اور درد کی لہر میرے تمام جسم میں سرائیت کر گئی۔ یہ میری پہلی سزا تھی جو مجھے کپڑے گندے ہونے کی وجہ سے ملی تھی۔ ماسٹر صاحب کی عقابی نظر میرے لباس کے میل کچیل تک تو پہنچ گئی لیکن وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ میری آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے بے بسی کے آنسو ان سے کتنے اَن کہے راز کہہ رہے تھے۔

''کل تمہارا یونیفارم دھلا ہوا ہونا چاہیے ورنہ تمہیں کلاس میں نہیں بیٹھنے دیا جائے گا۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے خوفناک آواز میں کہا۔

•.....•.....•

میرے بھوکے پیٹ میں خوف کے مارے مروڑ اٹھا' میں نے تو دو دن سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھایا تھا' بھلا کپڑے دھونے کے لیے صابن کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ دل میں ایک عجیب سی کشمکش جاری تھی' جی چاہتا تھا' دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دوں۔ میرے اندر آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی' بھوک اور کل دوبارہ گندی یونیفارم میں اسکول جانے کا خوف مجھے بے چین اور خوف زدہ کیے جا رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ میں ان نامساعد حالات کا مقابلہ کیسے کر پاؤں گا؟ غربت اور تنگدستی میرے لیے ایک جرم بن گئی تھی۔ بجلی کی سی چمک سے ایک خیال میرے ذہن میں آیا' ناصر میرا دوست اور کلاس فیلو تھا' وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میں اس کے گھر بلا روک ٹوک آتا جاتا تھا۔ اس روز بھی میں اس کے گھر بلاوجہ ہی چلا گیا۔ میں اس کے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ ڈرائنگ روم سے ملحق ان کا ایک غسل خانہ تھا' میں پیشاب کے بہانے غسل خانہ میں گیا اور وہاں سے صابن کی ٹکیہ اٹھا کر اپنی قمیص کی جیب میں ڈال لی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ضمیر نے مجھے ملامت کرنا چاہا لیکن میں نے اسے مہلت ہی نہ دی اور گھر لوٹ آیا۔ لرزتے ہونٹوں اور کانپتے ہاتھوں سے میں نے صابن کی ٹکیہ والدہ صاحبہ کو دیتے ہوئے کہا۔

''امی.....! میرے کپڑے دھو دیں۔''

والدہ صاحبہ نے میرے ہاتھوں میں استعمال شدہ صابن کی ٹکیہ پر ایک نظر ڈالی۔ چند ثانیے کے مختصر سے عرصے میں درجنوں سوال ان کے چہرے پر ابھرے اور ڈوبے پھر انہوں نے مجھ سے بڑی دھیمی سی آواز سے پوچھا۔

''یہ تو کہاں سے لایا ہے؟''

میں کچھ جواب نہ دے سکا تو ایک لمحہ بعد ان کی تحکم بھری آواز ابھری۔

''میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتا کہ تو یہ صابن کہاں سے لایا ہے؟''

مجھ میں اتنی جرأت کبھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ والدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولوں۔ یہ اس مقدس ہستی کا دبدبہ تھا یا میرا جذبۂ احترام تھا کہ میں نے ان کو سچ سچ بتا دیا۔ میرا سچ سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بولیں۔

''بیٹا.....! میں جانتی ہوں کہ تم نے مجبوراً ایسا کیا ہے لیکن برا کام بہر حال برا ہے۔ جاؤ بیٹا.....! اسے وہاں ہی رکھ آؤ جہاں سے اٹھایا تھا۔ جاؤ' جلدی جاؤ بیٹا.....!''

•.....•.....•

جب میں دوبارہ گھر لوٹا تو میری والدہ سوت کے اٹوں کو سنوار رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ جو پہلے کانپتے تھے' اب ان میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ چرخا جس پر کبھی انہوں نے سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر میٹھے نغمے گائے تھے' مزدوری کرنے کے لیے تیزی سے چل رہا تھا۔ تمام رات چرخے کی گھوں گھوں میرے اعصاب پر سوار رہی اور میں دل میں اپنے آپ کو مجرم سمجھتا رہا۔

اگلے دن جب میں اسکول گیا تو میری یونیفارم دھلی ہوئی تھی۔

.....☆☆.....

## ماں

مجھے رات گئے باہر رہنے پر
روکتی رہتی تھی
میں اس کی باتیں سن کر
ہنسی سے اُچھال دیتا تھا
کل سے جلدی آؤں گا
کہہ کر ٹال دیتا تھا
وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیتی تھی
اور پیار سے چپت لگا دیتی تھی
میں اسے بہت ستاتا تھا
اسے بہت نخرے دکھاتا تھا
وہ ہر بار میرے ناز اُٹھاتی تھی
وہ میرے صدقے واری جاتی تھی
رات کے کسی پہر بھی گھر جو آتا
اس کو ہمیشہ اپنا منتظر پاتا
دِن رات اس کے پیار کی برسات ہوتی
اس کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ ہوتیں

## پراب

زندگی میں وہ بات نہیں ہے
کیونکہ وہ میرے پاس نہیں ہے
ماں کے بغیر گھر ایک ویران صحرا ہے
اس کے پیار بنا دل کی زمین سوکھی ہے
ایک وہی مخلص تھی ساری دنیا روکھی ہے
گھر جب بھی لوٹوں وہ نگاہیں ڈھونڈتا ہوں
سماجاؤں جن میں وہ ماں کی بانہیں ڈھونڈتا ہوں
ان جگہوں کو دیکھتا رہتا ہوں
جہاں بیٹھ کر وہ میرا انتظار کرتی تھی
میں گھنٹوں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں
جہاں وہ مجھے پیار کرتی تھی
تیری دعا کے بغیر سڑکوں پر نکل جاتا ہوں
ہر قدم ہر راستے پر ٹھوکر کھاتا ہوں
ماں! تو میرے لیے خدا کی صورت ہے
تو لوٹ آ کہ مجھے ابھی تیری ضرورت ہے
میں اب جلدی گھر لوٹ آؤں گا
خدا کی قسم تجھے کبھی نہ ستاؤں گا
تیری خدمت صبح شام کروں گا
جو کہے گی وہ ہر کام کروں گا
میرے کان پھر سے تیرے منتظر ہیں
ایک بار پھر وہ لوری سنا دے
ایک عرصہ ہوا میں سویا نہیں
تو اپنی گود میں مجھے سُلا دے
کاش کبھی ایسی دُعائیں نہ مرتیں
کاش کسی کی مائیں نہ مرتیں
کاش پیار بھری صدائیں نہ مرتیں
کاش جنت کی ہوائیں نہ مرتیں

انتخاب: محمد سلیم اختر۔ راولپنڈی



**طویل کہانی** ''سچی کہانیاں'' کی ایک مقبول و معروف لکھاری کی طویل کہانی' اقساط میں

فاطمہ بلگرامی

# جن آنکھوں میں خواب بستے تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ ہی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیاد مکاں رکھی تھی

**سچی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تحیر خیز سلسلہ۔ آخری قسط**

**خلاصہ:** داؤد عرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایشیائی افتخار الملک نامی شخص سے شادی کی تھی..... اس رشتے کی پاداش میں میری کے ارب پتی باپ لارڈ ڈلفی نے اسے جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا..... اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزاری اور مر گئی۔ لارڈ ڈلفی کی موت کے بعد یہ وصیت سامنے آئی کہ اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد عرف ڈیوڈ یہ جائیداد قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جب کہ لارڈ ڈلفی کی اس جائیداد پر ایک یہودی گروپ کی بھی نظر ہے۔ داؤد کی اس گروپ سے ایک جھڑپ بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی فیملی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس فیملی کی ایک لڑکی کو بہن بنا لیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ حالات کا مارا داؤد پاکستان اپنے باپ افتخار الملک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ پاکستان میں داؤد کی رشتے داروں سے ملاقات ہوتی ہے..... داؤد کی ملاقات رابیل سے ہوتی ہے جو اسے اپنی کہانی سناتا ہے اور یہ کہانی کردار در کردار آگے بڑھتی ہے، رابیل خود اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ اُسے ایک سازش کے ذریعے ہیروئن کا عادی بنایا گیا..... اور پولیس کی نوکری سے نکلوایا ہی نہیں، اُس سے مجرمانہ عمل کرانے کی بھی کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ جیل پہنچ گیا..... اور پھر جیل سے فرار ہوتا ہے، داؤد وغیرہ کی انڈیا آمد ہوتی ہے، یہاں مختلف اوقات میں رابیل داؤد کو اپنی کہانی سناتا رہتا ہے۔ اس کہانی کے اختتام پر ایک نئی صورتِ حال سامنے آتی ہے جس میں داؤد اور اس کے ساتھ بھارت جانے والے لوگوں کو ہولناک حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے: **اور اب آگے پڑھیے:**

جہاں میں اترا تھا وہ ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ عمارت کے باہر فوجی جوان سنگین تانے پہرے پر کھڑے تھے۔ ہمیں اس عمارت میں لے جایا گیا۔ میں نے جواد اور اس بچے دونوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ بچہ محبت کی مہک پا کر سو گیا تھا۔ اندر پہنچتے ہی عمارت کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ اندر بہت سارے مرد عورت بیٹھے لیٹے

تھے۔ بچے بھی تھے جن کے چہروں پر خوف ہی خوف تھا۔ اس کمرے میں گیس کا ہنڈا جل رہا تھا جس کی روشنی ہر جانب پھیل رہی تھی۔ تاریکی کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ تاریکی اگر تھی تو لوگوں کے چہروں پر۔ ہر چہرے پر الگ کہانی تھی۔ لٹنے بچھڑنے کی کہانی۔۔

میں بھی ان کے درمیان بیٹھ گیا۔

میرے برابر بیٹھے شخص نے میری طرف جھک کر کہا۔ ''میں ریڈیو بچالانے میں کامیاب ہوگیا۔ خبریں سنو گے؟ پہلے اصلی خبر سنو، میرا گھر لٹ گیا۔ بیٹا مار دیا گیا۔ بیٹی اغوا ہوگئی۔ لیکن آل انڈیا ریڈیو مسلسل کہہ رہا ہے۔ شہر میں اب امن ہے۔ گھروں سے دھواں اب بھی اٹھ رہا ہے مگر شہر میں امن ہے۔ اور سنو گے؟'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کا رونا تھا کہ ہر طرف بین شروع ہوگیا۔ شاید سب کو اپنے زخم یاد آرہے تھے۔ تبھی ایک کڑکتی ہوئی آواز گونجی۔ ''خبردار.... خاموش.... اب کوئی رویا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔''

یکلخت زندگی کی علامت ختم ہوگئی، ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ مگر میرے اندر کا انسان رو رہا تھا۔

روتے بلکتے۔ سوتے جاگتے رات کٹ گئی۔ صبح کا اجالا پھیل گیا۔ میں اٹھ کر صحن میں آگیا۔ مجبوری انسان کو بے شرم بنا دیتی ہے۔ وہاں ایسی عورتیں بھی تھیں جن کے اطوار بتا رہے تھے کہ اس سے پہلے انہیں کھلے آسمان نے بھی نہیں دیکھا ہوگا مگر اب وہ مردوں کے درمیان بیٹھنے پر مجبور ہیں۔ وہ حیا سے کٹی جارہی تھیں۔ خود میں سمٹی سمٹی، کونے کھدروں میں چھپی جارہی تھیں۔ مگر بھوک کی مجبوری انہیں روٹی کے لیے قطار میں کھڑے ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔

مردوں کی قطار میں میں بھی کھڑا ہوگیا تھا۔ روٹی لے کر پلٹا تو دیکھا کہ جواد اٹھ گیا ہے۔ مگر بچہ ابھی بھی بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے ایک روٹی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ''بیٹے کھالو۔''

وہ روٹی کو ہاتھ میں پکڑ کر چوس رہا تھا کہ میں نے اجنبی بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا اٹھ جاؤ صبح ہوگئی۔''

بچہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ ''نہیں... نہیں... میری امی کو مت مارو..... اللہ۔''

میں نے بچے کو سینے سے لگالیا۔ اور پیٹھ تھپک کر بولا۔ ''ڈرو نہیں بیٹا۔ یہ میں ہوں۔''

''امی میری امی.....'' بچہ سسکنے لگا۔ ''انہوں نے میری امی کو چھریوں سے مارا..... میری امی..... وہ سب بہت ظالم تھے..... گنیش چاچا، جوگیشر چاچا، سہدیو کرمی سب نے مل کر مارا..... امی کا جگہ جگہ سے گوشت کاٹ لیا۔ امی میری امی.....''

''بیٹے تمہاری امی کو کچھ نہیں ہوا۔ تم نے خواب دیکھا ہوگا۔'' میں نے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

''نہیں نہیں..... میں نے سب دیکھا تھا۔ جب حملہ ہوا امی نے جلدی سے مجھے بڑے صندوق کے پیچھے چھپا دیا۔ میں نے خود دیکھا..... امی کمرے میں ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھیں..... جوگیشر منڈل... کیشو لال.... سب مل کر امی کو چھرے سے مار رہے تھے..... اتنا خون نکلا تھا یہ اتنا..... امی گر گئیں تو انہوں نے امی کا سینہ کاٹ لیا... امی میری امی.... میں دودھ پیوں گا... امی بھوک لگی ہے....'' وہ پھر سے رونے لگا۔

پتا نہیں اتنا کچھ دیکھنے کے بعد اس کا دماغ پھر گیا تھا یا وہ اب تک اثر سے نکل نہیں پایا تھا۔ اس کی دماغی حالت کو سدھارنے کے لیے۔ توجہ بٹانے کے لیے میں نے دوسری روٹی اسے دے کر کہا۔ ''کھاؤ بیٹا۔ امی ابھی

آجائیں گی۔"

روٹی دیکھ کر اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ شاید اسے شدید بھوک لگی تھی۔ وہ گود سے اتر آیا۔ اس نے روٹی کو بغور دیکھا۔ نوالہ توڑا۔ منہ تک لے جاتے جاتے نوالہ روک لیا پھر جلدی سے اسے منہ میں رکھ لیا۔ اس بچے کی ایک ایک حرکت عجیب تھی۔ پھر وہ جلدی جلدی نوالہ توڑنے لگا۔ کھانے لگا۔

جب روٹی ختم ہوگئی تو میں نے پوچھا۔ "بیٹے! اور کھاؤ گے۔"

"نہیں کہہ کر اس نے میری گود میں سر رکھ دیا۔ میں دھیرے دھیرے اس کا سر سہلا رہا تھا کہ وہ پھر چیخ کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں جمع تمام لوگ چونک اٹھے۔

"کیا ہوا بیٹے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ منے کو..... منے کو....."

"کیا ہوا منے کو؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"انہوں نے.... انہوں نے منے کو دیوار میں گاڑ دیا..... دیوار پر ابو کی تصویر لگی تھی۔ اس تصویر کو اتر کر کہا..... مردہ تصویر..... اسے پھینک دیا..... پھر..... پھر ایک نے اس جگہ منے کو دیوار سے لگایا..... اس کے سینے پر..... ننھے سے سینے پر روتے ہوئے منے کے سینے پر منڈل چاچا نے چھری رکھی..... جوگیشور چاچا نے ہتھوڑا اٹھا کر چھری پر مارا..... میرا منا چیخ کر خاموش ہوگیا..... میرا منا....."

میں شش و پنج میں تھا کہ بچے کا کیا کروں..... اس کی ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ اسے کسی کو سونپ سکوں۔ پتا نہیں اس کے عزیز اقارب زندہ بھی ہیں یا نہیں..... ماں کے بارے میں تو بتا رہا تھا مگر باپ کے بارے میں خاموش تھا۔ دوسرے رشتے دار کا بھی کچھ بتا نہیں پایا تھا۔ اس حالت میں اسے کس کے حوالے کروں؟ نفسا نفسی کا وقت تھا۔ خود غرضی عروج پر تھی۔ موت کو سامنے دیکھ کر بھی لوگ خود کو بھول نہیں پا رہے تھے۔ روٹی بٹتے وقت میں نے دیکھا تھا کہ لوگ کمزوروں کو کیسے دھکیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان حالات میں میں کیا کروں سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

اور پھر میں بھی بچے کے ساتھ چیخ چیخ کر رونے لگا تھا' شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جواد جو روٹی چوس رہا تھا پھندا لگنے کی وجہ سے لمبی سانس لے کر خاموش ہوگیا تھا۔ اس کا سر ڈھلک گیا تھا۔ میرے ہاتھ اپنے ہی بالوں کو نوچ رہے تھے۔ موت مجھے اب تک نہیں آئی تھی کہ ایک ایمبولینس آ کر رکی اور سفید کپڑوں میں ملبوس نرسیں اور ڈاکٹرز اترنے لگے۔ دو ڈاکٹر اور ایک نرس میری طرف بڑھے میری حالت دیکھ کر نرس نے میرے بازو میں انجکشن لگا دیا۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ دونوں ڈاکٹروں نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ انجکشن لگنے سے میرا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ مجھے پھر کوئی ہوش نہیں رہا کہ میں کتنے عرصے بے ہوش رہا۔

☆.....☆

آنکھ کھلی تو اسپتال کے کمرے سفید چادر پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ اب تک میں انتہائی ڈراؤنا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ اچانک تڑپ اٹھا، ایک معزز شخص نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور مجھے تسلیاں دینے لگے۔ "آپ پلیز لیٹے رہیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں پاکستانی سفارت خانے سے آیا ہوں۔ جلد آپ کو پاکستان بھجوا دوں گا۔ ہمیں از حد افسوس ہے کہ ہم آپ کے خاندان کو نہ بچا



سکے۔ ان سب کو دفن کر دیا گیا ہے۔ آپ کے گھر کے تمام افراد کے اس بہیمانہ قتل پر مجھے افسوس ہے، آپ بھی صبر کریں۔ اگرچہ سب کا پاسپورٹ ہمیں حویلی کے جلے ہوئے سامان میں مل گیا تھا پھر بھی آپ کی حالت دیکھتے ہوئے ہم نے یہاں روک لیا۔ کیوں کہ آپ کے پاس سے بوسیدہ برٹش پاسپورٹ ملا ہے۔ آپ تو برٹش نیشنل ہیں اگر چاہیں تو یہاں سے ڈائریکٹ لندن جا سکتے ہیں۔"

"نہیں میں پاکستان سے آیا تھا وہیں لوٹ کر جاؤں گا۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔ انتظام کر دیا گیا ہے۔"

واپسی کے وقت میں فلائٹ کی سیٹ سے ٹیک لگائے یہ سوچ رہا تھا کہ کیا بھارت میں مسلمان ہونا جرم ہے؟ کیا یہاں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟

☆.....☆

مجھے ہندوستان سے پاکستان آئے پورے دس دن ہو چکے تھے۔ امی فہمیدہ اور ابو کی کوششوں سے میں بھارت کے دردناک واقعہ کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ فہمیدہ ہمہ وقت مجھے ہنسنے ہنسانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی' یہ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ غم کے بادل دل سے چھٹ رہے تھے اور میں زندگی کے ہنگاموں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اب میں اکیلا بھی شہر دیکھنے نکل پڑتا تھا۔ میں نے اچھی طرح شہر دیکھ لیا تھا۔ ابو نے بتا دیا تھا کہ میں ادھر ادھر زیادہ نہ جایا کروں کیوں کہ ان دنوں شہر کے حالات صحیح نہیں ہیں۔ سیاسی کشمکش جاری ہے۔ یہاں کی ایک پارٹی کے دو دھڑے بن گئے ہیں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ کبھی کبھی غیر متعلق بندہ بھی اس چکر میں آ جاتا ہے۔ اس لیے عقل مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ زیادہ انجان جگہوں پر نہ جایا کروں مگر میں نے ان کی باتوں پر توجہ نہیں دی تھی۔

اُس دن میں صبح صبح گھر سے نکل گیا تھا۔ میں فاطمہ سے ملنے چلا گیا تھا۔ اسی سے جس سے فلائٹ پر لندن سے آتے ہوئے ملاقات ہوئی تھی۔ میں بھارت کے زخم کو بھولنے کے لیے خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لیے اسے فون کیا تھا' کارڈ پر لندن کا پتا درج تھا صرف فون نمبر یہاں کا تھا۔ فون کیا تو اس کے والد نے کال ریسیو کی تھی۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد میں نے فاطمہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے اپنے گھر کا پتا بتا دیا تھا۔ وہ لوگ نارتھ کراچی کے علاقہ بفرزون میں رہتے تھے۔ ان کے یہاں پہنچ کر پتا لگ گیا کہ فاطمہ کیوں اتنا اتراتی ہے۔

وہ بہت ہی معمولی گھر تھا۔ والد کسی محکمے میں کلرک تھے۔ آٹھ بہن بھائی تھے سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ فاطمہ سب سے چھوٹی تھی۔ اُس کی شادی شدہ بہنوں کے شوہر معمولی عہدوں پر تھے اتفاق سے ان کے ایک دور کے رشتے داروں میں کسی کی بیوی مر گئی اس کا ایک چھوٹا بچہ تھا۔ اس نے پیغام دیا۔ لندن کا سن کر اس کے گھر والے فوراً راضی ہو گئے اور فاطمہ بیاہ کر لندن چلی گئی۔ زندگی بھر غریبی میں گزارا کیا تھا اس لیے لندن کی فضا میں پہنچ کر یہ ہواؤں میں اڑنے لگی ہے۔ گھر میں بھی کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ میاں کے امیر ہونے پر مغرور ہے۔ میں نے دو چار باتوں میں ہی جان لیا کہ اس کا میاں بھی بس ایویں سا ہے۔ دو ہزار پاؤنڈ تنخواہ ملتی ہے۔ گویا لندن کے حساب سے غریب تھا مگر میں نے راز کھولا نہیں تھا۔

فاطمہ کے گھر سے واپسی کی اتنی آسانی سے اجازت نہیں ملی تھی۔ اس کے والد بہت اخلاق والے

تھے۔ زبردستی کھانے پر روک لیا تھا۔ کھانا کھاتے کھاتے تقریباً رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ مجھے ٹیکسی مل کر نہیں دے رہی تھی اس لیے میں پیدل پیدل آگے بڑھتا رہا۔ کافی دور جانے کے بعد منی بس ملی جس نے سڑک پر اتار دیا۔ وہاں سے پیدل ہی گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ میری نظر ایک پارک پر پڑی۔ کبھی پارک ہرا بھرا ہوا کرتا تھا مگر اب وہ اجاڑ پڑا تھا۔ ادھر روشنی بھی کم کم پڑ رہی تھی اس لیے وہاں اندھیرا کچھ زیادہ تھا۔ اس اندھیرے میں بھی وہ ہیولے مجھے نظر آ گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نوجوان کو دو آدمی کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ اسے گھونسے بھی مارتے جا رہے تھے۔ میں نے اتنا دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ چیختا ہوا ادھر دوڑا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ آواز لگائی تھی ''خبردار میں گولی چلا دوں گا۔'' میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا مگر انھیں ڈرانے کے لیے میں نے یہ کہا تھا۔

میری آواز پر وہ دونوں گھبرا اٹھے تھے۔ انھوں نے گولیاں بھی چلائی تھیں۔ ایک مجھ پر اور دوسری اس نوجوان پر جس کو کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ میری قسمت کا ستارہ بلند تھا۔ میں اتفاقی طور پر جھک گیا تھا اور یہی بات میری زندگی کی ضمانت بن گئی تھی۔ گولی میرے کان کی لو کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ دوسری گولی انھوں نے لڑکے پر چلائی تھی مگر اس لڑکے کی چیخ سنائی نہیں دی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ میں نے اندھیرے میں بھی چنگاری لپکتے دیکھی جو اس کے جسم سے ٹکرائی تھی۔ انسان کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو زخم کا درد ضرور محسوس کرتا ہے۔ چیخ نہ صحیح سسکاری ضرور لیتا ہے۔ اس نے آواز کیوں نہیں نکالی۔ یہ الجھن ضرور تھی مگر غور کرنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے پھر پوری قوت سے آواز نکالتے ہوئے انہیں دھمکایا تھا۔

مجرم کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو اس کا دل ہمیشہ چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ بھی جرائم پیشہ تھے۔ کسی کی جان لینے جیسا گمبھیر جرم کر رہے تھے۔ میرے چلانے پر ڈر گئے اور گھبراہٹ میں فائر کرتے ہوئے بھاگ اٹھے تھے۔

میں بھاگتا ہوا اس نوجوان کے پاس پہنچا تھا۔ اس کے نزدیک پہنچنے پر ادراک ہوا تھا کہ وہ اس لڑکے کے منہ میں کپڑا ٹھونسے ہوئے تھے، اسی لیے وہ آواز نکالنے سے قاصر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ کھولے۔ لڑکے کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ بمشکل اٹھارہ انیس سال ہو گی۔ بہت حوصلہ مند تھا۔ آزاد ہوتے ہی اس نے کہا ''بھیا آپ کا بہت شکریہ آپ نہ آتے تو یہ لوگ مجھے جان سے مار دیتے۔''

''جان سے مار دیتے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اور کیا اسی لیے تو وہ لوگ مجھے لے کر یہاں آئے تھے۔'' اس نے ہاتھوں میں پڑے نیل کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''کسی کو جان سے مار دینا کیا اتنا آسان ہے۔ پولیس انھیں چھوڑ دیتی' قانون تخت الثرا سے بھی ان کو کھینچ لاتا۔'' تبھی میرا ہاتھ اس کی آستین سے چھو گیا۔ وہ چیچپا رہی تھی۔ شاید خون نکل رہا تھا۔ میں نے چونک کر کہا۔ ''تمہیں گولی لگی ہے کیا؟''

''جی ہاں' بازو میں لگی ہے مگر.....''

''یہ اگر مگر چھوڑو چلو تمہیں اسپتال لے کر چلتا ہوں۔''

''اسپتال جانے کا مطلب ہے مصیبت کو دعوت دینا' آپ جلدی سے پٹی باندھ دیجئے بعد میں



میں پرائیویٹ علاج کرا لوں گا۔''

''یہ تو جان سے کھیلنا ہے۔''

''اس وقت ہم جان ہی سے تو کھیل رہے ہیں۔ ساری دنیا تعصب کی بنا پر ہماری دشمن بن گئی ہے۔ خود ہمارے اپنے بھی اپنے مفاد کی خاطر ہمیں دیوار سے لگانے کی کوشش کرنے کے لیے مفاد پرست افسران کے کندھے پر چڑھ کر ہمارا صفایا کرنے کے لیے شہر میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ جلدی کیجئے۔ گولی کی آواز دور تک گئی ہو گی کسی بھی وقت پولیس آ سکتی ہے۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ہمیں پولیس سے مدد لینے کے لیے پولیس اسٹیشن تک جانا نہیں پڑے گا۔''

''نہیں بھیا! اس وقت ہم پر عرصہ حیات تنگ ہے۔ ہماری پارٹی کو ہر طرف سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔''

میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ کوئی گینگ وینگ کا چکر ہے۔ اس وقت تو میرے فرشتوں کو بھی پتا نہ تھا کہ یہاں سیاسی چپقلش میں بھی خون خرابہ ہوتا ہے۔ سیاست تو رہبری کا نام ہے۔ اسلام کے رہبروں نے کتنی خوبصورتی سے سیاست کر کے دکھائی کہ مدینہ میں ایک کتا بھی بھوکا نہیں رہتا تھا۔ سیاست کرنے والے تو خوف خدا سے لرزنے والے ہوتے ہیں کہ عوام کی حق تلفی نہ ہو۔ اور یہاں اسلام کے دیس میں یہ کیسی سیاست ہو رہی ہے؟ میں نے سوچتے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے لڑکے کو جانے دیا اور خود اپنی گلی کی جانب چل پڑا۔ ابھی میں کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ سامنے سے آتی ہوئی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ میری آنکھوں پر پڑی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ تبھی بریک چرچرائے اور گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سفید رنگ کی ہائی روف تھی۔ اس کا دروازہ کھلا اور دو لڑکے باہر نکلے۔ انھوں نے بغیر کوئی سوال جواب کیے مجھے دھکا دے کر گاڑی میں دھکیلا اور میری کنپٹی پر پستول رکھ کر کہا۔ ''اسی طرح پڑے رہو ورنہ گولی اندر دم باہر۔''

میں کسی جانور کی طرح دو سیٹوں کے درمیان پڑا ہوا تھا اور مجھ پر وہ دونوں چڑھے بیٹھے تھے۔ اپنی درگت بنتے دیکھ میں نے پوچھا ''کیوں بھائی میرا قصور تو بتا دو۔''

''ابھی پتا چل جائے گا۔'' ایک لڑکے نے جواب دیا۔ ''اب خاموشی سے پڑا رہ ورنہ خواہ مخواہ ہمیں بارہ روپے کی گولی خرچ کرنی پڑے گی۔'' میں نے بھی خود کو حالات کے بھروسے پر چھوڑ دیا کہ قسمت سے کون لڑ سکتا ہے جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

کچھ دیر کی ڈرائیو کے بعد گاڑی رکی اور مجھے کھینچ کر نیچے اتارا گیا۔ پھر کھینچتے ہوئے ہی ایک عمارت کے اندر لے گئے۔ اندر لے جا کر ایک کرسی سے باندھ دیا گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ نہ میرے پاس کوئی بڑی رقم ہے نہ کوئی میرے لیے تاوان دے سکتا ہے۔ ابو کی معاشی حالت کے بارے میں بھی اندازہ ہو گیا تھا۔

ابھی میں سوچ میں گم تھا کہ ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر مجھے لانے والے نے کہا۔ ''بھائی یہ ہے وہ جس نے اس حرام زادے کو ہم سے چھینا ہے۔''

اس نوجوان نے بغیر کچھ پوچھے' مجھے ایک تھپڑ رسید کر دیا پھر بولا۔ ''کس یونٹ سے تعلق ہے؟''

''میں تو آپ کے یہاں نیا آیا ہوں۔ مجھے پتا ہی نہیں میرے ایریا کو یونٹ کہتے ہیں یا بلاک۔ مجھے تو صرف

اتنا پتا ہے کہ میں جس محلے میں ٹھہرا ہوں اس کا نام کیا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے تُو کوئی خاص بندہ ہے' بتا اس کو کہاں چھپایا ہے۔ کس کس نے اسے اغوا کرتے دیکھا تھا۔"

"میں نے بتایا نا کہ میں دس دن پہلے ہی لندن سے آیا ہوں۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔ آپ کس کے چھپانے کی بات کر رہے ہیں؟۔"

"لندن سے آیا ہے؟ اس کے معنی ہیں کہ یہ بہت امپورٹینٹ بندہ ہے۔"

پاس کھڑے ایک بندے نے پاکٹ سے بلیڈ نکال کر کہا "یہ ایسے نہیں بتائے گا۔ اس کی پیشانی پر چیرا لگاؤ ہوں۔ کھال اترنا شروع ہوگی تو فر فر بولنے لگے گا۔" پھر وہ قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اچھی نیت سے آگے نہیں بڑھ رہا ہے پھر بھی میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی:

"بھائی میرے پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم کس بندے کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔"

"اتنا تو تُو بھولا نہیں ہے۔ ابے ہم اس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جسے تو نے ہمارے بندے سے بچایا تھا' اُس نے ہمارے تین بندوں کو لڑھکایا ہے۔ اسے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔" اس نے پستول نچا کر کہا۔

پتا نہیں یہ میری قسمت کی خوبی تھی یا اس لڑکے کی بے وقوفی کہ وہ کچھ زیادہ ہی جوش میں آگے بڑھا۔ اس کا پیر میرے پیر سے ٹکرایا اور وہ جھٹکا کھا کر ڈگمگایا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر میری گود میں گرا پھر اچھل کر پیروں میں چلا گیا۔ غفلت کا یہ لمحہ گو مختصر تھا مگر میرے لیے کافی تھا۔ میں اسے گنوا دیتا تو یہ میری حماقت ہوتی۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے چھلانگ لگا دی تھی۔

میرے کودتے ہی مجھ پر ایک ساتھ کئی فائر ہوئے۔ میں گرا تھا اور گرتے ہی میں لڑھکتا چلا گیا تھا۔ کافی دور آنے کے بعد میرا جسم ایک آرائشی ستون سے ٹکرا کر رکا تھا۔ رکتے ہی میں نے خود کو دبکا لیا۔ تقریباً 20 منٹ کے بعد کوئی آتا ہوا نظر آیا۔ اس وقت مجھے ریوالور کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے ہی وہ قریب آیا' مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ میں اُس کی جانب لپکا۔ اس نے کمر میں اڑسا چاقو نکال کر اس کا دستہ میری پیشانی پر دے مارا۔ خون کا گیلا پن مجھے محسوس ہوا۔ دماغ تک ہل گیا۔ میں پیچھے کی جانب جھکا۔ اس نے پھر حملہ کیا۔ میں ایک سرعت سے نہ ہٹتا تو میرے چہرے کا جغرافیہ بدل جاتا' پھر بھی دستہ میرے شانے سے ٹکرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے اس پر تیندوے کی طرح چھلانگ لگا دی اور اُس سے بری طرح ٹکرا گیا۔ اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

وہ مجھ سے ٹکراتے ہی گر گیا تھا لیکن برق سرعت سے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر ہم دونوں کے درمیان زندگی اور موت کی جنگ شروع ہوگئی۔ اب ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ میں نے پھر اُس پر چھلانگ لگائی۔ اُس نے کمال ہوشیاری سے خود کو بچایا اور ایک طرف ہو کر میرے جبڑے پر اتنی زور سے مکا مارا کہ میری ریڑھ کی ہڈی تک میں آگ بھر گئی۔ میں اس کے حملے سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے مضبوط ہاتھوں کا ایک بھرپور وار میرے گلے سے نیچے پڑا۔ میں درد سے کراہ اُٹھا۔

وہ بھی لڑائی میں ماہر تھا۔ وہ مجھ پر بھاری پڑ چکا تھا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ اندر سے ابھی تک کوئی اور باہر نہیں نکلا تھا۔ صرف وہی مجھے رگیدنے کی کوشش کیے جا رہا تھا' مگر وہ اپنے فن سے کام لینے کے بجائے اپنے



ریوالور سے کام لینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے جونہی جان سا دیکھا تو اپنی جیب سے دوسرا ریوالور نکالنے لگا۔ اس وقت وہ میرے قریب تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھ پر گھونسا تانا مگر میں اُس پر سبقت لے گیا۔ میں نے اس کے سر پر ایک زوردار ہاتھ دے مارا جس سے وہ بری طرح ڈگمگا گیا۔ لیکن اس نے اس کے باوجود میری پسلی پر ایک مکا رسید کر دیا۔ میں مدافعت کرنے لگا۔ اس کے گھونسوں میں بڑی طاقت تھی جس کی میں تاب نہیں لا رہا تھا۔ وہ مجھ پر مسلسل مکوں کی بارش کرتا تو شاید میں بچ نہ پاتا۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی، وہ اُسے مہنگی پڑی۔ میں نے پھر اُس پر ایک اور جست لگا دی اور ہم دونوں زمین پر آ رہے۔ وہ میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے اس کے منہ، سینے اور نازک مقامات پر جنونی انداز سے مکے برسانا شروع کر دیئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس خبیث کا سر ڈھلک گیا۔

وہ سفاک، وحشی اور ظالم جس کے نامۂ اعمال میں نجانے کتنے بے گناہوں کا خون شامل تھا، تعفن آمیز گندگی کے درمیان پڑا تھا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اُسے کمزور سمجھ لیا تھا۔ میرے دل کو خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے انتقام لے لیا۔ نوار داور اس کا ساتھی ابھی اندر ہی تھے۔ وہ شاید اس غلط فہمی میں تھے کہ میرے پاس بھی پستول یا اس قبیل کا کوئی اسلحہ ہے اسی لیے باہر نہیں آ رہے تھے۔

کچھ دیر ستانے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس لیے کہ مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں ابھی بھی خطرے میں ہوں۔ سامنے کی طرف دیکھا' کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان دونوں کا خطرہ ٹل گیا۔ وہ ابھی بھی میری تلاش میں ہوں گے۔ کسی بھی وقت میرا نشانہ لے سکتے ہیں۔ میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سامنے ہی ایک دروازہ نظر آیا۔ میں اس سے اندر داخل ہو گیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ریڈیم ڈائل کی گھڑی پر نظر ڈالی دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا مجھے ان دو سے لکا چوری کھیلتے ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں اندر کی طرف کچھ اور آگے بڑھا۔ سامنے سیڑھیاں نظر آئیں ا۔ گو کہ مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس عمارت کا اندر سے لے آؤٹ کیا ہے پھر بھی میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ آگے جانے کے بعد مجھے سیڑھیاں سی محسوس ہوئیں اور میں نے سنبھل سنبھل کر پیر رکھنا شروع کر دیا آہستہ آہستہ میں اُوپر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اُوپر پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ اب لمبی راہ داری ہے۔ میں اس راہ داری میں بڑھنے لگا۔ میں دیوار کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دروازے سے ہاتھ ٹکرایا۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے دیوار سے پیٹھ لگائی اور کھڑا ہو گیا' پھر زخم پر جلد بازی میں پٹی پر ہاتھ پھیرا' پٹی گیلی ہو رہی تھی۔ ہاتھ میں چپچپاہٹ سی آ گئی تھی۔ یقیناً یہ خون کی چپچپاہٹ تھی۔ سختی سے پٹی باندھنے کے بعد بھی خون نہیں رکا تھا' صرف بہاؤ میں فرق آ گیا تھا اور اب رس رہا تھا جس سے پٹی تر ہو گئی تھی۔ اس کام کو انجام دے کر میں کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ کھڑکی بغیر پلڑے کی تھی' جسے ضرورت ہوگی' اس نے موقع پا کر اکھاڑ لیا ہوگا یا پھر مالکان خود کھول کر لے گئے ہوں گے۔ میں اسی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ باہر ستاروں کی مٹمیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں دیہات میں ستاروں کی روشنی تیز ہوتی ہے مگر شہروں میں یہ روشنی بھی پرانی ثقافت کی طرح دم توڑ دیتی ہے' بڑی مدہم نظر آتی ہے' میں اسی مدہم روشنی میں دور' کافی دور جلتی بجھتی روشنی کو دیکھ رہا تھا جبکہ ذہن میں موت کا خوف تھا' کسی بھی

وقت موت کے ہرکارے پہنچ سکتے تھے کہ دفعتاً قدموں کی آواز ابھری تھی۔ یہ آواز نیچے سے آئی تھی۔ میں نے کان لگا دیئے تھے۔ وہ دو آدمیوں کے قدموں کی آواز تھی۔

تبھی کسی نے کہا۔ ''وہ اوپر آیا تھا۔ زخمی بھی ہے۔ یہ دیکھو خون کے دھبے!''

اس آواز نے دہلا دیا۔ گویا موت کے دونوں فرشتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔

''ارے یہ دیکھو گرد پر قدموں کے نشان بھی ہیں۔ اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔'' اس آواز کو سنتے ہی کلیجہ منہ کو آ گیا۔

''تم یہیں ٹھہرو میں دیکھ کر آتا ہوں ٹارچ بھی بجھا دو وہ ہوشیار ہو سکتا ہے۔''

قدموں کی آواز اب اُوپر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں پوری طرح ہوشیار ہو گیا۔ دیوار سے بالکل چپک کر کھڑا ہوا تھا۔ پیچھے ہٹنے کی وجہ سے میرے پیروں سے کوئی چیز الجھی تھی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا تو دل خوش ہو گیا۔ وہ تار تھا' اسکوٹر کا کلچ وائر۔ تقریباً دو فٹ کا ہو گا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کے دونوں سرے لپیٹ لیے۔ اب وہ ایک خطرناک ہتھیار بن گیا تھا۔ اب میں پوری طرح قدموں کی آواز کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

قدموں کی آواز اب راہ داری میں آ رہی تھی پھر وہ آواز کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ شاید اس گرد پر بنے قدموں کے نشان سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اسی کمرے میں ہوں۔

میں نے دروازے اور فرش کے درمیان کے خلا میں دیکھا ہلکی روشنی اندر تک آ رہی تھی۔ شاید اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ تھی پھر وہ روشنی بجھ گئی۔ میں مزید ہوشیار ہو گیا کیوں کہ دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ پھر پستول کی نال کی جھلک نظر آئی اور ایک سر داخل ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' بڑی احتیاط سے داخل ہو رہا تھا۔ دروازے کے پیچھے کھڑا میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ یہ لمحہ ہی اتنا تناؤ بھرا تھا' اعصاب جواب دے رہے تھے۔

میں نے کلچ وائر کے دونوں سرے مضبوطی سے پکڑ لیے اور دونوں ایڑیوں پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا بالآخر وہ اندر آ گیا' اور جیسے ہی اس نے اندر قدم رکھا' میں نے اچھل کر اس کی گردن میں وائر سے حلقہ کیا اور پھر اسے کستا چلا گیا۔ آنے والا لڑکھڑایا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ شکار کرنے آیا تھا اور خود شکار ہو گیا تھا۔ یہی تو اس دنیا کا قانون ہے' جو کمزور پڑا' وہ شکار ورنہ شکاری!

میں پوری قوت سے تار کے دونوں سرے کھینچ رہا تھا۔ دشمن بری طرح مچل رہا تھا' تڑپ رہا تھا۔ آزادی کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے ذرا بھی موقع نہیں دیا اور سرے پر اتنی قوت صرف کی کہ اس کی دونوں آنکھیں باہر ابل پڑیں' اور اس کا زور لگاتا جسم ساکت ہو گیا اور وہ لہراتا ہوا زمین پر گرتا چلا گیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ایک چیونٹی تک نہیں ماری تھی۔ کرائے کی ٹریننگ لے کر بھی رنگ تک محدود تھا مگر آج قسمت نے مجھے قاتل بھی بنا دیا تھا۔

''اگر میں اسے نہ مارتا تو یہ مجھے مار دیتا' اپنی جان کی حفاظت میں ہی صحیح مگر قتل جیسا جرم تو کر بیٹھا ہوں۔'' یہی کچھ سوچتے ہوئے میں نے تار کو گچھے کی شکل دے دی اور اسے لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ اب یہی میرا ہتھیار تھا اسی سے آگے بھی کام لینے تھے۔ اس زور آزمائی میں میں بری طرح تھک گیا تھا۔ زخم کی پٹی پر نظر ڈالی وہ پھر سرخ ہو گئی تھی۔ اس کی طرف توجہ دینا فضول تھا' میں نے ادھر سے نظریں ہٹا کر لاش کی طرف نظر ڈالی۔ وہ سیدھا سیدھا دروازے پر پڑا تھا۔ وہ جب نیچے نہیں جائے گا تو اس کا ساتھی اُوپر ضرور آئے گا۔ اس کی



نظروں سے لاش کو چھپانا ضروری تھا۔ میں نے لاش کو کھینچ کر دروازے کے پیچھے دھکیلا تا کہ اندر گھسنے کے ساتھ اس پر نظر نہ آئے پھر پہلے کی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا' مجھے پورا یقین تھا کہ اس کا ساتھی اسے ڈھونڈتا ہوا اُوپر ضرور آئے گا۔

ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ گونجی پھر آنے والا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے پہلے آواز دی۔

''راحل اور احل۔'' وہ پکارتا ہوا دروازے کے اندر داخل ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ مرنے والے کا نام راحل تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ تیسری بار وہ آواز دیتا کہ میں نے ریوالور کا دستہ پوری قوت سے اس کی گدی پر مارا۔ وہ چیختا ہوا زمین پر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

''ہنہ' مجھے تر نوالہ سمجھ کر شکار کرنے آئے تھے اور خود شکار ہو گئے۔'' میں نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا پھر وہیں بیٹھ کر پٹی بدلنے لگا۔ اس بار میں نے پٹی کے لیے بے ہوش شخص کی قمیص کو پھاڑا تھا اور اس کام سے فرصت پا کر میں سیڑھیوں سے نیچے اترتا چلا گیا کہ عین اسی وقت باہر سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ میں اپنی جگہ دبک گیا۔ اندر کمرے میں جاؤں یا باہر دوڑ لگا دوں ابھی میں اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ کچھ لڑکے اندر داخل ہوئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھیں۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیا۔ میں نے تشکر بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ باقی اندر کی طرف پوزیشن لے کر بڑھے تبھی میں نے کہا۔ ''اندر کوئی نہیں ہے۔ اوپر دو لاشیں ہیں۔''

''لاشیں؟ کس کی'' مجھے سہارا دینے والے نے کہا۔

''ان کی جو مجھے پکڑ کر لائے تھے۔ اُن میں ایک وہ بھی تھا جس پر مجھے شک ہے کہ وہی ان کو مارتا ہوا اندھیرے گراؤنڈ میں لے جا رہا تھا۔'' میں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا جسے میں نے بندھن سے آزاد کرایا تھا اور جس کی پاداش میں وہ لوگ مجھے پکڑ کر لے آئے تھے۔ اور مجھ پر تشدد کر رہے تھے۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں کس یونٹ کا بندا ہوں۔

''آؤ جلدی کرو باہر نکلو۔ کسی بھی وقت پولیس آ سکتی ہے۔'' اسی لڑکے نے آگے بڑھ کر کہا تھا۔

وہ مجھے ساتھ لے کر باہر آئے تھے۔ سڑک پر ایک ہائی روف کھڑی تھی۔ انھوں نے مجھے اس میں سوار کرایا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ چل پڑی۔ کچھ دور جانے کے بعد ان میں سے ایک لڑکے نے پوچھا۔ ''ہاں بھائی' کس یونٹ سے تعلق ہے؟''

''میں..... کس یونٹ سے؟ ان لوگوں نے بھی مجھ سے یونٹ کا پوچھا تھا۔ اب تم بھی پوچھ رہے ہو۔ یہ یونٹ کیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''اتنے معصوم نہ بنو۔ ہم اپنے لوگ ہیں' یونٹ ایک سو پانچ کے بندے ہیں۔''

''معاف کیجئے' میں پاکستان میں بالکل نیا بندہ ہوں۔ لندن سے آیا ہوں۔ وہ تو انسانیت کے ناتے میں نے ان کی مدد کر دی تھی اور یہی بات میرے لیے گلے کا پھندا بن گئی ہے۔'' میں نے تقریباً رو دینے والے انداز میں کہا۔

میری بات نے ان سب کو چونکا دیا۔ وہ سب تعجب بھرے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر ان میں

سے ایک بندے نے دوسرے سے کہا ''بھائی اس کا کیا اچار ڈالنا ہے چلتا کرو۔''

''ہاں جب اپنا بندہ نہیں ہے تو رسک لینے سے فائدہ..... چلتا کرو۔'' دوسرے لڑکے نے کہا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا۔ ہائی روف رک گئی۔ اسی لڑکے نے مجھ سے کہا۔ ''جا بھئی جا مگر یاد رکھیو کبھی کسی سے ہمارا ذکر مت کیجیو۔'' میں نے نیچے قدم رکھتے ہوئے ایک بار پھر ان لڑکوں کی طرف دیکھا اور آگے قدم بڑھا دیا۔

اُس سوزوکی سے نکل کر میں باہر آیا' رات اچھی خاصی ہوگئی تھی مگر سڑک پر زندگی رواں دواں تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں کے لیے آجا رہے تھے۔ میں بھی ان کا حصہ بن گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ آتے جاتے لوگ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یقیناً میرے سر پر بندھی پٹی ہوگی کیوں کہ جلد بازی میں بہرحال تھی۔ ضرور اوپر بھی خون آگیا ہوگا۔ نظروں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ اندھیرے کی بانہوں میں پناہ لے لوں اور میں ایک گلی میں مڑ گیا۔ وہاں ہر طرف اندھیرا تھا' ماحول پر سکوت طاری تھا۔ پتا نہیں' وہ کون سا علاقہ تھا؟ میں آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ مجھے امید تھی کہ میں زخمی ٹانگ کے ساتھ بھی یہ فاصلہ طے کرلوں گا۔ اگر میں سڑک تک پہنچ گیا تو رکشا' ٹیکسی ضرور مل جائے گی۔ میں اِسی خیال سے لنگڑاتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھتا چلا گیا۔ ناہموار راستہ' زخمی پیر' پھر بھی میں نے کافی فاصلہ طے کرلیا تھا۔ اَب سڑک زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے کچھ دیر سستانے کا فیصلہ کیا اور وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔ گو کہ میں نے بہت زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا' بہت زیادہ پیدل نہیں چلا تھا پھر بھی تھکن مارے ڈال رہی تھی۔ شاید یہ بہت زیادہ خون نکل جانے کا اثر تھا۔ میں نے ٹٹول کر پٹی کو دیکھا' وہ چپچپا رہی تھی۔ گویا خون اَب بھی رِس رہا تھا مگر میں رکا نہیں' چلتا رہا۔

وہ رات.....

اُس رات کو میں بھول نہیں سکتا' رینگنے کی رفتار سے میں چل رہا تھا' فاصلے سمٹ رہے تھے' سمٹتے ہوئے فاصلے نے بالآخر مجھے اُس جگہ پہنچا دیا جسے سڑک کہہ سکتے ہیں۔ یہ سڑک نہ پختہ تھی اور نہ کچی' برسوں پہلے کولتار سے بنی ہوگی مگر اَب چھوٹے بڑے کھڈوں کا مجموعہ تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ دن بھر میں ایک دو بار کوئی نہ کوئی سواری گزرتی ہوگی مگر اُس وقت وہ ٹوٹی پھوٹی سڑک کسی عاشق کے دل کی طرح ویران نظر آرہی تھی۔

مجھے جدھر سے روشنی نظر آئی تھی' میں اُدھر ہی بڑھنے لگا۔ وہ روشنیاں اَب اور واضح ہو چکی تھیں۔ کلو' دو کلو میٹر کا فاصلہ رہا ہوگا کہ میرا دل دھڑک اٹھا۔ عقب سے ہارن کی آواز آئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تھا' وہ کسی رکشے کا ہیولہ تھا جو تیز دیک آتا جا رہا تھا۔ میں اپنی جگہ کھڑا ہوگیا۔ کچھ وقت گزرا تھا کہ رکشا تیز دیک آگیا۔ اُسے قریب دیکھ کر میں نے کہا۔ ''بھائی..... چلو گے؟''

''ہاں' ہاں' کیوں نہیں۔'' اُس نے جلدی سے کہا۔ اُس کی عجلت سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اُدھر ہی جا رہا تھا۔ رکشے والے نے ہاتھ راڈ پر رکھ دیا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ میں اُس پر سوار ہو جاؤں اور میں سوار ہوگیا۔ رکشے والے نے رکشا اسٹارٹ کردیا۔ ٹوٹی ہوئی سڑک' جا بجا اینٹ پتھر کے ٹکڑے' رکشے کا پہیہ اچھل اچھل جاتا مگر رکشے والا بے پروا سا چلائے جا رہا تھا۔

اگر میں زخمی نہ ہوتا تو کبھی رکشے میں نہ بیٹھتا۔ وہ رکشا نہیں' تذلیل تھی۔ پہلی بار ایسے رکشے کو دیکھ کر میں نے یہی سوچا تھا مگر ابھی مجبوری تھی' اِسی لیے پچھلی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ رکشے والا دوڑتا رہا۔ رکشا آگے



جاتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہم پکی سڑک پر پہنچے۔

سڑک پر آتے ہی میری متلاشی نظریں دکانوں کے بورڈز پر پھسلنے لگیں کہ انگریزی میں لکھا ایک بورڈ نظر آگیا' تب پتا چلا کہ اُس وقت ہم 5D گلشن کے علاقے میں ہیں مگر یہاں سے ہمارا محلہ کتنی دور ہے' یہ پتا نہیں تھا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ جیب بھی چیک کرلوں' کہیں افراتفری میں پیسے گر نہ گئے ہوں۔ میں نے پینٹ کی پچھلی جیب کو ٹٹولا اور اطمینان ہوگیا' جیب پھولی ہوئی تھی۔ اِس جیب میں سو سو روپے کے تقریباً بیس نوٹ رکھے تھے جو اَب بھی موجود تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ رکشے والے کو اتر کر سو روپے دوں گا جو اُس کے لیے نعمت ہوگا۔ میں نے دیکھا تھا کہ لوگ تیس چالیس روپے سے زیادہ کرایہ اَدا نہیں کرتے تھے۔ میں سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا کہ رکشے والے نے اپنی رفتار کم کرنا شروع کردی۔ اِس رکشے میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ یہ یکلخت نہیں رکتا' ڈرائیور آہستہ آہستہ اِس کی رفتار کم کرتا تھا۔ میں نے اَز راہِ تجسس پوچھ لیا۔ ''کیوں بھائی! رک رہے ہو کیا؟''

''جی! مجھے پیشاب کرنا ہے۔''

وہ رکشا روک کر سڑک کنارے جا بیٹھا۔ میں اُس کے لوٹنے کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ یکایک ہی دو نوجوان اندھیرے سے نکلے اور رکشے کی دو طرف کھڑے ہوگئے۔ ہلکی روشنی میں اُن کے ہاتھوں میں پکڑے چاقو نظر آگئے۔ یہ کون ہیں' کیا چاہتے ہیں' ابھی میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اُن میں سے ایک بولا۔ ''گھڑی اور پرس میرے حوالے کردو.....''

میں نے ناقد نظروں سے اُن کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''کیوں بھئی' ایسا ظلم کیوں کر رہے ہو؟''

''یہ چاقو دیکھا' ابھی گلے پر لکیر بن جائے گی۔'' داہنے جانب کھڑے ایک قد آور جوان نے کہا۔

''اور اگر میں نہ دوں تو.....؟'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''لگتا ہے' چاقو شہ رگ پر چلے گا.....''

''اگر تمہیں پرس چاہیے تو یہ لو.....'' رکشے سے نیچے اترتے ہوئے میں نے کہا۔

یہ دو نوجوان میرا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ نیچے اترتے ہی داہنی جانب کھڑا نوجوان میری زَد پر آگیا۔ میں نے اترتے ہی ہاتھ چلا دیا تھا۔ اپنی کلائی سے اُس کی کلائی پر مارا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا جو چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ اپنے ساتھی کی حالت دیکھ کر دوسرا نہایت تیزی سے میری طرف بڑھا۔ درمیان میں رکشا تھا' وہ گھوم کر آیا تھا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ جیسے ہی نزدیک پہنچا' میں نے زخمی ٹانگ پر وزن ڈالا اور دوسری ٹانگ اٹھا کر پوری قوت سے گھوم گیا۔ میرے جوتے کی نوک اس کے چہرے سے ٹکرائی تھی۔

جوتے کی سختی' گھومنے کی قوت' اس کا تھوبڑا بگڑ گیا' منہ سے خون کی پھینٹیں نکل آئیں۔ وہ ہائے ہائے کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ رکشے والا جو کچھ دوری پر بیٹھا پیشاب کرنے کا ڈراما کر رہا تھا' اپنے ساتھیوں کو پٹتے دیکھ ان کی مدد کو آگیا۔ آتے ہی اس نے گھونسا چلایا مگر اس کا گھونسا مجھ پر کیا پڑتا' میرے گھونسے نے اس کا مزاج پوچھ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے کہا۔ ''کیوں بیٹے! یہ اوور ٹائم لگا رہے تھے ناں' شہریوں کو لوٹنے کا اچھا طریقہ نکالا ہے۔''

جواب میں اس نے ایک موٹی سی گالی دی' اس گالی نے کمال کر دکھایا۔ میری رگوں میں خون کی جگہ غصہ دوڑ

گیا اور میں نے گالی کا جواب دینے کے نام پر ایسا گھونسا رسید کیا جو اس کے لیے یقیناً یادگار بنا ہوگا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو اس کا پہلا ساتھی جس نے لات کھائی تھی' میری طرف دوڑا بالکل ایسے جیسے مار کر مجھے گرا دے گا۔ میں نے فوراً ہی اس کا جواب دیا۔ پوری قوت سے اس کے سر پر گھونسا مارا اور وہ ایک گھونسے میں زمین پر گرا۔ کچھ دیر تڑپا پھر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اب دو بچ گئے تھے' میرے لیے ان دونوں کی حقیقت نہ تھی مگر میں زخمی بھی تھا' ڈھیر سارا خون بہا تھا بلکہ اَب بھی بوند بوند رِس رہا تھا جس کی جانب میری توجہ نہیں تھی۔ غصہ پاگل پن کی ایک قسم ہے' پاگل پن میں درد تکلیف ہوا ہو جاتی ہے' انسان خونخوار ہو جاتا ہے' میں بھی خونخوار بن چکا تھا اور ان دونوں کو خونی نظر سے گھور رہا تھا۔ وہ دونوں اب سہمے سہمے نظر آ رہے تھے۔ یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نے مزید رعب ڈالنے کے لیے کہا۔ ''اگر مرنے کی تمنا ہے تو ٹھہرے رہو' پٹتے رہو اور اگر زندگی عزیز ہے تو موقع کا فائدہ اٹھاؤ اور نو دو گیارہ ہو جاؤ.....''

شاید وہ بھی فرار چاہتے تھے' میرا جملہ ختم ہوا تھا کہ اُن دونوں نے دوڑ لگا دی۔ رکشے کو بھی لینا گوارہ نہ کیا۔ میں اکیلا کیا کرتا' سو میں نے قدم بڑھا دیئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسٹریٹ لائٹ کی قطار نظر آ گئی۔ میں نے قدم تیز کر دیئے جبکہ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا پھر بھی لنگڑاتے ہوئے بڑھتا جا رہا تھا۔ سڑک پر پہنچتے ہی ایک چائے خانہ نظر آ گیا۔ اس چائے کی دکان کے سامنے ایک ٹیکسی بھی کھڑی تھی' اس ٹیکسی نے میرے جوش کو آواز دے دی۔ میں مزید تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ رکشے والے کی حرکت نے مجھے ہوشیار کر دیا تھا۔ لٹیرے ہر ملک ہر جگہ ہوتے ہیں مگر یہاں کے لٹیرے تو پلانرز تھے۔ کتنی عمدہ پلاننگ کی تھی' ویران جگہ پر کھڑے ہو گئے کہ اکیلا راہی ملے گا تو اُسے لوٹ لیں گے' اور انہوں نے تو لوٹ لیا ہوتا اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا۔ یہ تو میری قوتِ ارادی تھی کہ زخمی ہوتے ہوئے بھی میں نے مقابلہ کیا۔ کہیں یہ ٹیکسی والا بھی لٹیرا نہ ہو' اسی شش و پنج میں ڈوبا ہوا میں اس دکان تک پہنچ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور پٹھان تھا' اس سے میں نے کہا۔ ''خان بھائی.....! چلو گے؟''

''چلے گا کہاں جانا ہے؟'' اس نے چائے کا سپ لے کر کہا۔

میں نے وقت گنوانا مناسب نہیں سمجھا اور دروازہ کھول کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اِس طرح دکان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوئے اور میں سیٹ سے ٹیک لگا کر میں سوچ کے گرداب میں کود پڑا۔

ٹیکسی دوڑ رہی تھی مگر اس سے بھی تیز میرا ذہن دوڑ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے یہ لوگ سبق کیوں نہیں لے رہے ہیں۔ کیوں آپس میں ہی لڑ رہے ہیں۔ اسلام تو آفاقی مذہب ہے۔ امن اور آشتی کا مذہب ہے۔ یہ جنگ و جدل کیوں در آیا ہے۔ رحمت العالمین کے ماننے والے زحمت کیوں بن رہے ہیں۔ یہ سب کس راستے پر چل پڑے ہیں۔

''صاحب جی دستگیر آ گیا ہے۔'' رکشے والے کی آواز پر خیالات کے تانے بانے بکھر گئے۔ میں نے چونک کر باہر دیکھا۔ سامنے ہی وہ گلی تھی جس کے ایک گھر میں میرے ابو وغیرہ رہ رہے تھے۔ میں نے کرایہ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا کہ دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے خیال ہی نہیں تھا کہ اچھل کود میں میرا پرس گر چکا ہے۔ اب میں ٹیکسی والے کو پیسے کہاں سے دوں اسی پر غور کر رہا تھا کہ گلی سے ایک لڑکا باہر نکلا جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ٹھٹک گیا پھر نہایت تیزی سے میرے قریب آیا اور بولا ''آپ... آپ کو اس طرح باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔''



''میں اس ٹیکسی والے کو کرایہ دینے کی سوچ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کتنا کرایہ دینا ہے۔'' اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

اس نے کرایہ ادا کر کے میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً کھینچتا ہوا مجھے اپنے ساتھ گلی میں لایا اور اپنے گھر کے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دھکیل کر بولا۔ ''آپ نے بہت بڑا رسک لیا ہے۔''

''رسک کیسا رسک؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ بیٹھیے تو سہی!'' اس نے مجھے صوفے پر تقریباً دھکیل دیا۔ میں حیران پریشان سا بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے والے سوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا ''آپ کو ابھی محلے کی طرف آنا نہیں چاہیے تھا۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ آپ کی تلاش میں پولیس آئی تھی۔'' اس نے کہا

''میری تلاش میں؟ مگر کیوں... میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ میں تو قانونی طور پر یہاں آیا ہوں۔۔''

''مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا مگر ایس آئی میرا دوست ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ آپ کے خلاف کسی نے رپورٹ درج کرائی ہے کہ آپ کا تعلق اس سیاسی جماعت سے ہے جو آج کل معتوب ہے۔ آپ کے خلاف بتایا گیا ہے کہ آپ ٹارچر سیل چلا رہے تھے۔ پولیس والوں نے آپ کے ابو کو دھمکی دی ہے کہ کہیں سے بھی آپ کو پیش کیا جائے۔''

میرا دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ میرے ساتھ ایسا بھیانک مذاق کس نے کیا ہے۔ میں تو بہت سمندر پار سے پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ مجھے یہاں کی سیاست سے کیا مطلب مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ یہاں کتنی سیاسی پارٹیاں ہیں۔ کون حذب اختلاف میں ہے۔ کون اقتدار میں؟ اس پر غضب دہشت گردی کا الزام۔ جب کہ میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ قران نے ظالموں پر لعنت کی ہے۔ کھلے الفاظ میں کہا ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے۔

''کس سوچ میں ڈوب گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ میرا نام کسی جماعت سے کیوں منسلک کیا جا رہا ہے۔ پھر تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہو؟''

''آپ لندن کے کھلے ماحول سے آئے ہیں اس لیے بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ دراصل میں فہمیدہ کو پسند کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ ہم بہت جلد ایک ہونے والے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی سب راضی ہیں اور آپ کے یہاں بھی۔ اسی لیے میں آپ کو غیر نہیں رشتے دار سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے لیے پریشان ہو گیا ہوں۔''

اس کی بات پر میں حیران ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ بولا:

''آپ کا کسی سے جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا ہے؟''

''جھگڑا تو نہیں کہہ سکتے ہیں' غلط فہمی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ میں گھر واپس آ رہا تھا۔ سامنے والے پارک میں ایک بندے پر کچھ لوگ تشدد کر رہے تھے۔ میری نظر پڑ گئی میں نے اس بندے کو ان سے چھڑانے کی کوشش کی' اسے بچا لیا اور اُسے رخصت کر کے میں گھر کی طرف چل پڑا، ابھی اپنی گلی میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ

کچھ لوگوں نے مجھے زبردستی ایک گاڑی میں بٹھا لیا۔ایک گھر میں لے جا کر تشدد کر رہے تھے کہ ایک دوسرے گروپ نے آ کر چھڑا لیا۔بس یہی ہوا ہے۔'' میں نے اسے پوری بات نہ بتا کر آدھی ادھوری بتائی اور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔اس کی پیشانی پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

''آپ اسے غلط فہمی کہہ رہے ہیں۔ارے جناب آپ نے تو ایک آتش فشاں میں خود کو گرا دیا ہے۔یہاں دو پارٹیاں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔ایک کو کچھ پولیس والوں کی حمایت حاصل ہے۔وہ لوگ اپنے مخالفین کو پولیس کی مدد لے کر موت کی نیند سلا رہے ہیں۔دوسری پارٹی بھی وہی کر رہی ہے۔آپ نے نادانستگی میں ان کو اپنا مخالف بنا لیا ہے۔یہ انہی لوگوں کی کارستانی ہے کہ آپ کے خلاف پولیس میں رپورٹ کر دی گئی۔''

''پولیس ایسے تو کسی کے خلاف ایکشن نہیں لیتی قانون بھی تو کوئی چیز ہے۔''

''قانون کی پاسداری آپ کے لندن میں ہوتی ہوگی یہاں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون چلتا ہے۔آپ بیٹھیے میں آپ کے ابو کو بلا لاتا ہوں پھر بیٹھ کر سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔'' کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

وہ جا چکا تھا۔کمرا خالی تھا۔میں اکیلے کمرے میں بیٹھا تھا مگر میرے ذہن میں سوچ فکر کا ایک میلہ سا لگا تھا اور ابھی میں سوچ کے اِس گرداب سے نکلا بھی نہیں تھا کہ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔ابو اس کے ساتھ تھے۔ان کا چہرہ فق پڑا ہوا تھا۔لندن میں سنا تھا کہ پاکستانی تھانوں میں کسی کی عزت ایک منٹ میں اتار دی جاتی ہے۔یقیناً ان کے ساتھ بھی کوئی برا سلوک ہوا تھا' اسی لیے ان کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔انہوں نے آتے ہی مجھے سینے سے لگا لیا تھا۔وہ سسک رہے تھے۔

''انکل حوصلے سے کام لیجیے۔رونے دھونے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔کوئی ٹھوس حل سوچیے۔'' اس نوجوان نے کہا۔

''میرا خیال ہے تم لوٹ جاؤ۔'' ابو نے رندھے گلے سے کہا۔ان کی آواز میں عجیب سا درد چھپا تھا۔

میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔میری روح کی گہرائیوں میں ایک لرزہ سا محسوس ہوا تھا۔''مگر کیوں؟ میں نے جب کچھ کیا ہی نہیں تو پھر فرار کا راستہ کیوں اپناؤں۔'' میں نے سوال کیا تھا' دراصل اَب میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اخبار کا سہارا لوں گا۔برٹش ایمبسی کو انوالو کروں گا تا کہ میرے بعد ابو پر کوئی آنچ نہ آئے مگر انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔

ابو نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہا ''تم کیا یہ چاہتے ہو کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگ جائیں۔ابھی تو محلے داروں نے گواہی دے دی ہے کہ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔میں نے ''ب فارم'' بھی دکھا دیا ہے مگر جب وہ لوگ تمہیں میرے گھر سے برآمد کریں گے تو میرا کیا حشر ہوگا؟ تمہاری ماں بہنیں تھانے میں کھڑی ہوں گی۔ تمہیں اگر مجھ سے محبت ہے تو تم چلے جاؤ۔تمہیں میری قسم ہے۔''

میں سوچنے لگا کہ انسان بھی کتنا مجبور ہے۔لاچار ہے۔مجبوری کا خنجر پیار محبت کا گلا ریت دیتا ہے۔اس لیے میں مہر بہ لب رہ گیا۔ابو نے اپنی قسم دے دی تھی اور میں مجبور ہو گیا تھا۔اسی نوجوان کے ساتھ میں ائرپورٹ کے لیے اسی وقت نکل گیا۔میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے جو بھی فلائٹ ملے گی میں اسی سے نکل جاؤں گا۔کیوں کہ میرے خواب بکھر گئے تھے۔جن آنکھوں میں خواب بسے تھے وہاں اب کرچیوں کا بسیرا تھا۔

خواب بکھرنے کی چبھن مجھے بے چین کر رہی تھی۔دل یہی کر رہا تھا کہ میرے پنکھ لگ جائیں اور میں اڑ کر لندن پہنچ جاؤں۔اس دیس میں جس کو میں نے کبھی اپنا نہیں سمجھا۔جس کی محبت نے کبھی مجھے بے چین نہیں کیا۔اور جس سرزمین کو میں نے اپنا وطن سمجھا۔جس سرزمین کی چاہت میں دن رات تڑپتا رہا' وہاں کے عاقبت نا اندیش لوگوں نے میرے جذبات کو میرے خیالات کو میری حب الوطنی کو لہولہان کر دیا۔میرا کیا حال کیا۔مجھے رہ رہ کر رونا آ رہا تھا۔میرا دل شکوہ کناں تھا علامہ اقبال سے' قائداعظم سے' قائد ملت سے کہ کیا انہوں نے اسی وطن کا خواب دیکھا تھا۔

راستے بھر وہ پتا نہیں کیا کیا پڑھ کر مجھ پر پھونکتا رہا تھا۔شاید وہ خود بھی خوف میں مبتلا تھا۔اسے ڈر تھا کہ اگر مخبری ہو گئی تو کیا ہوگا۔لیکن کرم اللہ کا کہ ہم بحفاظت ائرپورٹ پہنچ گئے تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ مجھے ایک غیر ملکی ایئر لائن میں ایک کینسل شدہ سیٹ مل گئی تھی اور میں وہاں سے بہ آسانی لندن کے لیے نکل پڑا۔سیٹ سے ٹیک لگا کر میں سوچنے لگا' میرا جرم یہی ہے نا کہ میں مسلمان ہوں۔کیا مسلمان ہونا جرم ہے؟ جس کی سزا دنیا کے ہر کونے میں دی جا رہی ہے۔دشمن بھی دے رہے ہیں اور دوست بھی؟ آخر مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے؟......سوتے جاگتے۔آنسو بہاتے ہوئے میں ہیتھرو تک پہنچ گیا تھا......

وہاں کسٹم والوں نے میرے سامان کی تلاشی لی تھی تو انہیں ایک قابل اعتراض چیز مل گئی تھی۔ایک ٹین کا چھوٹا سا ڈبا' جس میں میرے پاک وطن کی مٹی تھی، جسے میں نے اس خیال سے لے لیا تھا کہ اس کی خوشبو مجھے وطن کی یاد دلاتی رہے گی۔اس وطن کی جو میرے والد کا وطن ہے......دوسری قابل اعتراض چیز قران پاک کا نسخہ تھا۔ان لوگوں کو حیرت تھی کہ ایک برٹش پاکستان سے آ رہا ہے۔قران ساتھ لا رہا ہے تو یقیناً دہشت گرد ہوگا۔

میں سوچ رہا تھا یہ کیسا وقت آ گیا ہے کہ مسلمان ہونا۔قرآن پاک رکھنا جرم بن گیا ہے۔ہمیں اس نہج تک پہنچایا کس نے؟ کیوں ہمارے لیے مسلمان ہونا جرم بنا دیا گیا ہے....

کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟

......☆ختم شد☆......




جدید لہجے کے شاعر شفیق احمد ندیم کا تازہ مجموعۂ غزل

''گفتگو رقص کرے''

اس کے چہرے کو کبھی غور سے دیکھو تو ندیم
لبوں سے جلترنگ بجے' گفتگو رقص کرے

خوبصورت جذبوں کا شاعر: شفیق احمد ندیم نے بڑے خوب صورت انداز میں اپنے خیالات کو شعروں میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔کسی بھی اچھے شاعر کی طرح شفیق احمد ندیم کی شاعری میں بھی آپ کو ہر وہ رنگ نظر آئے گا جو ہمارے عہد کے شعراء کا خاصہ ہے۔

''وصی شاہ''

الرحمن بک پیلس' اردو بازار / سلطان بک ڈپو' گلشن اقبال / صدیقی اینڈ سنز' کراچی ایئرپورٹ

وقاص حسین

# اگر کوئی عبرت پکڑے

حجاب عباسی کا خیال

مجھے رنج ہے تو فقط یہی میں اُسے نہ پہلے سمجھ سکی
مجھے دیر میں یہ خبر ہوئی کہ یہ صرف میرا مآل ہے

موبائل محبت کا شاخسانہ' کچی عمر بچیوں کے لیے بطورِ خاص

''منیر بیٹا!''

''جی امی جان!''

''بیٹا! باہر دیکھنا' چوکیدار بتا رہا تھا' تمہارا کوئی دوست آیا ہے' دیکھو جا کر۔''

''اچھا امی.....!''

'کون ہوسکتا ہے؟ میں نے تو سب کو منع کیا ہے گھر کوئی نہ آئے۔' یہی سوچتے ہوئے میں باہر نکلا۔ سامنے طارق کھڑا تھا۔

''اوئے طارق! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ تجھ کو بتایا تو تھا' گھر نہ آنا؟ کیوں آیا ہے؟ اگر ابا جی نے دیکھ لیا تو مجھے بھی جوتے پڑیں گے اور تیری بھی 'خدمت' ہو جانی ہے۔''

''وہ..... یار تیری بائیک چاہیے تھی۔''

''کیوں؟ تیری بائیک کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ..... یار بھائی لے کر گیا ہے۔''

''بائیک تو میں تم کو دے دوں' پر میں نے بھی ٹیوشن جانا ہے۔''

''کتنے بجے جانا ہے؟''

''پانچ بجے۔''

''ابھی تو ساڑھے تین بجے ہیں' ایسا کرتے ہیں' اکٹھے چلتے ہیں۔ میرا ایک گھنٹے کا کام ہے پھر وہاں سے واپسی پر تم کو ٹیوشن سینٹر چھوڑ دوں گا اور جب فری ہو جاؤ' فون کر دینا' میں آ کے لے جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن جانا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یار' آنٹی کو ملنے جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے' میں کتابیں اور بائیک لے کر آتا ہوں۔'' میں نے گھر جاتے ہوئے کہا۔

''امی جان! میں ٹیوشن جا رہا ہوں۔''

''بیٹا! تم تو پانچ بجے جاتے ہو' ابھی تو ساڑھے تین ہی ہوئے ہیں؟''

''امی! میں نے بازار جانا ہے' تھوڑا سا کام ہے۔'' یہ کہتا ہوا میں باہر نکل گیا۔

''یہ پکڑ کتابیں اور بتا' اب جانا کہاں ہے؟'' میں گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ اپنے کالج سے جو دائیں طرف والی سڑک ہے نا' اس طرف جانا ہے۔'' طارق نے بتایا۔

''جناب طارق صاحب! میرے علم کے حساب سے تو اُس طرف آپ کی کوئی آنٹی نہیں رہتیں' یہ آنٹی کب پیدا ہوئی؟''

''تم کو اس آنٹی کے بارے میں نہیں پتا' رہتی ہے اس طرف بھی۔'' اس نے گول مول انداز میں کہا۔

''یار' تمہارے ساتھ جاتے ہوئے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو..... تو..... تمہاری خیر نہیں۔'' میں نے اسے وارننگ دی۔ ''لو جی' آ گئی کالج والی روڈ' اب آگے کس طرف جانا ہے؟''

''دائیں طرف موڑ لو اور وہ جو سامنے گلی نظر آ رہی ہے' وہاں جانا۔'' طارق نے اشارے سے بتاتے ہوئے کہا۔ میں گلی میں داخل ہوا تو وہ بولا۔

''بس' بس' روک لو اس کوٹھی کے سامنے۔'' طارق نے اتر کر بیل دی' تھوڑی دیر بعد ایک آدمی نے گیٹ کھولا اور طارق کو دیکھ کر ایک طرف ہو گیا۔

''منیر' آجاؤ اندر۔'' طارق نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار' تم جاؤ' میں یہاں پر تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ تم کام نپٹا کر جلدی آنا۔''

''نہیں یار' مجھے اچھا نہیں لگے گا' تم باہر کھڑے رہو۔''

''اچھا چل۔'' میں نے اس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ میری نظر دوبارہ اس آدمی پر پڑی جس نے

گیٹ کھولا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں نے پہلے بھی اس کو کہیں دیکھا ہے۔

''یار' یہ شخص جانا پہچانا سا لگتا ہے۔''

''نہیں یار' تیرا وہم ہے۔ آنٹی کہاں ہے؟'' طارق نے اُس آدمی سے پوچھا۔

''وہ اوپر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''طارق' تم جا کر آنٹی سے مل آؤ' میں یہاں لان میں بیٹھ کر انتظار کرتا ہوں تمہارا' جلدی آنا۔''

''نہیں' تم میرے ساتھ چلو' تم کو اپنی آنٹی سے ملواتا ہوں۔ میری آنٹی پردہ نہیں کرتی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم گیلری میں سے گزر کر ہال نما کمرے میں آ گئے۔ یہاں سے سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔ جوں ہی ہم ہال نما کمرے میں داخل ہوئے' مجھے کسی لڑکی کے رونے کی آواز سنائی دی۔

''یہ کون رو رہا ہے؟'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم خاموشی سے سیڑھیاں چڑھو' یہاں پر ایسی آوازیں آتی رہتی ہیں۔'' طارق نے کہا۔

''کیوں' تمہاری آنٹی ظالم عورت ہے؟''

''بس چپ.....!'' اس نے سامنے والا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ میں اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تھا اور جب میری نظر سامنے بیٹھی عورت پر پڑی تو میں تیزی سے پلٹا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اترنا شروع کر دیں۔ طارق نے پیچھے سے آواز لگائی۔

''یار' رکو تو سہی' میری بات تو سنو' کہاں بھاگے جا رہے ہو؟''

''میں جا رہا ہوں' تم اپنا کام نمٹاؤ۔'' مجھے اُس پر غصہ آ رہا تھا اور ساتھ میں میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میری ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔

''یار' سنو تو سہی۔'' طارق لپکتا ہوا میرے پاس آیا۔

''میں نے تمہاری کوئی بات نہیں سننی' میں جا رہا ہوں' مجھے یاد آ گیا ہے' میں نے اس آدمی کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ پچھلی دفعہ تو ابا جی نے صرف دوستوں سے ملنے پر پابندی لگائی تھی' اس دفعہ وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہاری آنٹی پر۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''یار' تب بات اور تھی' اب ویسا کچھ نہیں ہوگا' اب آنٹی نے لائسنس بنوالیا ہے اور پولیس کو بھی ہفتہ دیتی ہے' اب کوئی خطرہ نہیں۔ پولیس تو اب اس طرف آتی بھی نہیں۔'' اس نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''مجھ کو کچھ نہیں سننا' بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری آنٹی..... پچھلی بار بھی تم بہانے سے لے کر آئے تھے' آنٹی کو ملنے جانا ہے۔ ایک میں ہی پاگل ہوں جو تمہاری باتوں میں آ جاتا ہوں۔ پچھلی بار تو ابو کو بہانہ کر دیا تھا۔ تیری وجہ سے ابو نے میرے گلے میں منگنی کی گھنٹی باندھ دی ہے۔ دیکھ یار' میری جان پر رحم کھا' ویسے یہ تم مجھ سے کس دشمنی کا بدلہ لے رہے ہو؟''

''یار منیر' کیسی باتیں کر رہے ہو؟ پلیز یار' بس دس منٹ کا کام ہے۔''

''نہیں' مجھ کو نہیں جانا' تو جا۔''

''پلیز یار' آ جا' کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بریانی کی پلیٹ کھا لینا' وہ بھی فل سائز۔ آ جا' چل ساتھ میں' ایک بوتل بھی ہوگی' اب تو مان جا۔''

''اچھا' دس منٹ کا مطلب' دس منٹ' ٹھیک ہے؟''

''او کے!'' ہم دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ لڑکی کے رونے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہوئے تو آنٹی نے پوچھا۔

''اوئے طارق' کہاں بھاگ گیا تھا؟''



''کہیں نہیں آنٹی' بس یہ دوست تھوڑا سا جذباتی ہو گیا تھا۔''

''وہ کیوں؟''

''پچھلی بار وہ پرانے مکان میں ریڈ پڑی تھی نا' تب یہ میرے ساتھ تھا۔ ابا جی اس کے SHO ہیں۔ ہم تو بھاگ گئے تھے' بائیک پکڑی گئی تھی' وہ اس کے ابا جی نے پہچان لی تھی' بس اسی وجہ سے ڈر گیا تھا۔''

''او بچے! مرد بن' مرد!'' آنٹی نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا۔ لڑکی کے رونے کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

''آنٹی' کوئی نیا مال آیا ہے یا سب پرانا ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''دو تین پیس آئے ہیں نئے۔'' آنٹی نے کہا۔

''طارق' اس سے پوچھ' یہ لڑکی کون ہے اور کیوں رو رہی ہے؟'' میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

''کیوں تو نے کیا کرنا ہے؟''

''یار' تو پوچھ تو سہی۔''

''اچھا' پوچھتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''آنٹی' یہ لڑکی کیوں رو رہی ہے؟'' طارق نے پوچھا۔

''یہ سالی نئی آئی ہے' اس کا یار بیچ گیا ہے' تب سے اس نے رونا مچایا ہوا ہے۔'' یہ سن کر میں نے سوچا' اس لڑکی سے ملنا چاہیے۔

''آنٹی' میں اس سے مل سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

طارق نے مجھ کو گھورا۔ ''مینڈکی کو بھی زکام ہوتا جا رہا ہے؟''

''کمینے انسان' میں نے صرف اس سے ملنا ہے اور پوچھنا ہے' وہ یہاں کیسے پہنچی؟ آنٹی' کیا میں مل سکتا ہوں؟''

''اے شمی.....!'' آنٹی نے ایک لڑکی کو بلایا۔

''ہاں اماں.....''

''جا' اس لونڈے کو حرام زادی کے کمرے میں چھوڑ آ۔''

''آ جاؤ میرے پیچھے۔'' اس لڑکی نے کہا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ دو کمرے چھوڑ کر تیسرے کمرے کے سامنے وہ رکی۔ آواز اُسی کمرے سے آ رہی تھی۔

''جا' وہ اسی کمرے میں ہے' اندر چلا جا۔'' یہ کہتی وہ واپس چلی گئی۔ میں ڈرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک کونے میں لڑکی بیٹھی گھٹنوں پر سر رکھے رو رہی تھی۔ میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا اور اسے پکارا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا' وہ روئے جا رہی تھی۔ میں نے اسے پکارا تو اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''بہت جلدی میرے گاہک لگنے شروع ہو گئے۔''

''نہیں' تم نے غلط سمجھا' میں گاہک نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم گاہک نہیں تو یہاں نماز پڑھنے آئے ہو؟'' اس نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں اپنے دوست کے ساتھ آیا تھا۔ تمہارے رونے کی آواز سنی تو آنٹی سے پوچھا' اس نے بتایا' تمہارا کوئی لور تم کو بیچ گیا ہے۔ اگر تم مجھے بتاؤ' تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میرے والد پولیس میں ہیں۔''

''پر اب میں جاؤں گی کہاں؟'' لڑکی نے روتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے گھر جانا اور کہاں جانا ہے۔''

''نہیں' میں گھر نہیں جا سکتی۔ مجھ کو میرے کیے کی سزا ملی ہے' میں نے جو بویا ہے' اب وہی کاٹنا

ہے۔" لڑکی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا پھر کچھ توقف کے بعد اپنی پتایوں سنائی۔

"میرا نام نورین ہے۔ میرا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے ہے۔ میرا والد ایک فیکٹری میں سپروائزر ہے۔ ہم تین بہن بھائی ہیں۔ بڑے بھائی کی ویلڈنگ کی دکان ہے اور چھوٹا بھائی نویں کلاس میں پڑھتا ہے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی جو فرمائش کرتی' وہ فوراً پوری ہو جاتی۔ میں نے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور والد صاحب سے کہا کہ میں نے آگے پڑھنا ہے۔ ابو نے میری خواہش پر آگے پڑھنے کی اجازت دے دی اور بڑے بھائی کو یہ ذمہ داری سونپ دی کہ وہ میرا داخلہ کسی اچھے سے کالج میں کروا دے۔ اجازت ملنے پر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دوسرے دن بھائی کالج میں میرا داخلہ کروا آئے۔ کلاسز پندرہ دن بعد شروع ہونی تھیں' یہ پندرہ دن میں نے انگلیوں پر گن گزارے تھے۔ اُس روز جب میں کالج کے لیے تیار ہو رہی تھی تو امی میرے پاس آئی اور کہا۔

"بیٹی' اسکول اور کالج میں بہت فرق ہوتا ہے' بس ہماری عزت کا پاس رکھنا۔"

"امی! آپ بے فکر ہو جائیں' مجھے اپنی اور آپ کی عزت اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ کیا آپ کو اپنی بیٹی پر اعتبار نہیں؟"

"تم پر تو اعتبار ہے مگر لوگوں پر نہیں۔ بیٹی! عزت ایک بار چلی جائے تو پھر نہیں آتی۔"

مجھے کالج سے لانے اور چھوڑنے کی ذمہ داری بھائی کے ذمہ تھی۔ دو چار دن میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسکول اور کالج لائف میں کیا فرق ہوتا ہے' یہاں پر ہر چیز کی آزادی تھی' کلاس میں اپنی ذہانت کی وجہ سے بہت جلد ٹیچرز کی نظروں میں مقام بنا لیا۔ میں کالج لائف کو بہت زیادہ انجوائے کر رہی تھی۔ میرے گروپ میں سات لڑکیاں تھیں' ان میں سے چار کے پاس موبائل فون تھا جنہیں وہ ہر وقت استعمال کرتی نظر آتی تھیں خواہ فری پیریڈ ہو یا ہاف ٹائم۔

میں اکثر ان کو کہتی۔ "یہ کیا تم ہر وقت موبائل سے لگی رہتی ہو؟"

وہ آگے سے کہتیں۔ "نورین یار' تم کیا جانو اس کا کیا مزا ہے' تم بھی موبائل لے لو نا۔"

"نا بابا' مجھ کو اس بلا سے دور ہی رکھو' نہ میرے پاس ٹائم ہے نہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

"یار' موبائل کا مزا ہی کچھ اور ہے' فری بیلنس ملتا ہے وہ بھی جتنا چاہو۔"

"وہ کیسے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یار' لڑکے بہت بے وقوف ہوتے ہیں' ان سے کہو' میں تم سے تب بات کروں گی جب بیلنس بھیجو گے اور لڑکے بھیج دیتے ہیں۔"

"یار' تم لڑکوں سے بات کرتی ہو' تمہارے گھر والے تمہیں کچھ نہیں کہتے؟" میں نے تبسم سے پوچھا۔

"گھر والوں کو پتا ہو گا تو کچھ کہیں گے نا؟"

"یعنی تم نے گھر سے چوری موبائل رکھا ہوا ہے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر تم اس کو رکھتی کہاں ہو؟"

"یار' جب خود کو لا کر ہے تو پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

فرسٹ ایئر کا رزلٹ آیا تو میں نے کافی اچھے نمبر حاصل کیے تھے اور کلاس میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس دوران دوستوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے بھی موبائل لینے کا شوق پیدا ہوا۔ میں جو کہتی تھی' انسان خود اچھا ہو تو دوسرا چاہے کتنا بھی برا ہو' اس کی سنگت کا اثر نہیں ہوتا لیکن میری یہ بات غلط ثابت ہوئی' مجھ پر سنگت کا اثر ہونے لگا تھا اسی لیے موبائل کا شوق چرایا تھا' یہیں سے میری بربادی کی ابتدا



ہوئی تھی۔ میں نے جب اس بات کا ذکر اپنی دوستوں سے کیا تو وہ کہنے لگیں کہ تم بھی گھر سے چوری چھپے موبائل رکھ لو۔

"نہیں' میں اپنے ابو سے کہوں گی۔ مجھے پوری امید ہے' وہ لینے دیں گے۔" میں نے گھر آ کر امی سے کہا کہ میں نے موبائل لینا ہے۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟ تم نے موبائل کا کیا کرنا ہے؟" امی نے غصے سے کہا۔

"امی' میری سب دوستوں کے پاس موبائل ہے' بس میں نے بھی لینا ہے۔"

"میں نے کہہ دیا نا' نہیں لینا تو پھر نہیں لینا۔"

شام کو جب ابو آئے تو میں نے اپنی خواہش کا اظہار ابو سے بھی کر دیا۔

"بیٹا' کیا کرنا ہے تم نے موبائل کا؟"

"ابو' میری سب دوستوں کے پاس ہے اور دوسرے جب بھی کسی دوست سے کچھ پوچھنا ہوتا ہے تو شام تک آپ کا اور بھائی کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور کبھی جلدی چھٹی ہو جاتی ہے تو بھائی اپنے ٹائم پر آتے ہیں۔ مجھ کو انتظار کرنا پڑتا ہے اس لیے امی سے کہا تھا مگر امی نے تو....."

"اچھا' تم کھانا کھاؤ' میں تمہارے بھائی کو کہتا ہوں' وہ تم کو کل موبائل لا دے گا۔" ابو نے کہا۔ امی نے خاصی مخالفت کی لیکن دوسرے دن بھائی نے مجھ کو موبائل لا دیا۔

اب میں نے بھی لڑکوں سے sms پر بات کرنا شروع کر دی تھی اور ان سے بیلنس منگوانا شروع کر دیا تھا پھر رفتہ رفتہ میں نے لڑکوں سے باتیں کرنا بھی شروع کر دیں۔ موبائل کا اثر میری study پر بھی پڑا اور جب سیکنڈ ایئر کا رزلٹ آیا تو میری سیکنڈ ڈویژن آئی تھی۔ ابو سے آگے پڑھنے کا کہا تو انہوں نے انکار کر دیا مگر میں نے ضد کر کے ابو کو منا لیا۔ فون پر بات کرتے ہوئے اگر کبھی امی پوچھ لیتیں کہ کس سے بات کر رہی تھیں؟ تو میں کہتی' کالج کی دوست ہے۔ میں نے لڑکوں کے نمبر لڑکیوں کے نام سے save کیے ہوئے تھے اور دوسری سب سے بڑی آزادی یہ تھی کہ میرا کمرا الگ تھا اس لیے رات کو بھی لڑکوں سے بات کرتی تھی۔

ایک دن کسی نئے نمبر سے sms آیا' لکھا تھا۔ "یار یوس' کہاں ہو تم؟ ابھی تک آئے نہیں؟ میں نے تم کو کہا بھی تھا' ٹائم پر پہنچ جانا۔" میں نے پہلے تو سوچا' اس کو reply نہ کروں مگر پھر خیال آیا کہ شاید کوئی نیا بے وقوف پھنس جائے۔

میں نے اسے میسج کیا۔ "آپ کون ہو؟"

reply آیا۔ "کمینے' ایک تو ٹائم پر نہیں آئے اور اوپر سے پوچھ رہے ہو' میں کون ہوں؟ میں ریحان ہوں' اب کہاں مرے ہوئے ہو' جلدی بتاؤ' تم آؤ گے یا نہیں؟"

میں نے sms کیا۔ "آپ غلط نمبر پر میسج send کر رہے ہیں۔"

"سوری۔" اس کا sms آیا۔ "آپ کون؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں نورین ہوں' دوبارہ میرے نمبر پر sms نہ کرنا۔"

دو تین دن بعد اس نمبر سے پھر sms آیا۔ "کیا حال ہے جناب؟"

میں نے اسے جواب دیا۔ "دیکھو ریحان صاحب' آپ کو کہا بھی تھا' دوبارہ sms نہ کرنا؟"

"اس کا مطلب' آپ مجھ کو بھولی نہیں ہو؟ کیا آپ مجھ سے دوستی کرو گی؟"

"میں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی اور دوبارہ مجھے sms نہ کرنا۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں' سمجھے آپ؟"

اس کا میسج آیا۔ "میں بھی ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں۔ ہر لڑکی سے دوستی نہیں کرتا۔"

''ہر لڑکا یہی کہتا ہے۔''

''میں ایسا نہیں' آزما کر دیکھ لو۔''

''میں کیوں آزماؤں' تم میرے لگتے کیا ہو؟''

''اگر آپ سمجھیں تو آپ کے اپنے ہیں' میں نے آج تک کسی لڑکی سے بات نہیں کی' تم پہلی لڑکی ہو جس سے رابطہ کر رہا ہوں۔ پلیز' کر لو نا دوستی۔''

''میں سوچ کر بتاؤں گی۔''

اس کا sms آیا۔ ''کب بتاؤ گی؟'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں خوش تھی کہ چلو نیا مرغا پھنس گیا۔

دوسرے دن میں نے اسے میسج کیا۔ ''ایک شرط پر تم سے دوستی کروں گی اگر تم اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ؟''

اس کا جواب آیا۔ ''میرا نام تو تم کو معلوم ہی ہے' یہ میرا اصلی نام ہے۔ میں ملت کالونی میں رہتا ہوں۔ B.Sc کے لاسٹ ایئر میں ہوں۔ اب تم بتاؤ؟''

''میرا نام نورین ہے جو کہ تم کو معلوم ہے اور میں مخدوم کالونی میں رہتی ہوں۔ 3rd ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے' ہم ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں رہتے۔''

پھر روز sms کے ذریعے ہماری بات ہونے لگی۔

ایک روز میں نے اس کے کسی بھی sms کا جواب نہ دیا تو وہ کال کرنے لگا۔ میں نے کال بھی اٹینڈ نہیں کی۔ پانچ سات کالز کے بعد میں نے کال ریسیو کر لی۔

''کیا بات ہے' جواب کیوں نہیں دے رہی تھیں اور نہ کال اٹینڈ کر رہی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''بیلنس نہیں تھا اور کال اس لیے اٹینڈ نہیں کر رہی تھی' امی پاس تھیں۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''تم نے بتایا کیوں نہیں' میں بیلنس بھیج دیتا؟''

''نہیں' اچھا نہیں لگتا بیلنس مانگتے ہوئے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو؟ ہم دوست ہیں' مشکل میں دوست ہی دوست کے کام آتے ہیں۔''

کچھ دیر بعد اس نے 100 روپے کا بیلنس بھیج دیا۔ اب ہماری sms پر اور کالز دونوں پر باتیں ہوتی تھیں۔ اب جب بھی میں اس کو کہتی' وہ لوڈ کروا دیتا۔ ہماری دوستی کو چار مہینے ہو گئے تھے۔

ایک دن اس نے کہا۔ ''مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے' کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' میں نے بھی اقرار کر دیا۔ اب ہم پہلے سے بھی زیادہ باتیں کرنے لگے' جب بھی امی سامنے ہوتیں تو میں واش روم میں چلی جاتی اور شاور چلا لیتی اور اس سے باتیں کرتی۔

ایک دن اس نے ملنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''میرا دل بھی بے چین ہے تم سے ملنے کے لیے۔'' میں نے کہا۔ ''پر ہم ملیں گے کیسے؟ میں اپنے بھائی کے ساتھ کالج آتی جاتی ہوں۔''

''اچھا' کسی دن تم اپنے بھائی کے ساتھ کالج چلی آنا' وہ جب چھوڑ کر واپس چلا جائے تو مجھے کال کر دینا' میں آ جاؤں گا اور چھٹی سے پہلے تم کو کالج چھوڑ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے پھر کل تو چھٹی ہے' ہم پرسوں ملیں گے۔''

اتوار کا دن بہت بے چینی سے گزرا۔ اگلے روز بھائی کالج چھوڑ کر گیا تو میں نے ریحان کو فون کر دیا۔ وہ دس منٹ میں آ گیا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا' وہ بہت جاذبِ نظر تھا۔ ہم وہاں سے zoo آ گئے۔ دس پندرہ منٹ ہم گھومتے پھرتے رہے پھر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''نورین' میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں' تمہارے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔'' میں اس کی باتوں کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی' مجھے یقین آ گیا کہ وہ مجھ سے سچی



محبت کرتا ہے۔ ہم دو گھنٹے وہاں بیٹھے رہے پھر ہم نے ایک ہوٹل سے کھانا کھایا اور چھٹی سے پندرہ منٹ پہلے وہ مجھے کالج چھوڑ گیا۔ میں خوشی سے نہال تھی۔ اس کے بعد بھی ہم دو تین دفعہ ملے' وہ ہر بار مجھے لے کر zoo چلا جاتا تھا' یوں اس پر میرا بھروسہ اور بھی مضبوط ہوتا گیا۔ اُن دنوں میرے ماموں زاد کا رشتہ میرے لیے آیا تھا۔ سب گھر والے راضی تھی پھر بھی انہوں نے سوچنے کا وقت لیا تھا۔

میں نے ریحان کو کال کی۔ ''میرا رشتہ آیا ہے مگر میں صرف تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تم اپنے گھر والوں سے بات کرو اور جلدی رشتہ بھیجو۔''

''میں گھر والوں سے بات کرتا ہوں۔''

دو دن بعد اس کا فون آیا۔ ''میں نے گھر والوں سے بات کی تھی مگر وہ مان نہیں رہے۔''

''ریحان' میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتی' تم پھر بات کرو۔''

''میں نے بہت کوشش کی ہے مگر وہ نہیں مان رہے۔ اب ایک ہی راستہ ہے ہمارے ملنے کا' اگر تم میرا ساتھ دو تو؟''

''میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں' تم بتاؤ کون سا راستہ؟''

''ہم گھر سے بھاگ کر کورٹ میرج کر لیتے ہیں؟'' میں اس کے پیار میں اندھی ہو چکی تھی اسی لیے میں گھر سے بھاگنے پر راضی ہو گئی۔

''تم پریشان مت ہونا' جب ہم شادی کر لیں گے تو خود بخود گھر والے مان جائیں گے اور پھر ہم واپس آ جائیں گے۔ تم ایسا کرو' گھر میں جو کچھ بھی ملے' نقدی' زیور' سب کچھ ساتھ لے لینا اور میں بھی کچھ رقم ساتھ لے لوں گا۔''

''پر ہم جائیں گے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا دوست ملتان میں رہتا ہے' اس سے بات کرتا ہوں۔ تم تیاری کر لو' اب میں تم کو کل سب کچھ بتاؤں گا۔''

دوسرے دن اس کی کال آئی۔ ''میں نے سب انتظام کر لیا ہے' وہاں پر ایک فلیٹ بھی مل گیا ہے۔ ہم کل رات کو گھر سے نکلیں گے۔ تم ریڈی رہنا۔'' اس روز میں نے اپنے اچھے اچھے کپڑے نکالے اور تہہ کر کے ایک سائیڈ پر رکھنے لگی۔ امی کمرے میں آئیں تو یہ دیکھ کر پوچھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''امی' بس فارغ بیٹھی تھی' سوچا' سب کپڑے تہہ کر کے رکھ لوں۔''

اس سے بات ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔

''میں نے سب تیاری کر لی ہے۔''

''تم یاد سے سب نقدی اور زیور وغیرہ لے لینا۔''

''مجھے یاد ہے' میں لے لوں گی۔''

شام کو میں نے چائے میں نشہ آور گولیاں ملا کر سب کو چائے پلا دی' یہ گولیاں کچھ دن پہلے ریحان نے دی تھیں۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سب سو گئے ہیں تو میں نے گھر میں موجود نقدی' اپنا اور امی کا جتنا زیور تھا' ساتھ لے لیا اور ریحان کو فون کر دیا۔

''میں ریڈی ہوں' تم کب آ رہے ہو؟''

''بیس منٹ میں۔''

اُس وقت میں نے کچھ نہیں سوچا' گھر والوں کا کیا بنے گا' ان پر کیا بیتے گی جب ان کو معلوم ہو گا کہ میں گھر سے بھاگ گئی ہوں؟ میں صرف مال ہی نہیں بلکہ گھر کی عزت بھی ساتھ لے جا رہی تھی مگر مجھے کوئی ملال نہیں تھا۔ اس لمحے میں صرف اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ریحان کی کال آئی' وہ باہر کھڑا تھا۔ میں بیگ لے کر باہر نکلی۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بیگ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

''اب کہاں جانا ہے؟''

"ہم سیدھا بس اڈے پر جائیں گے' وہاں سے کوچ کے ذریعے ملتان جائیں گے۔" چند گھنٹے بعد میں ہم ملتان میں تھے۔ اڈے پر اس کا ایک دوست لینے آیا جو شکل سے ہی ٹھیک آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ہمیں ایک فلیٹ پر چھوڑ گیا' یہ فلیٹ دو کمروں اور ایک کچن پر مشتمل تھا۔

"یہ آدمی مجھے شکل سے اچھا نہیں لگا۔" میں نے کہا۔

"میری جان' اس طرح کے کاموں میں ایسے ہی دوست کام آتے ہیں۔ تم پریشان مت ہو۔" اس رات ہم نے آنے والی زندگی کی پلاننگ کی۔ میں بہت خوش تھی' میں نے جو چاہا' وہ مجھے مل گیا تھا۔

اس نے مجھ سے سارے روپے اور زیور لیتے ہوئے کہا۔ "میں ان کو سنبھال کر رکھتا ہوں۔"

صبح وہ ناشتہ لے آیا۔ ہم نے مل کر ناشتہ کیا۔

"کب کرنی ہے شادی؟" میں نے پوچھا۔

"دو چار دن صبر کرو۔ میں انتظام کرتا ہوں۔"

اس رات اس نے کہا کہ ہم نے اب شادی کرنی ہے تو پھر جسمانی ملن میں حرج ہی کیا ہے۔ میں نے بھی انکار نہیں کیا' یوں ہماری ہر رات رنگین ہونے لگی۔ اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ اس روز میں نے پھر پوچھا۔

"کب کرنی ہے شادی؟"

"تھوڑا انتظار کرو' میں کوشش کر رہا ہوں۔" اس دلاسے میں ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ اب میں نے اس سے اصرار کرنا شروع کر دیا۔

ایک روز اس کے ساتھ ایک آدمی آیا جو شکل سے ہی بدمعاش لگ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چلا گیا تو میں نے ریحان سے پوچھا۔

"یہ کون تھا؟ یہ تو شکل سے ہی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔"

"میں نے اس سے شادی کا انتظام کرنے کو کہا تھا' یہی بتانے آیا تھا' بس ایک دو دن میں ہماری شادی ہو جائے گی۔"

اس رات تقریباً ڈیڑھ' دو کا ٹائم تھا جب میری آنکھ کھلی۔ مجھے پانی کی طلب محسوس ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا' ریحان بستر پر نہیں تھا' سوچا' واش روم میں ہوگا۔ میں کمرے سے نکلی تو ریحان کی آواز سنائی دی۔

'یہ اس وقت کس سے باتیں کر رہا ہے؟' یہ ہی سوچ کر میں اس کی طرف چلی گئی۔ وہ فون میں اتنا بزی تھا کہ میرے آنے کی اسے خبر نہ ہوئی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

"دیکھا استاد' مال تم نے خود دیکھ لیا ہے' اب پیسے بھی اسی حساب سے ہونے چاہئیں۔ میں 75 ہزار سے ایک روپیہ کم نہیں لوں گا۔" اس طرف سے پتہ نہیں کیا جواب آیا' ریحان نے کہا۔ "چلو چھوڑو استاد' نہ تمہارے پچاس نہ میرے 75' بات ساٹھ میں فائنل کرتے ہیں۔ اب اس سے ایک پیسہ کم نہیں ہوگا' او کے پھر ڈن' ڈیلیوری کی تم فکر نہ کرو۔" میں اب تک یہ سوچ رہی تھی' شاید ریحان نے کوئی کام شروع کیا ہے جس کی بات ہو رہی ہے' اسی وجہ سے میں نے اس کو ڈسٹرب نہیں کیا مگر اس کے اگلے الفاظ قیامت سے کم نہیں تھے۔ "میں اس کو شادی کے بہانے لے کر آؤں گا اور کہوں گا' یہ میرے دوست کا گھر ہے اور میں جا کر نکاح خواں کو لے کر آتا ہوں۔ آگے پھر تمہارا کام۔"

میں زور سے چیخی تھی۔ "ریحان..... تم مجھے بیچ رہے ہو؟ میں تمہارے لیے مال ہوں؟"

"نہ..... نہ..... نہیں..... تم کو کس نے کہا' میں تم کو بیچ رہا ہوں؟"

"میں نے سب سن لیا ہے ریحان' تم ایسا نہیں کر سکتے۔" میں نے روتے اور چیختے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہاری خاطر اپنے گھر والوں کو چھوڑا' صرف تمہاری خاطر۔"

"چپ کرو..... تم میرے لیے نہیں' اپنے لیے گھر سے بھاگی ہو اور یہ تم کیا پیار' محبت' وفا کی باتیں کر رہی ہو؟ تم اپنے گھر والوں کی نہیں ہو سکیں جنہوں نے تم کو بیس برس پالا' پیار دیا' محبت دی' زندگی کی ہر ضرورت پوری کی' تم ان کی نہ ہو سکیں تو میری کیا ہوگی۔ کل کسی اور کے لیے مجھ کو چھوڑ دو گی کمینی....."

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ میں گر گئی۔ میں نے شور مچانے کی کوشش کی تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے قابو کر لیا اور پھر گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے گیا۔ میرے منہ کو بند کر دیا اور میرے ہاتھ پیر بھی باندھ دیئے۔ صبح اس نے اپنے دوستوں کو بلا لیا جنہوں نے میرا جسم نوچنا شروع کر دیا۔ تین دن میرے ساتھ یہی وحشیانہ عمل ہوتا رہا۔"

نورین اپنی کہانی بیان کر رہی تھی کہ اسی وقت طارق نے زور سے مجھے پکارا۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔

"منیر..... بھاگ....."

"کیا ہوا؟"

"جلدی بھاگ..... پولیس آ رہی ہے۔"

"مگر طارق..... وہ لڑکی....."

"چھوڑ اسے' بھاڑ میں جائے وہ....."

"لیکن یار' اس کی مدد....."

"تو کیا مدد کرے گا اس کی' شادی کرے گا اس سے؟" میں خاموش ہو گیا۔ طارق نے مجھے بازو سے پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر لے جانے لگا۔ "اگر پولیس آئے تو اس لڑکی کے ساتھ ہم بھی تھانے میں ہوں گے۔"

"تجھے کس نے کہا' پولیس آ رہی ہے؟ اور تم تو کہہ رہے تھے' وہ آنٹی پولیس کو ہفتہ دیتی ہے؟"

"یار! آنٹی کے کسی آدمی کی کال آئی تھی' اس نے اطلاع دی تھی۔ اب جلدی نکلو پھر نہ کہنا' تمہاری وجہ سے پھنس گیا؟"

ہم فوراً وہاں سے نکل آئے تھے مگر میرا ذہن اس لڑکی میں الجھا ہوا تھا کہ اس کی بربادی کا ذمہ دار کون ہے؟ موبائل فون یا والدین کا اولاد پر اندھا اعتماد؟

دور جاہلیت میں لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے' شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ انہیں خدشہ ہوتا تھا کہ کہیں بیٹی کی وجہ سے ان کا سر نہ جھک جائے۔ آج بھی ماں باپ' بیٹی کے پیدا ہونے پر خوش نہیں ہوتے۔ ایک ماں جو خود ایک عورت ہے' بیٹی کے پیدا ہونے پر روتی ہے۔ کیا وہ اس لیے روتے ہیں کہ کہیں بیٹی ان کی عزت خاک میں نہ ملا دے؟ میرا تو یہی خیال ہے' آپ کیا کہتے ہیں؟

آخر ایک لڑکی گھر سے بھاگنے سے پہلے کیوں نہیں سوچتی کہ اس انتہائی قدم جانے کے بعد اس کے گھر والوں پر کیا بیتے گی؟ وہ دنیا والوں کا کیسے سامنا کریں گے؟ اس کے بھائی کا کیا ہوگا جب کوئی کہے گا کہ دیکھو' وہ جا رہا' اس کی بہن گھر سے بھاگ گئی؟ وہ پل بھائی کے لیے زندہ درگور ہونے کے لیے کافی نہیں ہوگا؟ اس باپ کا کیا ہوگا جب کوئی کہے گا' دیکھو' بیٹی پیدا تو کر لی' حفاظت نہ کر سکا؟ وہ پل باپ کے لیے کیسا ہوگا؟ کیا یہ اچھا نہ ہو کہ لڑکی گھر سے بھاگنے سے پہلے اپنے گھر والوں کو زہر دے کر مار دے تاکہ والدین جیتے جی زندہ درگور ہونے سے بچ جائیں؟ یہ ایک سچی کہانی نہیں ہے' وہ لڑکی آج بھی زندہ ہے اور ذلت کی زندگی گزار رہی ہے۔ کوڑیوں کے دام بک رہی ہے اور پل پل مر رہی ہے..... اگر اس کہانی کو پڑھ کر کوئی ایک بھی بھٹکنے والی لڑکی راہ راست پر آ جائے تو میں سمجھوں گا' میں نے اپنا حق ادا کر دیا۔

☆☆

شازلی سعید مغل

# مردے کا ہاتھ

لیمپ دوبارہ روشن ہو گیا تھا۔ اِس کے
ساتھ ہی بستر پر اُس کی نگاہ پڑی تھی اور
اس کا جسم کانپ کر.....

**ایک دہشت ناک کہانی' اسے رات کی تنہائی میں پڑھنے سے گریز کریں**

بوڑھا فارول اسی مکان میں جہاں اس نے زندگی کے آخری بیس سال تنہائی میں گزارے تھے' اس وقت مُردہ پڑا تھا۔ وہ ایک خاموش طبیعت' تنہائی پسند انسان تھا' اسی وجہ سے اس کی موت کے وقت اس کے قریب صرف دو لوگ ڈاکٹر السٹین اور فالرڈ موجود تھے۔

ڈاکٹر اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور کھڑکی کے قریب جا کر باہر دیکھنے لگا۔ اُس وقت شب کی ظلمت تمام عالم کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھی' ہر طرف ہُو کا عالم تھا' آس پاس نہ کوئی مکان تھا نہ انسان' ڈاکٹر نے اپنے ساتھی کی طرف اچانک مڑتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا تم یہاں تنہا رات گزارو گے؟''

فالرڈ جیسے چونک اٹھا تھا۔ ''بے شک کیونکہ میں نہ تو اتنا بزدل ہوں اور نہ اس قدر وہمی' ویسے یہ کتنی عجیب احمقانہ رسم ہے کہ رات بھر مُردے کی حفاظت کی جائے۔''

''بہر حال ہمیں اس رسم کو پورا کرنا پڑے گا' اگر ہو سکا تو میں بہت جلد کسی اور شخص کو بھی یہاں بھیج دوں گا تاکہ وہ رات کو یہاں رہنے اور جاگنے میں تمہارا ساتھ دے اور تم تنہائی میں گھبراؤ نہیں۔'' ڈاکٹر السٹین نے کہا تھا۔

''ڈاکٹر' یہاں آنے پر شاید ہی کوئی اور راضی ہو۔'' فالرڈ نے کہا تھا۔ ''کیونکہ فارول کو عموماً لوگ جانتے نہیں تھے۔''

اسی اثنا میں ڈاکٹر نے اپنے ربر کے دستانے اتار کر میز پر رکھے تھے' یہ دستانے نرم اور ٹھنڈے ہو رہے تھے کیونکہ باہر انتہائی درجے کی سردی پڑ رہی تھی۔

''او کے' اگر کوئی شخص ملا تو ٹھیک ہے ورنہ تم کو تنہا ہی رہنا پڑے گا' تم تو ہم پرست تو نہیں ہو نا؟'' ڈاکٹر نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

''ہرگز نہیں' ان فضول باتوں پر میرا ہرگز یقین نہیں۔'' فالرڈ نے ذرا شیخی بگھارتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا تو پھر صبح ملتے ہیں۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔''

ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا' دروازہ بند ہو گیا' فالرڈ نے پہرہ دینا شروع کر دیا' اس نے کرسی پر بیٹھ کر ایک غلط انداز نگاہ سے لاش کی طرف دیکھا جو سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی پھر وقت کاٹنے کے لیے اس نے ایک کتاب اٹھالی اور لیمپ کی مدہم روشنی میں اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔

کھڑکی کے باہر گھپ اندھیرا تھا' سناٹے کا یہ عالم تھا کہ کسی قسم کی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی' فالرڈ کی آنکھیں جب کتاب پڑھتے پڑھتے تھک سی گئیں تو اس نے کتاب میز پر رکھ دی' اس کی نگاہ پھر لاش پر پڑی تو وہ سوچنے لگا کہ آخر وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے وہی شخص جس سے لوگ زندگی میں محبت کرتے ہیں' مرنے کے بعد ان کی پریشانی اور خوف کا باعث بن جاتا ہے اور اب اس پر یہ بھی ظاہر ہونے لگا تھا کہ جس کام کو اس نے اس قدر آسان سمجھ رکھا تھا' وہ بہت ہی مشکل تھا' اس کی آنکھیں بار بار بے قراری سے اس بستر کی طرف اٹھ جاتی تھیں جس پر لاش موجود تھی۔ اسے دیکھ کر وہ سارے بدن سے کانپ اٹھتا اور پھر وہ اپنے آپ کو سنبھالتا اور دل ہی دل میں اپنی کمزوری پر خفا ہوتا!

اُس وقت باہر کی فضا میں چاروں طرف بلا کا سکوت طاری تھا' کسی قبرستان جیسے ماحول میں دور

دور تک زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں تھے کیونکہ مرنے والا بوڑھا فارول اپنی تنہائی پسند طبیعت کی وجہ سے گاؤں سے کافی دور رہا کرتا تھا اور اس کے مکان کے گرد کافی دور تک دوسرا کوئی اور گھر نہ تھا۔

فالرڈ نے ایک بار پھر اپنی توجہ کتاب پر مرکوز کرنا چاہی تھی کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تھا اور لیمپ گل ہو گیا تھا۔ فالرڈ نے کھسیانا ہو کر دو چار سخت سست لفظ کہے تھے اور تاریکی میں ٹٹولنے لگا تھا کہ لیمپ کی چمنی سے اس کی انگلی جل گئی تھی۔ فالرڈ نے ماچس اٹھا کر جلائی تھی اور لیمپ دوبارہ روشن ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر بستر پر اس کی نگاہ پڑی تھی اور اس کا سارا جسم کانپ کر جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ فارول کا مُردہ چہرہ کھلا ہوا تھا' اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کے دانت بھی نکلے ہوئے تھے۔

فالرڈ کو خوف کے اَن دیکھے جالوں نے جکڑ ضرور لیا تھا لیکن اس نے اپنے حواس بحال رکھے تھے کہ شاید ہوا کے تیز جھونکے نے مُردے پر سے چادر ہٹا دی ہو لیکن اس کے ساتھ ہی جسم و جاں لرزا دینے والا یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید تاریکی میں مُردے نے چادر اٹھا کر اٹھنے کی کوشش کی ہو!

فالرڈ ایسے بے جا توہمات کا قائل نہ تھا' اس کو اپنی ضعیف الاعتقادی پر ہنسی آ گئی تھی پھر وہ اٹھا تھا اور بستر کے پاس جا کر اس نے مُردے کے چہرے پر چادر درست کر دی تھی' ایسا کرتے ہوئے جب مُردے کے سرد جسم سے اس کا ہاتھ مس ہوا تھا تو اسے اپنے دل میں ایک عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

فالرڈ اب پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا تھا مگر چونکہ نیند کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا' اس وجہ سے اس نے آخر کار کاؤچ پر لیٹ کر سو جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس نے لیمپ جلتا ہوا چھوڑ دیا تھا کیونکہ رسم کے مطابق میت کے پاس بتی کا جلتا رہنا ضروری تھا۔

.....•.....•.....•

فالرڈ نیند سے اچانک ہی بیدار ہوا تھا' اس کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سویا ہوگا۔ بیدار ہونے کے ساتھ ہی وہ کاؤچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سرد پسینے کے قطرے موجود تھے۔ کمرے میں اس وقت گھپ اندھیرا تھا' لیمپ شاید اس کی نیند کے دوران ہوا کے کسی جھونکے سے بجھ چکا تھا۔ اس نے ابھی ابھی خواب دیکھا تھا کہ وہ مُردہ اپنی آتشیں نگاہوں سے اس کی طرف گھور رہا تھا اور پھر اس نے جونہی اپنا سرد اور خوف ناک ہاتھ فالرڈ کی طرف بڑھایا تھا' تب ہی اس کی نیند کافور ہو گئی تھی۔

فالرڈ نے بدحواسی کے عالم میں تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر وہاں تو گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ کو لیمپ کی طرف بڑھانا چاہا تھا مگر فوراً ہی خوف کے مارے سمیٹ لیا تھا۔ فالرڈ کو اب لیمپ روشن کرنے میں بھی خوف محسوس ہو رہا تھا کہ روشنی ہوتے ہی نہ معلوم اس کی آنکھیں کون سا ہوشربا منظر اپنے سامنے دیکھیں!.....اس کا دماغ بالکل ماؤف سا ہو رہا تھا اور پھر فالرڈ کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کمرے میں کوئی حرکت کر رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ فوری طور پر اس مقام سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہتا تھا مگر اب مسئلہ یہ ہو گیا تھا کہ اسے یہ یاد نہ رہا تھا کہ داخلی دروازہ کس طرف ہے؟



اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ اس نے چلنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے پاؤں گویا زمین پر گڑ گئے تھے' قدم اٹھتا ہی نہ تھا۔ اس وقت خوف اور دہشت نے فالرڈ کے دل و دماغ پر کامل تسلط کر لیا تھا۔ فالرڈ اب آگے کی بجائے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت کی طرف راستہ معلوم کرنے کے لیے بڑھے ہوئے تھے' اس کو صرف اتنا معلوم اور یقین تھا کہ لاش اس کے سامنے بستر پر تھی جبکہ اب وہ پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ اب اگر کوئی چیز اس کی پشت کی طرف ملے گی تو وہ ضرور وہی مُردہ ہوگا جو کمرے میں تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ٹہل رہا ہے اور یوں اب اسے ایک مُردے سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔

فالرڈ انہی خیالات میں غلطاں پیچھے کی جانب ہٹ رہا تھا کہ اچانک اس کے ہاتھ کسی سرد چیز سے ٹکرائے تھے' بالکل سرد مُردے کے ہاتھ کی طرح سرد اور بے جان!.....پھر خوف و دہشت کی وجہ سے فالرڈ کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی تھی اور وہ زمین پر گر پڑا تھا۔

دوسرے دن صبح کو جب لوگ فارول کی تجہیز و تکفین کے لیے آئے تھے تو انہوں نے وہاں دو لاشیں دیکھی تھیں' بوڑھے فارول کی لاش بستر پر بے حس و حرکت پڑی تھی جبکہ فالرڈ کی لاش فرش پر موجود تھی' خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں جیسے پھٹی ہوئی تھیں اور ڈاکٹر السٹین کے ربڑ کے دستانے اس کی لاش کے قریب ہی پڑے تھے' وہ دستانے جو سرد اور نرم ہاتھوں کے مانند تھے اور جن کو ڈاکٹر السٹین غلطی سے بھول کر چلا گیا تھا!!

.....☆☆.....

# غزل

بڑے خلوص سے سجائے تھے رشتوں کے خواب ہم نے
کچھ اس طرح سے ٹوٹے کرچیاں چبھو گئے

ہم پونچھتے رہے عمر بھر دوسروں کے آنسو
اشک ہمارے ہمارا دامن بھگو گئے

بچا رہے تھے خود کو اَن دیکھے دشمنوں سے
اور دل میں بسنے والے ہی خنجر کھبو گئے

سو رہے تھے جب ہم سب دسترس میں تھا
بیدار جو ہوئے تو بخت ہی سو گئے

ہم قدم تھا جب وہ، منزل تھی سامنے
تنہا چلے جو ہم تو راستے بھی کھو گئے

بشریٰ سعید

رابعہ بصری

# سمندر کا کنارہ اور وہ

ابھی مجھے سوئے چند ہی لمحے گزرے تھے
کہ سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ فلیٹ میں
میں اکیلا تھا پھر یہ آواز.....

**وہ ایک بدروح تھی مگر مدد کی طلب گار تھی، ایک پراسرار کتھا**

مجھے سمندر بچپن سے ہی اچھا لگتا تھا۔ اس کے کنارے گھر بنانے کے میں خواب دیکھا کرتا تھا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میری والدہ اسکول کی پرنسپل تھیں اور والد پرائیویٹ جاب کرتے تھے۔ ہمارا تعلق درمیانے طبقے سے تھا۔ میری والدہ نے میری پڑھائی پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا چنانچہ ان کی کوشش سے میں نے ایم بی اے کرتے ہی ملٹی نیشنل کمپنی جو موبائل بناتی تھی، میں نوکری کر لی۔ میری تنخواہ اچھی تھی، ساتھ ہی دیگر بنیادی سہولیات یعنی گاڑی بھی مل گئی۔ مجھے لگا کہ اب میرے خواب بہت جلدی پورے ہونے والے ہیں چنانچہ میں نے کلفٹن میں فلیٹ دیکھنے شروع کیے تو میرے چودہ طبق روشن ہونے لگے۔ ان کی قیمت لاکھوں، کروڑوں میں تھی جو کم از کم میرے پاس نہ تھے۔ بروکر کے کہنے پہ میں نے گھر کرائے پر دیکھنے شروع کر دیئے، کافی عرصے کے بعد ایک دن شام کو میں آفس سے اٹھنے والا ہی تھا کہ اسی بروکر کا فون آ گیا۔

''محمود صاحب، خوش ہو جایئے، بالآخر میں نے آپ کی مرضی کا فلیٹ نہایت کم کرائے پر ڈھونڈ ہی لیا۔ آپ فوراً مجھے پک کریں، میں آپ کو آج ہی وہ جگہ دکھانا چاہتا ہوں۔''

میری تو گویا دلی مراد بر آئی۔ میں نے گھر پر والدہ کو دیر ہونے کا سبب بتایا اور خوش دلی سے ڈرائیونگ کرتا ان حضرت کے پاس جا پہنچا۔ ان کے پاس کوئی پارٹی آ چکی تھی اور ڈیل چل رہی تھی۔ مجھ سے صبر نہ ہوا چنانچہ مکمل پتا سمجھ کر میں نے فلیٹ کی چابی لی اور خود ہی چل پڑا۔ یہ زنگ زدہ عمارت تھی، دوسری منزل پر وہ فلیٹ تھا۔ میں نے تالے میں چابی گھمائی تو اندر سے رونے کی آواز باہر تک آنے لگی۔ میں نے بغور فلیٹ کا نمبر اپنے پاس لکھے پتے سے ملایا، نمبر تو وہی تھا، B-58 'خالی فلیٹ میں کون آ گیا؟' میں نے گھبراتے ہوئے سوچا اور ہاتھ مار کر پورا دروازہ کھولا۔

مغرب سے کچھ اوپر کا وقت تھا اس لیے اندھیرا ہو رہا تھا۔ میں نے ''کوئی ہے؟'' کہتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ رونے کی آواز بدستور کسی کمرے سے آ رہی تھی۔ اندازے سے سوئچ بورڈ تلاش کیا اور سارے بٹن دبا دیئے، روشنی ہوتے ہی علم ہوا، اندر داخل ہوتے ہی چھوٹا سا لاؤنج ہے۔ دائیں طرف ایک کمرہ تھا جبکہ بائیں جانب دو بند دروازے نظر آئے۔ میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر اندھیرا تھا۔ لائٹ جلا کر بھی کسی ذی روح کا نشان نہ ملا، کھڑکیوں پر زنگ تھا، شیشے بند ہونے کی بنا پر اندر حبس تھا۔ کمرہ خالی تھا۔

پھر میں نے باقی فلیٹ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ رونے کی نسوانی آواز اب بند ہو چکی تھی۔ یہ ایک ہال نما کمرہ تھا غالباً مہمان داری کے خیال سے بنایا گیا تھا۔ دوسرا کمرہ ماسٹر بیڈ روم تھا۔ کشادہ اور ہوادار، اس کھڑکی پر کوئی شیشہ نہ تھا چنانچہ نمی سے بھری سمندر کی ہوا اندر آ رہی تھی۔ دیواریں اکھڑے ہوئے پینٹ کی وجہ سے بدوضع نظر آ رہی تھیں۔ مجھے فلیٹ کچھ خاص پسند نہ آیا مگر سمندر کے کنارے رہنے کا یہ ایک آخری موقع تھا۔ میں نے تالا لگایا اور واپس گھر چلا گیا۔

دوسرے دن میں نے بروکر کو ہاں کر دی اور جب گھر میں فلیٹ کا ذکر کیا تو پتا چلا، والد اور والدہ نے حج کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ مجھے خوشی تو ہوئی مگر اکیلے گھر کا پورا سامان شفٹ کرنا خاصا صبر آزما کام لگا۔ خیر، دو دن کے اندر میں نے سارا کام مکمل کیا اور فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس دو منزلہ چھوٹی سی عمارت میں صرف دو فلیٹ تھے، ایک

میرا اور ایک نیچے کی منزل پر اور وہ بھی خالی تھا۔

رات کا ایک بج چکا تھا' میں بہت تھک گیا تھا چنانچہ باقی سامان کل ترتیب سے رکھنے کا سوچا اور میں نے سونے کی ٹھانی۔ ابھی مجھے سوئے شاید چند لمحے گزرے تھے کہ سسکیاں لینے کی آواز آنے لگی۔ فلیٹ میں' میں اکیلا تھا پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی؟ میں نے آواز کا تعین کیا تو علم ہوا' میرے کمرے کی بالکونی سے وقفے وقفے سے رونے کی مدہم آوازیں آ رہی تھیں۔ خوف کی ایک شدید لہر میں نے محسوس کی۔ بالکونی میں کالے بال بکھرائے ایک وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔ 'اس خالی فلیٹ میں یہ لڑکی کہاں سے آ گئی؟' میں نے سوچا پھر بلند آواز سے اسے مخاطب کیا۔

''سنو لڑکی' تم یہاں کیسے آ گئیں اور کیوں روئے جا رہی ہو؟'' لڑکی نے سر اٹھایا گویا بادلوں سے چاند نکل آیا۔ میں نے اتنا مکمل حسن کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں سحر زدہ سا اس کے قریب گیا۔ اس کے سفید گالوں پہ آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔

''کیا تم میری مدد کرو گے؟''

''ہاں مگر تم ہو کون؟ یہ فلیٹ تو میرا ہے' تم کہاں سے آ گئیں؟'' میرے سوال کرنے پر وہ بولی۔

''سنو مجھ سے ڈرنا نہیں' میں بدروح ہوں۔''

''کیا؟'' میری چیخ نکل گئی۔ دہشت سے میری حالت خراب ہونے لگی۔ میرے گھر میں یہ روح کہاں سے آ گئی؟ ''یا خدا! میری مدد کر۔ مجھے ہمت دے۔'' میں نے کپکپاتے لبوں سے دُعا کی۔

''سنو..... مجھ سے ڈرو نہیں بلکہ رحم کھاؤ۔ میری پوری بات سن لو پھر کچھ کہنا۔'' وہ روح التجا آمیز لہجے میں بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے' بولو مگر اندر کمرے میں آ جاؤ' یہاں خنکی کا احساس ہو رہا ہے۔'' میں نے دل مضبوط کر کے اس سے کہا۔ اندر کمرے کی لائٹ جلا کر میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ گویا ہوئی۔

''میرا نام دُعا ہے' دُعا کائنات خان' میں یہیں ڈیفنس کے علاقے میں اپنی امی کے ساتھ رہتی تھی۔ میرے مرحوم والد ترکی میں بے شمار اراضی اور فیکٹریاں چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ہمیں کوئی مالی مسئلہ نہ ہوا۔ بیوہ ہونے کے بعد میری ماما نے اپنے بھائی بھابی کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ ان کے دو بچے تھے' لاریب میری ہم عمر تھی اور اس کا بھائی مجھ سے دو تین سال بڑا تھا۔ میری لاریب سے بہت دوستی تھی مگر اس کا بھائی شمس مجھے کچھ خاص پسند نہ آیا' اس کی حرکتیں بھی عجیب سی تھی۔ میں نے اسے کچھ خاص لفٹ نہ دی۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا' میں اس کی جانب متوجہ نہیں ہوں تو وہ گھٹیا حرکتوں پہ اتر آیا۔ اس نے مجھے دھمکی دی' اگر میں اس سے شادی پہ رضامند نہ ہوئی تو میرا انجام بہت برا ہوگا۔ تقریباً آج سے آٹھ ماہ پہلے میں یہیں سمندر پر اپنی کچھ دوستوں کے ساتھ اپنی سالگرہ منانے آئی تھی کہ تین انجان لوگ گن پوائنٹ پر مجھے اغوا کر کے اسی فلیٹ میں لے آئے۔ ان کے ارادے کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ دو دن تک میں بھوکی پیاسی یہاں بندھی پڑی رہی پھر تیسرے دن شمس سامنے آیا۔

''ہاں' اب بولو' کیا ارادہ ہے؟''

وہ مکروہ ہنسی ہنس کر بولا۔ میرا جواب انکار میں تھا۔ اس پر شیطان سوار تھا' اس نے میری عزت تار تار کر ڈالی' اسی پر ہی بس نہیں کیا' اس کے اس شیطانی کھیل میں اس کے وہ تینوں دوست بھی شامل ہو گئے۔ جب دل بھر گیا تو میرا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور میری لاش سمندر کے حوالے کر دی۔ میری



ماں میرے غم میں پاگل ہو گئی اور میرے ماموں نے ہماری ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ وہ شیطان آج بھی آزاد گھوم رہا ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

اتنا کہہ کر دُعا خاموش ہو گئی اور اس کی دکھ بھری داستان سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ ''ٹھیک ہے' میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔'' میں نے ہامی بھری تو اس کے آنسو رک گئے۔

''کسی طرح شمس اور اس کے دوستوں کو گھیر کر اسی فلیٹ میں لے آؤ' تب ہی میرا بدلہ مکمل ہوگا۔ اب میں چلتی ہوں' صبح ہونے والی ہے' ہر قدم پر تمہاری نادیدہ مدد ہوتی رہے گی۔''

اتنا کہہ کر دُعا دھواں بنی اور غائب ہو گئی۔

''میرے خدا! یہ سب کیا تھا؟ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا؟'' میں نے خود کلامی کی۔ وہ مظلوم اور معصوم تھی' اس کے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ اگر اس کا بدلہ لینا چاہے تو حق ہے اسے۔ میں سوچتا رہا' صبح اٹھ کر پہلے آفس فون کر کے کچھ دن کی چھٹی مانگی پھر بے مقصد باہر نکل آیا۔ خود بخود میرا رخ ڈیفنس فیز فور کی جانب تھا۔ ہزار گز پر بنی خیابانِ شمشیر میں یہ کوٹھی بیگم عارفہ خان کی تھی۔ بلا ارادہ ہی میں نے چوکیدار سے گیٹ کھولنے کو کہا۔ اس نے انجان نظروں سے میری جانب دیکھا تو میں نے اپنے آپ کو دُعا کی سہیلی کا بھائی ظاہر کیا۔ دُعا کے ماموں نے ملنے پر میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔

''دراصل میں پڑھائی کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا' دُعا کے لیے اپنی بہن کی جانب سے تحائف وغیرہ لے کر آیا ہوں۔'' میں نے بودا سا بہانہ کیا۔

''وہ اب اس دنیا میں ہے یا نہیں' مجھے کچھ علم نہیں' وہ تو کافی عرصے سے لاپتا ہے۔''

''تو کیا میں شمس سے مل سکتا ہوں؟'' میں نے ان کی بات کاٹی۔

''ہاں' ہاں' کیوں نہیں' مجھ سے ملیے' مجھے ہی شمس کہتے ہیں۔'' مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے کلین شیو گورے سے لڑکے نے اندر سے نمودار ہوتے ہی کہا۔

''مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آج رات کا کھانا آپ میرے گھر کھائیں۔'' میں نے فوراً شمس کو شیشے میں اتارنے کا فیصلہ کیا۔ شمس کے ڈیڈی اندر جا چکے تھے۔ شمس نے فوراً میری دعوت قبول کر لی جبکہ مجھے امید نہ تھی۔

''کیا ہی اچھا ہو کہ اس رنگین محفل میں آپ کے قریبی دوست بھی شامل ہوں۔ ملک کی ایک مشہور ماڈل کا ڈانس آئٹم بھی شامل ہے۔'' میں نے اس کی ہوس بڑھانے کے لیے جھوٹ بولا۔

شمس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''کیوں نہیں' ایسی محفلیں تو ہماری جان ہیں' ہم ضرور ان کو بھی لے کر آئیں گے۔'' شمس میری آفر پر خوش تھا' شاید عیاشی کرنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں گھر واپس چلا آیا اور سوچنے لگا۔ 'دُعا ان کے ساتھ کیا کرے گی؟' قریبی ریسٹورنٹ پر آرڈر دے کر آیا کہ شام کو کھانا گھر پہنچا دیں پھر سو گیا۔ شام کو اٹھ کر فریش ہوا اور شمس اور اس کے دوستوں کا انتظار کرنے لگا۔ وہ لوگ اپنی عادت کے مطابق کافی دیر سے آئے۔ شمس میرے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی گھبرایا۔

''یہ تمہارا گھر ہے' ہاں' کچھ عرصے پہلے ہی لیا ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''تم لوگ بیٹھو' میں ڈرنک لانا بھول گیا تھا' بس ابھی لایا۔'' ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا کر میں نے چابی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔

تقریباً دو گھنٹے تک میں سمندر کے کنارے ٹہلتا

# غزل

اُس کے دِل میں قیام ہے کہ نہیں؟
میرا ہونٹوں پہ نام ہے کہ نہیں؟

سوچ سُقراط نے کیوں زہر پیا؟
سچ کو آخر دوام ہے کہ نہیں؟

دل کی آنکھوں میں تُو دھڑکنے لگا
تجھ کو پہنچا سلام ہے کہ نہیں؟

آج ڈانٹا ہے ماں کو بیٹے نے
رشتوں کا احترام ہے کہ نہیں؟

تیرے آگے جھکا سرِ خاتم
اِس کے ذِمے یہ کام ہے کہ نہیں؟

فریدہ خانم

رہا' مجھے واپسی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ خدا جانے' دُعا کی روح نے ان کا کیا حشر کیا ہوگا؟ آخر جب صبر نہ ہوا تو واپسی کی ٹھانی۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے مجھے پسینے آنے لگے۔ صبح جب پولیس کو میرے فلیٹ سے لاشیں ملیں گی تو میرا کیا حشر ہوگا؟ جیسے ہی دروازے پر دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور فلیٹ خالی تھا۔ وہ سب کہاں چلے گئے' کچھ پتا نہ چلا۔ میں نے دُعا کو آواز دی تو اس کی آواز آئی۔

''ہاں' آج میں خوش ہوں۔ میری روح سکون میں ہے۔ تمہاری مدد کا شکریہ' تم ہر قدم پر کامیاب رہو گے۔'' پھر آواز آنا بند ہوگئی۔ سوچ سوچ کر میں پاگل ہونے لگا۔ آخر سب کچھ ایک دم کیا سے کیا ہوگیا؟

کچھ عرصے کے بعد میرے والدین حج سے واپس آئے اور قرآن خوانی وغیرہ کرائی۔ دُعا پھر مجھے کبھی نظر نہ آئی نہ اس کی آواز سنائی دی۔ شمس اور اس کے دوستوں کو دُعا نے ان ہی کے انداز میں گلا گھونٹ کر مارا تھا پھر ان کی لاشیں سمندر کے حوالے کردی تھیں۔ کافی عرصے کے بعد ان کی گلی سڑی لاشیں سمندر نے باہر اگل دی تھیں۔ ان کا سارا گوشت مچھلیوں نے کھا لیا تھا۔ لاوارثوں کی طرح ان کی ہڈیوں کے پنجر کو ایدھی والے لے گئے تھے۔

آج میرے حالات اس قابل ہیں کہ میں نے کلفٹن پر اپنا گھر بنا لیا ہے۔ وہ فلیٹ میرے لیے پراسرار تھا اس لیے وہ میں نے کچھ عرصے بعد چھوڑ دیا تھا۔ آج میں جس چیز پر ہاتھ رکھ دوں' میری ہو جاتی ہے۔ شاید بے بس و بے قصور روح کی مدد کر کے میں نے کوئی نیکی کا کام کیا جس کا مجھے اچھا صلہ ملا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

.....☆☆.....

ارم زہرا

# اس گھر کو آگ لگ گئی!

سہیل مالیگانوی کا خیال

انسان کہیں ستم سے شرماتا ہے
شیطان بھی آدمی سے گھبراتا ہے

**انسان جب نفس کا غلام بنتا ہے تو ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں**

''ماشاء اللہ' بڑی پیاری لگ رہی ہو آج۔''
راشد نے وجیہہ کے سراپے پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''اب اتنی بجی سنوری ہوں پیاری تو لگوں گی ناں!'' وجیہہ نے اٹھلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''اتنی سج سنور کے تم میرے ہی گھر آتی ہو یا؟'' راشد کا جملہ ادھورا تھا۔

''کم آن راشی' میں آپ کے لیے اسپیشلی تیار ہوئی ہوں۔'' وجیہہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

''تم مجھے کتنے پیار سے راشی پکارتی ہوں؟ سچ' مجھے بہت اچھا لگتا ہے' پلیز' وجیہہ' ذرا دوبارہ کہنا؟''

''راشی.....!'' وجیہہ نے قدرے اونچی آواز میں کہا تھا۔ اس کے چہرے پر شوخی نمایاں تھی۔

''وجیہہ' یہ تمہارے خالو ہیں' انہیں ذرا تمیز سے مخاطب کرو۔'' ٹرے میں چائے کے کپ لیے خالہ کرن اندر داخل ہوئیں تو وجیہہ سنبھل کر بیٹھ گئی جبکہ راشد کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''نہیں خالہ' بس یونہی' راشد اتنا پرانا سا نام ہے ناں تو میں نے سوچا' خالو کا نام راشی ہی رکھ لیا جائے۔ اب آپ کے شوہر اتنے ہینڈسم جو ہیں' ان پر راشی نام سوٹ کرتا ہے۔'' وجیہہ نے زبردستی کی بات بناتے ہوئے کہا تھا۔

''اونہہ' تم بتاؤ' بجو کیسی ہیں؟'' کرن سے وجیہہ نے اپنی بڑی بہن کی خیریت دریافت کی تھی۔

''ماما بالکل خیریت سے ہیں' میں نے سوچا' کالج سے سیدھی میں اپنی خالہ کے گھر آ جاؤں' اس بہانے اپنی آنی سے ملاقات تو ہو ہی جائے گی' ساتھ ہی ان کے تین نٹ کھٹ بچوں سے بھی مل لوں گی۔'' وجیہہ نے کمالِ محبت سے کرن کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''مگر وجیہہ' بچے تو آج اسکول سے لیٹ آئیں گے۔'' راشد نے وجیہہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں' آج تو بچوں کے اسکول میں فنکشن ہے۔'' کرن نے یہ بتاتے ہوئے چائے کا کپ وجیہہ کی جانب بڑھا دیا تھا۔

''ہائے خالہ' پھر تو بہت دیر ہو جائے گی۔ میں گھر چلتی ہوں۔'' وہ مصنوعی فکر چہرے پر سجائے اب چائے کے سپ لے رہی تھی۔

''نہیں بھئی' اس بھری دوپہر میں تم گھر اکیلے کیسے جاؤ گی؟ راشد' پلیز' آپ وجیہہ کو گھر ڈراپ کر دیں' یہ اکیلی گئی تو میں پریشان ہی رہوں گی۔''

''ہاں' ہاں' یہ ٹھیک ہے۔'' اپنی خالہ کرن کی یہ بات سنتے ہی وجیہہ کے چہرے پر شفق سے رنگ پھیل گئے تھے۔

''ٹھیک ہے پھر ابھی فوراً اٹھو' مجھے اپنی شاپ پر بھی جانا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے راشد کے چہرے پر بشاشت کے رنگ نمایاں تھے۔

''اچھا خالہ' اپنا خیال رکھیے گا اور تینوں بچوں کو میری طرف سے خوب سارا پیار کیجیے گا۔ میں پھر آؤں گی۔'' بیگ شولڈر پر ہینگ کرتی وجیہہ' کرن سے مخاطب تھی۔

''خبردار جواب تم اکیلی کالج سے یہاں آئیں' بجو کو پتا چل گیا تو وہ تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی خبر لیں گی۔'' کرن نے وجیہہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔

''اُفوہ خالہ.....! آپ بھی بالکل ماما پر گئی ہیں۔ ہر بات پر روک ٹوک؟''

''وجیہہ.....! جلدی سے آؤ' دیر ہو رہی ہے۔'' راشد بائیک اسٹارٹ کیے اب آوازیں لگا رہا تھا۔

''چلو اب دعائیں پڑھتے ہوئے جانا اور گھر جا کر مجھے ایک میسج کر دینا۔''..... کرن قدرے خوشگوار انداز میں وجیہہ کو رخصت کرتی اب چائے کے کپ ٹرے میں رکھ رہی تھی۔



''عجیب لڑکی ہے' جب دیکھو' کالج سے میرے گھر آ جاتی ہے۔'' خود سے مخاطب اَب وہ کچن کی جانب مڑ چکی تھی۔

•.....•.....•

''ویسے سچ کہوں وجیہہ' تم پہ کھلے بال بہت اچھے لگتے ہیں۔'' راشد نے بائیک پہ پیچھے بیٹھی وجیہہ کو بڑے پیار سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ راشی' سچ' آپ کتنے اچھے ہیں۔'' راشد کی بات سنتے ہی وجیہہ کا دل محبت بھری خوشگوار دھڑکنوں کے شور میں ڈوب گیا تھا۔

''تمہیں اگر دیر نہیں ہو رہی ہو تو قریبی ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں؟'' راشد نے بائیک کی اسپیڈ سلو کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''راشی' نیکی اور پوچھ پوچھ۔ کیوں نہیں! مجھے تو بڑی زوروں کی بھوک لگ رہی ہے اور پھر میں آپ کے ساتھ جتنا بھی وقت گزاروں' جانے کیوں مجھے کم ہی لگتا ہے۔''

''وجیہہ' مجھے بھی تم بہت اچھی لگتی ہو!'' بائیک سے اترتے ہوئے راشد بے ساختہ وجیہہ کے گال کھینچتے ہوئے بولا تھا تو وہ شرم سے نظریں جھکا کر رہ گئی تھی۔

''آؤ میری بلبل!'' وہ بڑی ہی شان سے وجیہہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کا ماحول' دھیما دھیما میوزک اور وہاں موجود سر جوڑے جوڑوں کو دیکھ کر وجیہہ کے چہرے پر بڑی ہی دلفریب مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''راشی' ہم اس کونے والی ٹیبل کی جانب چلتے ہیں۔''

''اتنے کونے میں؟'' راشد نے وجیہہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اونہہ' کیا برائی ہے' اس کونے والی ٹیبل میں؟'' وجیہہ مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

''ارے نہیں' کوئی برائی نہیں ہے' آؤ وہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' راشد آگے بڑھ گیا تھا اور وجیہہ اس کے پیچھے ٹیبل تک آئی تھی۔

''راشی' کاش' آپ مجھے مل جاتے تو ہماری زندگی کتنی حسین ہوتی' ہماری سوچ ایک جیسی ہے' آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ تنگ ذہن نہیں ہیں۔'' وجیہہ نے کمالِ مہارت سے اپنے دل کی بات راشد تک پہنچائی تھی۔

''وجیہہ' اچھی تو تم بھی مجھے بہت لگتی ہو مگر اب کیا ہو سکتا ہے' میرے تین بچے ہیں اور تم بھی تو مجھ سے کتنی چھوٹی ہو' بالکل گڑیا ہو' میری گڑیا!'' راشد نے بڑے ہی پیار بھرے انداز میں وجیہہ کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا تھا۔

''راشی' سچ' میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کے سنگ اپنی زندگی گزاروں' آپ کا یہ والہانہ پیار اور میرے لیے آپ جو اپنی مصروفیت کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں' سچ' مجھے یہ بات بہت اٹریکٹ کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں' جتنا آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں' اتنا تو میں بھی آپ سے نہیں کرتی۔''

''وجیہہ' پہلے کھانے کا آرڈر دے دو' باقی باتیں بعد میں کرتے ہیں۔'' راشد نے مینو کارڈ وجیہہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''راشی' ایک بات سچ سچ بتائیے گا کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟'' وجیہہ نے کھانے کے دوران راشد کو کریدنا شروع کر دیا تھا۔

''اگر سچ کہوں تو.....''

''تو کیا.....؟'' وجیہہ کے لہجے میں بے چینی عود آئی تھی۔

''وجیہہ' میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں لیکن یہ خیال ہمیشہ میرے راستے میں حائل ہو جاتا ہے کہ

میں تین بچوں کا باپ ہوں اور یوں میرے تمہاری طرف بڑھتے قدم رک جاتے ہیں۔'' راشد سر جھکائے کہہ رہا تھا' شاید یہ بھی اعتراف محبت کا کوئی انوکھا انداز تھا۔

''اوہ راشی.....! مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ہاں' مجھے یہ بات ضرور ڈراتی ہے کہ خالہ میرے بارے میں کیا سوچیں گی؟ اور.....'' وجیہہ کے چہرے پر ڈر کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے تھے۔

''پلیز وجیہہ' کرن کو یہ بات کبھی بھولے سے بھی نہیں بتانا' کبھی اس کے سامنے ذکر بھی نہیں کرنا کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ میری شادی شدہ زندگی کہیں خراب ہی نہ ہوجائے؟'' راشد ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولا تھا۔

''اور میں؟'' وجیہہ نے حیرت سے راشد کو دیکھا۔

''تم تو میری جان ہو لیکن میں خاندان میں تماشہ نہیں بننا چاہتا' بس یار' سمجھا کرو ناں؟'' راشد کا لہجہ بے چارگی لیے ہوئے تھا۔

''واہ راشد! جب اتنے ڈرپوک ہو تو کس نے کہا تھا کہ مجھ سے پیار کرو؟'' وجیہہ ٹھنک کر بولی تھی۔

''پاگل پن والی باتیں نہیں کرو' اگر کرن کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی ناں تو وہ تینوں بچے میرے حوالے کرکے اپنی ماں کے گھر جا کر بیٹھ جائے گی۔ کیا تم سنبھال لوگی ان تینوں کو؟''

راشد کے اس سوال پر وجیہہ کی آنکھیں جیسے کھل گئی تھیں۔ ''نہیں بھئی' مجھ سے کہاں سنبھلیں گے بچے لیکن راشی' ایک بات سچ کہوں تو وہ یہ ہے کہ میں دل کی گہرائیوں سے آپ سے پیار کرتی ہوں' کب' کیسے ہوا یہ پیار' یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن ہاں! اتنا ضرور جانتی ہوں کہ آپ کو پانے کی خواہش اور محبت میرے دل میں سر ابھارتی ہے۔'' وجیہہ محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جبکہ راشد کسی نئی دنیا میں کھو سا گیا تھا۔

•.....•.....•

''کیسی ہو وجیہہ' کب سے نمبر ملا رہا ہوں' کال تو ریسیو کیا کرو؟'' راشد نے وجیہہ کے کال ریسیو کرتے ہی شکوہ کیا تھا۔

''ارے' کب سے کہاں' کال تو آئی ہی ابھی ہے۔'' وجیہہ کے لہجے میں حیرت کا عنصر شامل تھا۔ ''شاید موبائل میں گڑبڑ ہے۔''

''اف! اب میری موبائل کی دکان کا کیا فائدہ؟ کیا میں اپنی محبوبہ کو ایک نیا موبائل بھی نہیں دے سکتا!'' راشد نے بڑے موڈ میں کہا تھا۔

''اوہ ہو' یہ تو بڑی اچھی بات ہے پھر کب مل رہا ہے مجھے نیا موبائل؟'' وجیہہ نے بڑے خوشگوار انداز میں سوال کیا تھا۔

''پہلے اپنا پرانا موبائل سامنے والی دیوار پر دے مارو پھر ملے گا نیا۔''

''ارے راشی' ابھی کیسے؟ ابھی تو میں آپ سے بات کر رہی ہوں؟''

''اچھا' میری سوئیٹی' کل تم کالج سے واپسی پر میری طرف آجانا' میں تمہیں نیا موبائل دے دوں گا۔'' راشد کے لہجے میں وجیہہ کے لیے پیار ہی پیار نمایاں تھا۔

''نہیں بھئی' میں آپ کے گھر نہیں آؤں گی' کرن خالہ ویسے ہی مجھے ڈانٹتی ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ شک کے دائرے میں ہی آجاؤں۔''

''اوہ ہاں! ٹھیک ہے پھر ایسا کرتے ہیں' میں کالج سے تمہیں پک کرتا ہوں' ہم کسی پرسکون جگہ پر بیٹھیں گے' تم اپنے خوبصورت سے موبائل کی خوبصورتی میں کھونا اور میں تمہاری خوبصورتی سے دل بہلاؤں گا۔'' راشد کے لہجے سے جیسے لفظ ادا نہیں



ہو رہے تھے' گویا شہد ٹپک رہا تھا۔

''راشی' راشی' سچ' آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی' میں کل آپ کا بے چینی سے انتظار کروں گی' آپ کل کالج سے مجھے ٹھیک ایک بجے پک کر لیجیے گا۔'' وجیہہ نے کچھ کھوئے کھوئے انداز میں کہا تھا اور لائن کاٹ دی تھی۔

''سب خیریت تو ہے ناں بادشاہ! یہ ایک بھابھی کے ہوتے ہوئے نئی بھابھی کے کیا؟'' راشد نے سامنے بیٹھے دوست خرم کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسے ڈرو گے تو سیدھا بھابھی کے پاس پہنچ جاؤں گا اور سب کچھ بتا دوں گا۔'' خرم نے دھمکی دینے والے مصنوعی انداز میں کہا تھا۔

''ارے نہیں یار' تیری بھابھی کی بھانجی تو ہے' بہت پیاری لڑکی ہے۔ یار' مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔'' راشد نے قدرے سنجیدگی سے خرم کو بتایا تھا۔

''کہاں ملو گے یار' بھابھی کو اگر پتا چل گیا تو؟'' خرم نے کھوجتی نظروں سے راشد کو دیکھا تھا۔

''ہاں یار' یہی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ اسے کہاں لے جاؤں۔ خیر' کل تم ذرا دکان دیکھ لینا' میں شام میں ہی لوٹوں گا۔''

''ایک بات کہوں راشد بھائی؟''

''ہاں' بولو؟'' راشد نے خرم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''میرا گھر خالی پڑا ہے' کیوں ناں؟'' راشد نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''ارے یار جیو' تمہارا گھر تو نزدیک ہی ہے' سچ' تم نے تو میرا بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔'' راشد نے ایک خوشی اور جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اتفاق سے مکان خالی ہے ورنہ تو کرائے پر چڑھنے ہی والا تھا۔ مجھے وہ لوگ سمجھ نہیں آئے اسی لیے میں نے نہیں دیا۔''

''اچھا ہی ہوا ناں! خیر' مکان کی چابیاں؟'' راشد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھے اور خرم کو گلے سے لگا لے۔

''چابی کل صبح لے لینا' اب میں جیب میں رکھ کے تو گھومنے سے رہا۔'' خرم نے راشد کی بے تابی دیکھتے ہوئے منہ بنایا تھا۔

''قسم سے یار' تو نے میرا بڑا مسئلہ حل کر دیا! اب کل یاد سے چابی لیتے آنا' یہ نہ ہو کہ بھول جاؤ۔'' راشد نے خرم کو ایک بار پھر یاد دہانی کرائی تو اس نے راشد کے آگے ہاتھ جوڑ لیے تھے۔

''معاف کرو یار.....!'' خرم کی اس بے ساختگی پر وہ دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے تھے۔

•.....•.....•

''ارے راشی' یہ کس کا گھر ہے؟'' بند دروازے میں لگے تالے کو چابی لگاتا دیکھ کر وجیہہ نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

''جلدی سے اندر چلو۔'' راشد تالا اور دروازہ کھولنے کے بعد وجیہہ کو تقریباً دھکیلتا ہوا دروازہ اندر سے لاک کر چکا تھا۔

''ارے' آپ بتاتے کیوں نہیں' ہم کس کے مکان میں آئے ہیں راشی؟'' وجیہہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے پورے گھر کا جائزہ لیا تھا۔

''دوست کا گھر ہے۔'' وہ لان میں پڑے صوفے کی گرد صاف کرتے ہوئے بولا تھا۔

''راشی' میں اتنی تیار ہو کے آئی تھی' میرے ذہن میں تھا' آپ مجھے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لے کر جائیں گے مگر آپ تو یہاں!'' اس کی نظریں ابھی تک صوفے پر جمی گرد پر تھیں۔

''مائی سوئیٹی' اس سے اچھی جگہ اور کیا ہو سکتی

ہے جہاں ہم دونوں کو قربت کے لمحے میسر آئیں اور اپنا نیا موبائل تو دیکھو ٹچ اسکرین ہے۔" راشد نے وجیہہ کے پھولے ہوئے چہرے کو آہستگی سے چھوتے ہوئے کہا تھا تو وہ مکمل رام ہوگئی تھی۔

"واہ راشی، یہ تو بہت خوبصورت ہے۔" وہ موبائل کی کی پریس کر رہی تھی جبکہ راشد، وجیہہ کی خوبصورتی میں مدہوش ہوئے جا رہا تھا۔

"وجیہہ......! سچ بتاؤ، تم مجھ سے کیا واقعی بہت پیار کرتی ہو؟"

"ہاں راشی، خود سے بھی زیادہ۔" یہ کہتے ہوئے وہ بڑے موڈ میں موبائل سے راشد کی تصویریں اتارنے لگی تھی۔

"یار، یہ گھر جاکے دیکھ لینا، ابھی مجھ سے باتیں کرلو، جانے پھر کبھی ایسا موقع ملے بھی؟" راشد کا جملہ ادھورا تھا مگر وجیہہ کی سانسیں اتھل پتھل ہوگئی تھیں۔

"راشی، اگر آپ مجھے پہلے ملے ہوتے تو آج ہم ایک ساتھ رہ رہے ہوتے۔" وجیہہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا تھا۔

"سنو، ہم اب بھی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں!" راشد نے اس کی تھوڑی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟" وجیہہ کے لہجے میں خوشی کے ساتھ حیرت بھی تھی۔

"اگر تم چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" راشد گہری سانس بھرتے ہوئے بولا تھا۔

"راشی، آپ کا ساتھ میری زندگی کا مقصد ہے لیکن کرن خالہ کیا سوچیں گی ہمارے بارے میں؟" اگلے ہی پل اس کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر رنجیدگی نمایاں نظر آنے لگی تھی۔

"ہم اس کو کچھ بتائیں گے ہی نہیں، بس خاموشی سے نکاح کرلیں گے۔ بتاؤ، دوگی میرا ساتھ؟" راشد نے فرطِ محبت سے اسے بازوؤں میں تھامتے ہوئے کہا تھا تو وہ ہوں کہتی اس کی باہنوں میں سما گئی تھی۔

.......•.......•.......

"ارے یار، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، دوگنا کرائے پر تو اٹھانا تو ہے ہی۔" خرم نے راشد کو گھر کی چابیاں دیتے ہوئے کہا تھا۔

"یار، تیرا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" راشد نے بڑی احسان بھری نگاہوں سے خرم کو دیکھا تھا۔

"لیکن یار، نئی بھابھی کے لانے کی خوشی میں کوئی دعوت تو دے یار، کیا بس یونہی شکریہ پر ٹرخا دے گا؟" خرم نے آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے یار! کیوں نہیں، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، بس ذرا نئے گھر میں سیٹ ہو جاؤں پھر کسی فرصت میں تجھے بلاؤں گا۔ اب ذرا نکلوں گا، وہ بے چاری میرے انتظار میں گھبرا رہی ہوگی۔" راشد اپنی دکان خرم کے حوالے کرکے نکل گیا تھا۔

"خرم صاحب! یہ بہت اچھا موقع ہے، دکان پر قبضہ کرنے کا۔" وہ خود سے مخاطب ہوتے ہوئے راشد کے گھر کا نمبر ڈائل کر چکا تھا۔

"کرن بھابھی بات کر رہی ہیں؟ دیکھیے، میں آپ کا خیر خواہ ہوں، آپ کے شوہر راشد نے آپ کی بھانجی وجیہہ سے خفیہ شادی کرلی ہے اور وہ اسی محلے کے ایک مکان میں اس وقت موجود ہیں۔" خرم اب اپنا کام کر چکا تھا پھر اس نے بڑے ہی مکروہ انداز میں ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا اور پھر موبائل سے سم نکال کر دو ٹکڑے کرکے ڈسٹ بن میں ڈال دی تھی۔

.......•.......•.......

کرن کے دونوں بھائی اور دو دوست بالآخر راشد کا نیا گھر ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ دروازہ وجیہہ نے ہی کھولا تھا، اپنے سامنے دونوں ماموں کو دیکھ کر اس کے تو اوسان ہی خطا ہوگئے تھے۔

"شرم نہیں آئی تمہیں یوں منہ کالا کرتے ہوئے؟" وجیہہ کے ماموں آصف نے اس کے گال پر زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ...... ماموں......! میں......!" اس سے آگے وہ کچھ نہیں بول سکی تھی، بس اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

"اس پر کیوں ہاتھ اٹھا رہے ہیں آپ؟" راشد کمرے سے چیختا ہوا نکلا تھا۔

"اوہ...... سالے...... بے غیرت...... تو نے یہ کیا کیا ہے؟" آصف نے آگے بڑھتے ہی راشد کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

"ارے، میری مرضی! میں ایک کروں یا چار؟ تیری بہن کو میں نے کون سا گھر سے نکال دیا ہے؟" راشد نے جذباتی انداز میں جواب دیا تھا۔

"گھر سے نہیں نکالا لیکن گھر تو اجاڑ دیا اور یقیناً تو نے ہی میری بھانجی کو اپنے جال میں پھنسایا ہوگا۔ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" آصف کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کی آنکھیں تو جیسے ابل چکی تھیں۔

"نکل میرے گھر سے، اس سے پہلے کہ دھکے دے کر گھر سے باہر نکالوں۔" راشد نے آصف کو دھکا دیتے ہوئے کہا تھا۔ "اور دیکھ، اگر تو زیادہ شور مچائے گا تو میں تیری بہن کو طلاق دے دوں گا، تین بچوں کے ساتھ جب وہ گھر واپس جائے گی تو؟"

"چٹاخ......" آصف ایک زوردار تھپڑ راشد کے گال پر رسید کر چکا تھا۔ "کیا کہا تو نے؟ طلاق دے گا میری بہن کو؟" آصف کی اس چیخ کے ساتھ سب سے چھوٹا بھائی جو خاموشی سے کھڑا تھا، وہ باہر جو دوست موجود تھے، وہ بھی اندر آگئے تھے اور پھر چاروں نے مل کر راشد کو مارنا شروع کردیا تھا۔ ایک کونے میں سکتے کے عالم میں موجود وجیہہ اس کو بچانے سے قاصر تھی، وہ بس سسکیاں لے رہی تھی اور وحشت زدہ نظروں سے راشد کو پٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

.......•.......•.......

دوسرے دن تمام اخبارات میں یہ خبر موجود تھی کہ اے بی سینیا لائن کے رہائشی راشد شیخ کو اس کے دو سالوں نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر ڈنڈے، لاتوں، گھونسوں سے بری طرح زدوکوب کر کے اس کا سر دیواروں سے مار کر شدید زخمی کر دیا اور خود بھاگ گئے۔ اہلِ محلہ نے راشد کو زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا مگر وہ راستے میں ہی دم توڑ چکا تھا جبکہ وجیہہ کی مسلسل بے ہوشی، ڈاکٹروں کے لیے باعثِ تشویش ہے۔

اٹھائیس سالہ راشد اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اپنی سالی کی بیٹی سے شادی کرنے کے جرم میں وہ اپنی زندگی گنوا بیٹھا تھا لیکن اس سارے معاملے میں قصوروار کون ہے؟ راشد شیخ، جو بیوی اور تین معصوم سے بچوں کا باپ ہوتے ہوئے بھی ایک نوعمر لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوگیا یا پھر وجیہہ جسے ماں باپ کی بے جا آزادی نے اس نہج پر پہنچا دیا کہ وہ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے میں خود مختار ہوگئی اور نا صرف اپنی بلکہ اپنی خالہ کی زندگی بھی برباد کر بیٹھی!!

کاش لڑکیاں یہ سمجھ جاتیں کہ ہوس اور محبت میں کتنا فرق ہوتا ہے، کبھی کبھی مرد بھی اس باریک دھاگے جتنے فاصلے کی سنگینی اور نازکی کو نہیں سمجھ پاتا مگر بہر حال اس کا نقصان کبھی دانستہ، کبھی نادانستہ عورت کو ہی ہوتا ہے لیکن اس کی ذمے داری ماں باپ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ آج بے جا آزادی نے ہماری نئی نسل کو بے راہ روی کی راہ پر ڈال دیا ہے ساتھ ہی اچھی تربیت کے فقدان نے دل دہلا دینے والے واقعات کو ایک عام سی کہانی بنا دیا ہے!

......☆☆......

محمد اقبال زمان

# ایک قیامت تھی وہ

عارف شفیق کا خیال

میں سوچتا ہوں مرے اختیار میں کیا ہے
لہو رلاتا ہے ہر لمحہ بے بسی کا عذاب

**شہر کراچی میں پیش آنے والے لہو رلاتے حادثے کا ماجرا**

میرے شہر کی کہانی ہر گزرتے دن کے ساتھ غم اور لہو سے سرخ ہوتی جا رہی ہے۔ اس صورتِ حال پر میں بہت دکھی ہوں، میرا ملال سے آباد دل چیختا تو یہی ہے کہ میرے شہر کراچی میں ہی نہیں، میرے پاکستان اس پوری دنیا میں امن اور محبت ہو لیکن اس دل کے چاہنے سے بھلا کیا ہوتا ہے!..... پھر میں بہت دکھی دل سے سوچتا ہوں کہ میرے اور مجھ جیسے امن پسند انسانوں کے اختیار میں ہے کیا؟..... لہو رلاتے مناظر کے ساتھ بس بے بسی کا عذاب ہے..... کیا غضب ہے کہ ابھی لہو رلاتا ایک منظر پوری طرح نظر سے اوجھل بھی نہیں ہوتا کہ نیا منظر کسی نئے سانحے کی صورت سامنے آ کھڑا ہوتا ہے!!

سانحہ عباس ٹاؤن اپنے پیچھے رنج والم کی دردناک داستانیں چھوڑ گیا ہے..... کئی مائیں اپنے ننھے بچوں کی جدائی میں نڈھال ہیں، کئی بچے اپنے والدین کو لوگوں کے چہروں میں تلاش کر رہے ہیں، رخصتی کے انتظار میں بیٹھی دلہنیں اپنے سہاگ کا سکھ دیکھنے سے پہلے بیوہ ہو چکی ہیں، کئی لوگ اپنے پیچھے روشن مستقبل کی امید کے وعدے چھوڑ گئے ہیں۔ عباس ٹاؤن کے متاثرین کو ہمیشہ کے لیے اپنے بچھڑ جانے والوں کا درد بے حال کیے ہوئے ہے۔

اقرا سٹی کے فرسٹ فلور پر واقع فلیٹ نمبر A-107 کے رہائشی سید باقر حسین کی والدہ کا کہنا ہے کہ..... اُن کا ننھا بیٹا چھٹی جماعت کا طالب علم سید باقر حسین شروع ہی سے دیگر بچوں سے کافی مختلف تھا۔ ذہانت بھری شرارتیں، حد درجہ پڑھنے کا شوق اور سلجھی ہوئی بڑی بڑی باتیں اس کے مزاج کا خاصہ تھیں۔ باقر اسکول کے بعد شام ساڑھے 6 بجے ٹیوشن جاتا اور ساڑھے 8 بجے گھر لوٹتا تھا۔ سانحے والے روز اتوار کی وجہ سے باقر گھر پر ہی موجود تھا۔ اس کی والدہ اپنے ایک عزیز کے جہلم میں شرکت



کے لیے ملیر گئی ہوئی تھیں۔ دیگر بہن بھائی کرکٹ کا میچ دیکھ رہے تھے جبکہ سید باقر حسین دوسرے کمرے میں بیٹھا پڑھائی میں مشغول تھا۔ بھائی زین کا کہنا ہے کہ دھماکے سے کچھ ہی دیر قبل باقر اُس کے پاس آیا، اُس سے 20 روپے مانگے اور کہا۔

"مجھے آلو کے چپس کھانے ہیں۔"..... بھائی نے کوشش کی کہ وہ شام کے وقت باہر نہ جائے مگر باقر ضد قائم رہا اور زین نے مجبور ہو کر اسے 20 روپے دے دیئے۔ باقر پیسے لے کر خوشی خوشی گھر سے چپس خریدنے نکل گیا۔ اسے گئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ایک زور دار دھماکے کی آواز سنائی دی جس کے فوراً بعد لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں..... زین کا کہنا تھا۔

"میں فوراً باہر دوڑ پڑا۔ میں نے باہر سڑک پر انسانی جسموں کے مختلف اعضاء گوشت کے لوتھڑے اور بکھرا ہوا خون دیکھا تو میں بھائی کی تلاش میں اِدھر سے اُدھر دوڑنے لگا۔ ہر طرف شور، چیخیں، آگ اور دھواں تھا۔ ننھے باقر کو ڈھونڈتے کئی گھنٹے گزر گئے۔ بالآخر رات 11 بجے جناح اسپتال کے مردہ خانے سے اس کی خون میں لت پت لاش ملی۔"..... باقر حسین تمام بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ زین کا کہنا ہے۔

"باقر کی خواہش تھی کہ وہ بڑا ہو کر ذاکر بنے لیکن شہادت نے اُس کی تمام معصوم خواہشات کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔"

سانحہ عباس ٹاؤن بم دھماکے میں 12 سالہ زین بھی شہید ہوا۔ اس کے بڑے بھائی زریاب علی نے بتایا کہ..... ہم پانچ بہن بھائی ہیں، زین چوتھے نمبر پر تھا۔ اتوار کی شام تقریباً ساڑھے چھ بجے کے قریب زین مجھ سے دس روپے لے کر پنسل لینے گیا تھا کہ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک

زوردار دھماکہ ہوا۔ دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ ٹی وی نیچے گر گیا۔ میں فوراً باہر آیا تو اقراسٹی گیٹ کے سامنے دھواں اٹھ رہا تھا جبکہ آمنے سامنے کی دونوں عمارتوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں زین کو اقراسٹی کے اندر ڈھونڈنے لگا لیکن اس کا کہیں پتا نہیں چلا تو زخمیوں میں اسے تلاش کیا۔ اسی تلاش کے دوران رات کو جناح اسپتال سے زین کی لاش ملی تھی۔''

سانحے میں جاں بحق ہونے والا 25 سالہ سید احمد شاہ لد سید یوسف شاہ ڈھائی سال قبل پڑھنے کے لیے گلگت سے کراچی آیا تھا۔ اُس نے عباس ٹاؤن میں کرائے پر کوارٹر لے کر رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ احمد شاہ کے دوست زکاوت علی نے بتایا۔

''احمد شاہ میرے گاؤں کا رہنے والا تھا اور ڈھائی سال قبل پڑھنے کے لیے کراچی آیا تھا۔ احمد شاہ نے میرے ساتھ عباس ٹاؤن میں ایک ہی کوارٹر میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ احمد شاہ بہت ذہین طالب علم تھا' اس نے اچھے نمبروں سے انٹر پاس کیا تھا اور کراچی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ احمد شاہ کا تقریباً آٹھ ماہ قبل گاؤں میں نکاح ہوا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو بے انتہا خوش تھا اور اپنے نکاح کی خوشی میں ہم سب دوستوں کو کھانا بھی کھلایا تھا۔ واقعے والے روز میں اور احمد شاہ گھر پر ہی تھے۔ شام کے وقت میرا دوست آ گیا اور میں اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ اسی دوران احمد شاہ نے بتایا کہ میری 6 مہینے کے بعد شادی کی تاریخ پکی ہوگئی ہے' اسی خوشی میں آج رات کا کھانا میری طرف سے۔ ابھی وہ ہم سے باتیں کر رہا تھا کہ مغرب کی اذان ہوگئی۔ اُس نے وضو کیا اور میرے دوست کے ساتھ نماز پڑھنے چلا گیا۔ اُس کے جانے کے 10 منٹ بعد ہی زوردار دھماکہ ہو گیا۔ میں نے فوراً اپنے دوست کو فون کر کے پوچھا کہ ''تم لوگ کہاں ہو اور یہ دھماکہ کہاں ہوا ہے؟

## قیامت.....

دہشت گردوں کے بم دھماکوں کی صورت
قیامت سے پہلے
ایک قیامت!
آنے لگی ہے اور.....!
دل ڈھانے لگی ہے

(ن ۔ ر)

اُس نے کہا کہ میں تو ابھی پیراڈائز بیکری پر ہوں اور احمد شاہ امام بارگاہ کی طرف گیا ہے۔ میں نے احمد شاہ کے موبائل فون پر مسلسل کال کرتا رہا لیکن کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ رات 11 بجے کے قریب احمد شاہ کے موبائل میں کسی شخص نے فون ریسیو کیا اور کہا کہ تم فوراً جناح اسپتال آ جاؤ۔ میں فوراً جناح اسپتال کی ایمرجنسی میں جا کر اپنے دوست کو ڈھونڈنے لگا لیکن اس کا کچھ پتا نہیں لگا۔ لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اسپتال کے مردہ خانے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ وہاں پر 20 سے 25 لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک لاش پر سے چادر اٹھائی تو احمد شاہ کی خون میں لتھڑی لاش دکھائی دی۔ یہ دیکھتے ہی میرے پیروں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ بعد میں' میں نے تمام صورتِ حال سے احمد شاہ کے والدین کو آگاہ کیا اور لاش کو ہوائی جہاز کے ذریعے گلگت روانہ کر دیا۔''

اور..... مگر اب اور کیا سناؤں کہ ہر کہانی زندگی سے محروم ہے..... بس ایک قیامت تھی وہ..... اور قیامت کا منظر بیان کرنا آسان تو نہیں!!

☆☆



# سفر کہانی جیتے جاگتے دوڑتے بھاگتے سچے مناظر کی آنکھوں دیکھی روداد

قمر علی عباسی

## ذکر جل پری کا

آتش کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

قمر علی عباسی کے قلم سے ڈنمارک کے سفر کا آنکھوں دیکھا حال

### مال مو میں شام

کوپن ہیگن میں سیکڑوں افراد سے ملاقات ہوئی' بہت سے لوگوں کے نام یاد رہے نہ چہرے ذہن میں محفوظ ہوئے۔

ایک دن ترغیب نے کہا کہ ان کے دوست ہماری دعوت کرنا چاہتے ہیں۔ سیر و سیاحت کے دوران کھانے کا تکلف نہیں کرتے۔ بعض وقت بسکٹ اور پانی پر گزارہ کرتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے شہر برن میں ایک دوپہر ٹماٹر کھا کر لنچ کیا۔

ترغیب نے بتایا۔ ''ان صاحب نے دھمکی دی ہے' اگر دعوت پر نہ آئے تو مراسم توڑ لیں گے۔''

ہمیں یہ کب گوارا ہوتا' ترغیب دیارِ غیر میں کسی سے محروم ہو جائیں۔ ان صاحب نے رعایت دی تھی کہ دوپہر یا رات کو آ جائیں یعنی اوپن ہاؤس تھا۔ شرط یہ تھی کہ ایک گھنٹے پہلے اطلاع کر دیں تاکہ گرم' لذیذ اور ذائقے دار کھانا تازہ تیار کیا جائے۔ ترغیب نے انہیں ٹیلی فون کر دیا' شام تک پہنچ جائیں گے۔ دعوت سے زیادہ ہمارے لیے کشش یہ تھی کہ وہ صاحب سویڈن کے شہر مال مو میں رہتے ہیں۔ اس بہانے نئی بستی دیکھ لیں گے۔ مال مو والے بھی گلہ نہیں کریں گے' اتنے نزدیک آ کر ہمارے در و بام نہ دیکھے۔

بٹ سہ پہر کو گاڑی لے آئے۔ سفر شروع ہوا۔ سورج ہماری مدد کر رہا تھا۔ وہی منظر پریوں والا۔ وہ لمحہ جب ننھی جل پری سمندر سے نکلی تو اس کے پاس لباس نہیں تھا۔ محل کے ایک کمرے سے چادر اوڑھ کر شہزادے کی سالگرہ میں شرکت کی۔ کوپن ہیگن میں ایک نہیں' کئی محل ہیں لیکن کسی عام پری کو داخلے کی اجازت نہیں' صرف شاہی پریاں ہی وہاں رہ سکتی ہیں۔ پریوں کی مجبوری تھی جو کوپن ہیگن کے عام گھروں میں رہتی ہیں اور ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہر

منظر دیکھتے ہیں بلکہ یہی سب دیکھنے سفر کرتے ہیں۔

کئی جگہ مجسمے تھے، رقص کرتی بے جان پریاں، ان کی طرف کون توجہ کرتا ہے اس لیے وہ برسوں سے پتھر بنی ہوئی ہیں۔

سمندر آیا تو بٹ نے کہا۔ ”یہاں کوپن ہیگن کی ذائقہ والی آئس کریم ملتی ہے۔“

ہم زبان کے چٹخارے اور ذائقے کے لیے تنور اور ڈھابے تک جاتے ہیں۔ جو لذیذ کھانا پکاتے ہیں، ہماری وجہ سے پھول پھل رہے ہیں۔

آئس کریم اہتمام سے آئی۔ ہم نے امید سے کھائی لیکن بھیل پوری نکلی۔

ایک بار ہندوستان کے شہر ممبئی گئے۔ بھیل پوری کی بڑی شہرت سنی تھی۔ اندرا گاندھی پارک میں ایک ٹھیلے سے لے کر کھائی۔ چاول کے مرمرے، بیسن کے کیسو، کچی پیاز، دو چٹنیاں۔ اس ملغوبے نے مایوس کیا۔ جو کھانے کی ڈش امید پر پوری نہ اترے وہ بھیل پوری ہوتی ہے۔ اکثر اونچی دکان، پھیکے پکوان ہوتے ہیں۔ اس کی شہرت کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے کھانے کے بعد اگر مشہور ہو جائے تو ایک بات ہوگی۔

گاڑی ایک منڈیر کے پاس پارک تھی جہاں سے نیلا سمندر شروع ہوتا ہے، وہاں سے نظارہ دیکھنے لگے تو چند کبوتر آ گئے ہمیں دیکھنے۔ سمندر روز دیکھتے ہوں گے۔ ہم نے بٹ کی آنکھ بچا کر اپنے پرستار کبوتروں کی خاطر آئس کریم سے کردی۔ ان پر کیا گزری، اس کی اطلاع نہیں ملی۔ ہم خیریت سے ہیں۔

آئس کریم کی تعریف کی۔ بٹ نے بل دیا تھا۔ وہ اس درجہ خوش ہوئے جیسے انہوں نے بنائی ہو۔

سفر شروع ہوا تو سامنے سمندر نظر آیا پھر راستہ نیچے ہوا اور سرنگ شروع ہوگئی۔ بٹ نے بتایا۔ ”ہم سمندر کے نیچے سفر کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنا کفایت شعاری کرتے ہیں، کسی مشروب کو پینے میں احتیاط نہیں کرتے، ان کا 4 ہزار فٹ نیچے یہ ایک کارنامہ ہے۔ یہ اورسنت کہلاتا ہے۔ ڈنمارک کو سویڈن سے ملاتا ہے۔ سرنگ کے بعد پل ہے۔ ان دونوں کی لمبائی 16 کلومیٹر ہے۔

پل ختم ہوا تو رکاوٹیں آ گئیں۔ ہم نے جب میں پاسپورٹ چیک کیا۔ ایک کیبن کے پاس گاڑی روک لی گئی۔ کھڑکی کھلی، بٹ نے ڈنمارک کی کرنسی دی۔ رکاوٹ ہٹی اور گاڑی سویڈن میں داخل ہوگئی۔ حیرانی سے زیادہ افسوس ہوا۔ سرحدیں یوں کھلی ہیں، کوئی روک ٹوک نہیں، کسی کا ڈر نہیں، جس کا جی چاہے، بے دھڑک داخل ہو جائے۔ یہ لاپروائی سمجھ میں نہیں آئی۔ ترغیب اور بٹ تو ڈنمارک کے باشندے ہیں لیکن ہم تو غیر، بڑی دور سے آئے ہیں، کیا تاثر لیں گے؟ ایک بار تو جی چاہا، اسی جگہ رہ جائیں پھر نیویارک والوں کا خیال آیا، ہمارے بغیر وہ کیا کریں گے؟ ہم نے بٹ سے داخلے کا ٹیکس پوچھا۔ وہ تکلف کرنے لگے۔ ہم نے کہا۔ ”یقین کریں، ہم ادا نہیں کریں گے، معلومات کے لیے بتا دیں۔“

”630 کراؤن۔“ وہ بولے۔

ہم حساب کرنے لگے، امریکی ڈالر میں منتقل کریں تو 125 بنتے ہیں جو بہت زیادہ ہیں لیکن اگر اس راستے سے داخل ہو کر سویڈن میں مستقل قیام طعام کرنا ہو تو کچھ زیادہ نہیں۔

سویڈن کی صاف ستھری سیاہ سڑک پر گاڑی دوڑ رہی تھی۔ دونوں طرف ہرے کھیت۔ بعض جگہ فصل کٹی ڈھیر کی شکل میں پڑی تھی۔ جب گاڑی ہم نہ چلا رہے ہوں تو ایک ہی دعا مانگتے ہیں۔ راستہ بھول جائیں۔ ڈرائیونگ کرنے والے کو باتوں میں الجھا



کر بھٹکنے کا موقع دیتے ہیں اور اکثر بامراد ہوتے ہیں۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا، بٹ ہماری باتوں میں ایک بورڈ پڑھنا بھول گئے۔ اس جگہ سے سڑک تبدیل کرنی تھی۔ اب واپسی کے لیے میلوں دور جانا تھا۔ آسمان پر بادل نظر آنے لگے تھے۔ انسانوں کے بغیر ہرے کھیت اور اکیلی سڑک دور تک پھیلی تھی۔ واپسی کا راستہ 15 میل کے بعد ملا۔

مال مو میں داخل ہوئے۔ اس شہر میں 25 ہزار افراد رہتے ہیں۔ پارک اور ساحلِ سمندر کے لیے مشہور ہے۔ آرٹ میوزیم اور گیلریاں بھی ہیں۔ مال مو میں کپڑے بنانے، ٹیکسٹائل اور چاکلیٹ کی فیکٹریاں ہیں۔ تجارت کا مرکز، اچھے وقت میں یہ ڈنمارک کا حصہ تھا بلکہ ناروے اور سویڈن دونوں ان کے قبضے میں تھے پھر لوگ جاگ اٹھے اور انہیں کوپن ہیگن تک رہنے دیا۔

شہر میں ایک اسکوائر پر پہنچے، یہ اسٹارٹوگیٹ کہلاتا ہے لیکن لوگ بہت کم تھے۔ آبادی بھی زیادہ نہیں۔

ایک ہوٹل کے سامنے سے گزرے، یہ سوائے تھا۔ 1914ء میں اس میں ایک یادگار نمائش ہوئی تھی۔ یہ بھی سنا کہ روس کے رہنما لینن نے 1917ء میں کھانا کھایا۔ کیا؟ یہ علم نہیں۔

ٹاؤن ہال کے سامنے میدان ویران تھا، شاید اس شہر کے لوگوں کو گھر سے نکلنے کی عادت نہ ہو۔ اچانک ایک خاتون نظر آئیں۔ ترغیب نے گاڑی رکوائی اور ان کی طرف تیزی سے بڑھے اپنے دوست کے علاقے کا پتا پوچھنے۔ انہوں نے جو زبان بولی، ترغیب نے پہلی بار سنی تھی اس لیے سوری کہہ کر گاڑی میں آ بیٹھے۔

مال مو میں ایک ہوٹل ہے لک آلا یو۔ زندہ کی طرح نظر آتا ہے۔ یہاں لوگ مشہور فنکاروں کا میک اپ کر کے آتے اور حاضرین کو لطف اندوز کرتے ہیں۔ ہم ترغیب کے دوست کے گھر دعوت سے لطف اندوز ہونے جا رہے تھے اس لیے ’زندہ کی طرح نظر آنے والے ہوٹل‘ کو تکلیف نہیں دی۔

ٹاؤن ہال کے پیچھے ایک پرانا چرچ ہے، چرچ سب پرانے ہوتے ہیں، سو سال سے کوئی نیا نہیں بنا۔ اب اسٹور اور اپارٹمنٹ بنتے ہیں۔ اس گرجا میں دو بار آگ لگی پھر درست کرلیا گیا۔ یورپ اور امریکہ میں عمارتیں لکڑی کی بنائی جاتی ہیں اس لیے یہ حادثہ اکثر ہوتا ہے۔ اپنے وہائٹ ہاؤس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا پھر سب ٹھیک ہوگیا۔

شہر میں ایک قلعہ ہے۔ اس کی بھی کہانی ہے کیونکہ ہمیں وہاں رہنا نہیں تھا اس لیے دلچسپی نہیں لی۔ ہمارے پاس بھی کہانیاں ہیں۔ ڈینش لوگوں نے توجہ نہیں دی۔ ہم نے ان کی بہت سی باتوں پر دھیان نہیں دیا، جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے۔

شہر کی سیر کرلی لیکن ترغیب کے دوست کا سراغ نہ ملا۔ ہم سوچنے لگے۔ ’کیا اچھا ہو، واپس چلیں اور کسی جگہ اپنی پسند کا کھانا نوش کریں۔‘

بٹ کا اصرار تھا، ریلوے اسٹیشن پہنچنا چاہیے۔ وہاں سے معلومات حاصل کی جائیں۔ ریلوے اسٹیشن کا راستہ معلوم کرنا بھی مسئلہ تھا۔ ریلوے اسٹیشن کو ٹھور کہتے ہیں۔ ہماری زبان میں ٹھور ٹھکانا مال مو سے آیا ہے۔

ایک سڑک پر گاڑی داخل کی، یہ ون وے تھا۔ ہم غلط سمت سے آئے تھے اس لیے بیک کی پھر ایک میدان دکھائی دیا۔ ایک طرف ہزاروں سائیکلیں پارک تھیں۔ ہم نے اتنی سائیکلیں ایک ساتھ نہیں دیکھی تھیں۔ یہ ریلوے اسٹیشن تھا۔

”یہاں سے اپنے دوست کو فون کرلو۔“ بٹ نے مشورہ دیا۔ ترغیب اور بٹ دونوں اپنے موبائل

فون گھر رکھ کر آئے تھے۔ سامنے ٹیلی فون بوتھ تھا۔ سوئیڈن کی کرنسی نہیں تھی۔ حیرت اس وقت ہوئی جب ترغیب نے بتایا۔ وہ اپنے دوست کا نمبر گھر بھول آئے ہیں۔ ہم مہمان تھے ورنہ کہتے۔ ''میاں' پھر گھر جہاں فون نمبر لکھا ہوا رکھا تھا' وہیں رہ جاتے۔''

فیصلہ کیا' واپس چلتے ہیں۔ ہم مہمان تھے اس لیے خاموش رہے۔ اچانک سامنے دو لڑکیاں حجاب پہنے نظر آئیں۔ ایک موبائل پر بات کر رہی تھی۔ ترغیب تڑپ کر گئے۔ انہیں جا کر سلام کیا۔ شاید اللہ کا واسطہ دیا۔ وہ عربی بولنے لگیں۔ ترغیب نے اشارے سے کہا۔ ''میری عربی سلام کرنے تک ہے۔'' پھر فون کی طرف اشارہ کیا۔ اپنے کان پر ہاتھ رکھا۔ ان کے دل میں رحم آ گیا۔ فون دے دیا۔ انہوں نے پہلے اپنے گھر ملایا' وہاں سے نمبر لے کر دوست کو اطلاع دی۔ ہم آ گئے ہیں' اسٹیشن پر کھڑے ہیں' آ کر لے جاؤ۔ عربوں نے ہمیشہ پاکستان کا ساتھ دیا ہے' آج بھی ایسا ہی ہوا۔ دیارِ غیر میں عربی لڑکیاں کام آئیں۔ ترغیب فون کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ اتنی دیر تک کہ بٹ نے گاڑی کا شیشہ کھول کر یاد دلایا۔ ''ہم لوگ یہاں ہیں۔''

ترغیب فاتحانہ انداز سے واپس آئے اور عربی لڑکیوں سے گفتگو کی تفصیل بتانے لگے جو ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ایک سفید رنگ کی گاڑی میں ترغیب کے دوست آ گئے۔ انہیں ہم نے دیکھا تھا لیکن نام یاد نہیں تھا۔ بٹ ان کی گاڑی کے پیچھے چلنے لگے۔ ذرا دور اپارٹمنٹ شروع ہو گئے۔ وہ ایک کمپلیکس میں رہتے تھے۔ اس کے احاطے میں گاڑی پارک کی۔ ان کے اپارٹمنٹ کی طرف چلے۔ وہاں لفٹ تھی۔ ایک وقت میں صرف تین افراد اوپر جا سکتے تھے۔ وہ صاحب نیچے رہ گئے اور کہا۔

''آپ لوگ پانچویں منزل پر جا کر لفٹ بھیج دیں۔''

لفٹ کا دروازہ بند ہوا تو ہم نے ترغیب سے کہا۔ ''اگر نہ بھیجیں؟''

''وہ زینے سے آ جائیں گے۔'' ترغیب نے جواب دیا۔

لفٹ نیچے گئی' انہیں لائی' اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلوایا' ان کی بیگم سامنے کھڑی تھیں' تعارف ہوا۔

ہم ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ ان صاحب نے فوراً ٹیلی وژن پر ہندوستان کی ایک پرانی فلم ''پتنگا'' لگا دی۔

ہم نے درخواست کی' فلم نہیں دیکھیں گے۔ انہوں نے ٹیلی وژن کی ایک چینل لگا دی۔ ہمارا قسمت دیکھیے' وہاں غدر کے زمانے کی فلم ''انمول گھڑی'' دکھائی جا رہی تھی۔ یہ گھڑی نور جہاں کے لیے انمول ہو سکتی ہے' ہمارے لیے نہیں تھی۔

''آپ سے ملنے اور گفتگو کرنے آئے ہیں۔ میڈم نور جہاں سے تو پھر ملاقات ہو جائے گی۔ ازراہِ عنایت' ٹیلی وژن بند کر دیں۔'' انہوں نے ٹیلی وژن بند کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ کے لیے سلاد بنا دوں؟''

''ہم سلاد نہیں کھاتے۔''

''ہم کھائیں گے۔'' وہ بولے اور جانے لگے۔

اب کیا کہتے' اگر موصوف کو خود ہی کھانا تھا تو یہ کام پہلے کر لیتے۔ وہ پھر آئے' لمحے بھر کو بیٹھے اور فرمایا۔

''میں آپ لوگوں کے لیے روٹی پکا دوں؟''

وہ توقع کر رہے ہوں گے' ہم کہیں گے۔ ''روٹی نہیں کھاتے۔''

اس بار ہم خاموش رہے' وہ چلے گئے۔



''ان کی بیگم کیا پکاتی ہیں؟''

''سالن۔'' ترغیب بولے۔

بٹ ان کے لیے عطر لے کر گئے تھے' تحفہ لے کر وہ بولے۔ ''ہم لوگ جب پاکستان آئے تھے تو والد نے سہگل برادرز کے ساتھ پرفیوم کا کام شروع کیا۔ اس میں نقصان ہوا تو ختم کر دیا۔'' ترغیب اصرار کر رہے تھے۔ ''ان سے گانا سنیں' سہگل کی آواز میں گاتے ہیں۔''

ہم سمجھے' سہگل برادرز کی آواز میں لیکن وہ ماضی کے گلوکار سہگل کی بات کر رہے تھے۔ ہم نے کبھی سہگل کو پسند نہیں کیا' جعلی ایڈیشن کا کیا کرتے۔ ایک بار ان صاحب نے بھی خواہش کی۔ ہم نے معذرت کر لی۔ ''جب سے ملکۂ ترنم کا انتقال ہوا ہے' ہم گانا نہیں سنتے۔''

وہ برا سا منہ بنا کر چلے گئے۔

کھانے کا بلاوا آیا' ہم سب میز کے گرد بیٹھ گئے۔ قورمے میں مصالحہ جات ہمارے اعزاز میں بڑھا دیئے گئے تھے' چکن تلی ہوئی تھی' سویٹ ڈش میں سویاں۔

ان صاحب نے بتایا۔ مال مو میں ایک ترکی نے دکان کھولی ہے دیسی مصالحے' سبزیاں' گوشت مناسب داموں مل جاتا ہے۔

کھانے کے دوران خبر ملی' ان کی بیگم ڈاکٹر ہیں۔

پوچھا۔ ''کہاں پریکٹس کرتی ہیں؟''

فرمایا۔ ''ہومیو پیتھک۔'' اس طریقۂ علاج کے لیے پڑھنے اور کسی جگہ کی ضرورت نہیں' جہاں جیسا چاہیں' مریض کا علاج شروع کر دیں۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی بیماریوں کا ذکر شروع کر دیا۔ اللہ نے اس سلسلے میں انہیں خود کفیل کر دیا ہے' کون سی بیماری ہے جو لاحق نہیں' بعض جن کا نام سن کر ڈر لگتا ہے' اس کا ذکر بھی سنا۔ کھانے کے دوران اس گفتگو نے دو سے ایک روٹی کھانے تک رکھا۔ قورمے کا ذائقہ بھی جاتا رہا' سویٹ ڈش پھیکی محسوس ہوئی۔

''بھابھی نواب خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔'' ترغیب بولے۔ ہم خوش ہو گئے۔ پاکستان کے شہر کراچی کے علاقے ناظم آباد میں نواب اینڈ سنز سب سے بڑے ٹیلر ہیں۔ مہینوں کے انتظار کے بعد کپڑے تیار کر کے دیتے ہیں۔

''آپ نواب خاندان سے ہیں' بے حد خوشی ہوئی۔'' ہم نے کہا۔ اُن کا چہرہ گل نار ہو گیا۔

شہر میں سب سے اچھے کپڑے نواب سنز ہی تیار کرتے ہیں۔ ہم نے اپنا جملہ پورا کیا۔

''یہ نواب سنز ٹیلر والوں سے نہیں' اصلی نواب خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جن کے پاس جاگیریں اور خطاب ہوتے ہیں۔'' ترغیب سمجھانے لگے۔

''معاف کیجیے گا' ہم سمجھے.....''

''بھابھی! وہ قصہ سنائیں' ہیروں کی چوری کا۔'' وہ بے حد بھولی ہیں' سنانے لگیں۔ ''ان کے والد کے پاس دو ہیرے تھے۔'' اپنی انگشتِ شہادت دکھا کر سائز بتانے لگیں۔ ترغیب نے کہا۔ ''بھابھی! اس سے تو بڑے تھے۔''

فرمایا۔ ''جی.....!''

ترغیب کی بھابھی نواب خاندان کی چشم و چراغ دو لمبے قیمتی ہیروں کی مالکہ کراچی کے علاقے ڈرگ روڈ میں رہتی تھیں۔ ایک دن ڈاکو آئے' ہیرے چھین کر لے گئے' جاتے وقت والد کو زخمی بھی کر گئے۔

''پولیس میں رپورٹ درج کرائی تھی؟'' بٹ نے پوچھا۔

''جی بھائی' کچھ نہیں ہوا۔'' وہ بولیں۔

''ہیروں کے جانے کا افسوس ہے' یہ کس سال

کی بات ہے؟''

انہوں نے جو سن بتایا' اُن دنوں پاکستان کے صدر ایوب خان تھے' ہم اُن کا نمک کھا رہے تھے اس لیے ایوب خان پر شک کرنے لگے۔ ہمیں یاد ہے' برا بھلا بھی کہا' خیر' وہ کب اقتدار میں ہیں جو زن بچہ کو لہو میں پلوا دیں گے۔

ترغیب نے موقع غنیمت جانا اور حیران کرنے کے لیے ہیروں کا حجم اور بڑھا دیا' تب یاد آیا کہ اس سائز کا ایک ہیرا تو برطانیہ میں دیکھا تھا۔

''کس کے پاس؟'' ترغیب نے بے چینی سے پوچھا۔

''لندن ٹاور برج میں تاجِ برطانیہ میں لگا ہے جن لوگوں نے اسے ہتھایا' نام کوہِ نور رکھ دیا ہے۔''

بھابھی کے چہرے سے خفگی جھلکنے لگی حالانکہ ہم سنجیدہ تھے۔ محفل رنگ کھونے لگی اس لیے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اس بار صاحبِ خانہ نے چائے بنائی۔ بیگم ہیروں کے غم میں نڈھال ہو گئی تھیں۔ سچ ہے جو دکھی ہوتا ہے' درد وہی محسوس کرتا ہے۔

ترغیب نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

''یہ سہگل کی آواز میں گاتے ہیں' سن لیں۔''

ہم نے ان کے کان میں کہا۔ ''پھر کہا تو ہیروں کا ذکر چھیڑ دیں گے۔''

چائے کے بعد ہم نے اجازت مانگی جو فوراً مل گئی۔ اچھا کھانا اور ذکرِ ہیروں کا تھا۔ خمار ہو گیا۔

ہم جب دروازے کے پاس جوتے پہن رہے تھے' وہ ماؤتھ آرگن لے آئے۔ اس سے پہلے کہ بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچتے' انہوں نے۔

اڑتی پھروں' گاتی پھروں نیل گگن میں
آج میں آزاد ہوں دنیا کے گگن میں

کی دھن بجائی۔ ہم کیا کرتے' چپ رہے۔ ایک گانا ختم ہوا تو انہوں نے اُسی سے ملا کر۔

آوارہ ہوں یا گردش میں ہوں' آسمان کا تارا ہوں

کی دھن بجانی شروع کر دی۔ ہم نے جلدی سے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔

•.....•.....•

برکت پیا..... سب کچھ کیا

پاکستان ٹیلی وژن سے اک ڈرامہ سیریل ''پرچی'' دکھائی گئی۔ اس میں خالد عباس ڈار نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک جملہ بار بار دہرائے جاتا۔ ''حامد پیا' کچھ نہ کیا'' ہم اسے تکیۂ کلام سمجھے۔ کچھ عرصے بعد ٹیلی وژن کی خبروں میں دیکھا' جلوس جا رہا ہے' بہت سے لوگ ایک آدمی کو ہار پہنائے کاندھے پر بٹھا کر نعرے لگا رہے ہیں۔ ''حامد پیا' زندہ باد۔'' یہ پیپلز پارٹی کے رہنما جیل سے رہا ہو کر آئے تھے اور کارکنوں پر سواری کر رہے تھے۔ پیا کا نام فلموں میں پری چہرہ ہیروئن اور گانے میں سنا۔ ان کی بے چینی' بے قراری دیکھ کر جی چاہتا' کاش' ہم پیا ہوتے' کسی کے دل کی دھڑکن سنبھال لیتے۔ جھیل جیسی آنکھوں کا سکون بن جاتے۔ ایسا کب ہوا' کوپن ہیگن میں آتے ہی جن افراد سے ملاقات ہوئی' ان میں برکت پیا بھی شامل تھے۔ ساحل ریسٹورنٹ میں بزمِ ادب کا جلسہ تھا' وہ ڈھیروں خوش رنگ پھول لائے۔

دوسرے دن ترغیب نے اطلاع دی' برکت پیا نے ہمارے لیے ایک شام کا بندوبست کیا ہے۔ کوپن ہیگن میں لاہور ویلفیئر ایسوسی ایشن قائم کی ہے۔ کھانے میں نہاری' پائے اور شہروں میں لاہور ہماری کمزوری ہے۔

خیال تھا' جب موقع ملا' لاہور جا بسیں گے۔ اب بھی موقع نہیں ملا ہے۔ لاہور والے تسلی رکھیں' ضرور آئیں گے۔ اس کے میلے ٹھیلے دیکھیں' کھانے



وانے کھائیں' گل اور بلبل سے گفتگو کریں۔ ترغیب کے صاحب زادے ہمیں لے کر پہنچے۔ کئی لاہوری ہمارا باہر ہی انتظار کر رہے تھے۔ برکت پیا بھی ہاتھوں میں پھول لے کر مسکراہٹوں کی کلیاں بکھیرتے آ گئے۔ اپنے دوستوں سے تعارف کرانے لگے۔ یہ لوگ مل کر بیٹھتے' دکھ سکھ میں شریک ہوتے اور لاہور کو یاد کرتے ہیں۔ کوپن ہیگن میں لاہور کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔

کاری ڈور میں بھی کئی جان پہچان والے مل گئے۔ آصف رضا' ڈاکٹر اقبال اور اسلم مہر۔

ہال میں ہر طرف لاہور ویلفیئر ایسوسی ایشن کے بینر لگے تھے۔ سامنے اسٹیج تھا۔ حیرت یہ ہوئی کہ خواتین بھی نظر آئیں۔ ان کی تعداد نو تھی۔ لاہور والے زندہ دل ہیں' خواتین بھی بھرپور حصہ لیتی ہیں۔

پہلے کھانا ہوا' قورمہ بریانی' اس کے ساتھ تکلف۔ ہم نے پوچھا۔ ''آپ لاہور والے ہیں۔ یہ لکھنؤ والا تکلف کیوں کر رہے ہیں؟'' کھانے کے بعد مٹھائی لائی گئی۔ پاکستان سے باہر مٹھائی کا مزہ ہی جاتا رہا۔ ہم نے تکلفاً چکھ کر دیکھی' بے حد لذیذ تھی۔ ہمیں بتایا گیا۔ ''مٹھائی بنانے والے گوجرانوالہ سے بلوائے گئے ہیں۔''

''ہمارے لیے؟''

''کوپن ہیگن والوں کے لیے۔ آپ کے لیے آج خصوصیت سے قلاقند بنایا ہے۔'' ہم نے اُس وقت برکت پیا سے کہا۔

''جب ہم واپس جانے لگیں گے' یہ مٹھائی ساتھ کر دیں۔''

تقریب کے بعد انہوں نے ایک ڈبا ہماری گاڑی میں رکھوا دیا۔

ہم نے کہا۔ ''شکریہ لیکن ہمارا مطلب کوپن ہیگن سے نیویارک جانے سے تھا۔''

''اُس وقت بھی مٹھائی پیش کریں گے۔''

برکت پیا نے وعدہ کیا۔ تقریب کا آغاز ہوا۔ لاہور کی باتیں ہوئیں۔ ذرا دیر میں ہم قلعہ گوجر سنگھ' بھاٹی' لاہوری' مزنگ چنگی اور اچھرہ پہنچ گئے۔ لاہور کے اتنے لوگ کوپن ہیگن میں لاہور کے موسم چھپا گئے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب جو انجمن کے نائب صدر تھے' استاد دامن کا کلام سنانے لگے۔ ہم اپنی نوجوانی کے دنوں میں اتر گئے۔ برستی بارش میں میورو ڈ پہنچ گئے' یہاں ہم رہتے تھے' خواب دیکھتے تھے' خوش تھے۔ اُس شام وہ سارے صحت مند' اچھے' سنہرے' چمکیلے دن لوٹ آئے۔ کہتے ہیں' اگر سارے دیوتا بھی مل کر کوشش کریں تو ماضی واپس نہیں لا سکتے لیکن لاہوریوں نے یہ کام کر دکھایا۔ ہم بسنتی بارشوں میں بھیگتے اور گلِ مہر کے پھولوں کے درمیان سے گزرتے اُس پری وش کے کوچے کی طرف چلے گئے جو ہماری پلکوں کے نیچے ہمیشہ سے رہتی ہے۔ کوپن ہیگن کی گھڑیاں آگے بڑھتی رہیں اور ہم ماضی کی سیڑھیاں اترتے رہے پھر یہ سب خواب خیال ہو گیا۔

تقریب کے دوسرے حصے میں پرویز اختر نے غزلیں چھیڑ دیں' اس آواز میں استاد امانت علی کی مٹھاس محسوس ہوئی۔ غزل کہنا اور گانا دونوں کمال کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ایک اچھی آواز اور گائیکی کا انداز غزل کو زندگی بخشتا ہے۔ پرویز کی پیاری بیٹی ماریہ نے بھی کئی غزلیں سنائیں۔ یہ ابھی اسکول میں پڑھتی ہے لیکن کیا خوب آواز پائی پھر باپ کی تربیت' ہر سُخن پر جادو ہو گیا۔ سنا ہے' پرویز موسیقی سے علاج بھی کرتے ہیں۔

ایک صاحب نے کان میں کہا۔ ''پہلے یہ گانا سنا کر پیار کرتے ہیں پھر غزل سنا کر اچھا کر دیتے

ہیں۔"

ہم نے باآوازِ بلند کہا۔"غزلیں ہی سنایئے گا۔"

یہ محفل اُس وقت تک جاری رہی جب تک رات نے نئے دن کی نوید نہیں دی۔ پہلے ہال پھر کاری ڈور' اس کے بعد باہر کھڑے ہو کر باتیں ہوتی رہیں۔ کسی کا جی نہ چاہتا تھا' اس محفل سے جائے۔ نہ ہمارا نہ ان میں سے کسی کا۔ اگر ترغیب کے صاحب زادے کو صبح کالج نہ جانا ہوتا تو ہم اُس وقت بھی وہیں کھڑے لاہور کی باتیں کر رہے ہوتے۔

لاہور کے نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی ہندوستان کے پہلے عوامی ترقی پسند شاعر ہیں' ان کی نظمیں "جب لاد چلے گا بنجارہ"..... "سو ہے وہ بھی آدمی"..... "خود ناچتی ہیں' سب کو نچاتی ہیں روٹیاں" اُردو کے ہر طالب علم کو یاد ہیں۔

انہیں آگرے سے پیار اور تاج محل سے عشق تھا۔ اس کے نزدیک ہی رہتے' نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ اگر ہمارا عقیدہ آواگون پر ہوتا' وثوق سے کہہ سکتے تھے' مغل بادشاہ شاہ جہاں نے دوسرا جنم نظیر اکبر آبادی کی شکل میں لیا تھا۔ وہ بھی تاج محل کا عاشق تھا۔ نظیر اکبر آبادی بھی دیوانے۔

ایک بار حیدر آباد دکن کے نواب نے نظیر اکبر آبادی کا وظیفہ مقرر کیا اور بلایا۔ یہ آمادہ ہو گئے' گھوڑے پر بیٹھ کر نکلے تو خادم سے پوچھا۔

"میاں' وہاں مینار ہیں؟"

"حضور' چار مینار ہیں۔" خادم نے جواب دیا۔

"دریا ہے؟"

"جی حضور' دریا موسیٰ بہتا ہے۔"

"تاج محل بھی ہے؟" اس سوال پر خادم نے انکار کیا۔ یہ گھوڑے سے کودے اور کہا۔"جہاں تاج محل نہیں' ہم کیوں جائیں؟"

ان دنوں تاج محل کے سامنے تاج گنج میں سوتے ہیں۔

برکت پیا لاہور کے عشق میں نظیر اکبر آبادی ہیں۔

یوں تو ہر شخص کا ایک آگرہ ہوتا ہے جس کی گلیاں' کوچے بام و در اس کی سانسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ ان سے جدا ہونا ایک قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ یہ بات وہ جان سکتے ہیں جو آزادی کے بعد اپنے کھیت کھلیان' باغ' آنگن' گلیاں اور اس زمین پر اپنے پیاروں کو سوتا چھوڑ آئے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی نے سچ کہا تھا۔"خود ناچتی ہیں' سب کو نچاتی ہیں روٹیاں" برکت پیا کو اس روٹی نے لاہور کی گلیوں سے نکال کر کوپن ہیگن کے برف سے ڈھکے بازاروں میں بھیج دیا۔

برکت پیا اپنی زمین' روایت سے پیار کرتے ہیں اس لیے کوپن ہیگن آئے تو بہت سا لاہور ساتھ لے آئے۔ جب کم ہونے لگتا ہے' لاہور جا کر سمیٹ لاتے ہیں۔ خود بھی اسے سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی موقع دیتے ہیں۔

اسلامیہ کالج سے گریجویشن کیا۔ سرگرم طالب علم تھے' نوجوان تھے' سیاست میں بھی حصہ لیا' اس میں کامیاب ہوئے۔ لاہور میں رہ جاتے تو مشیر وزیر بن جاتے۔ دانا پانی کوپن ہیگن میں اترا تھا۔ اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ایک بار شعر سنانے لگے۔ ہم نے سہم کر پوچھا۔

"اپنے ہی ہیں؟"

مسکرا کر بولے۔"بابا فریدؒ کے۔"

ہم نے بے دھڑک ہو کر کہا۔"پھر سنایئے' لطف آ رہا ہے۔" زندگی سے بہت تجربہ حاصل کیا ہے۔ سمجھ داری کی باتیں کرتے ہیں' ایک شام آئے



کوپن ہیگن کی سیر کو لے گئے۔ ساحلِ سمندر پہنچے' ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی اس لیے گاڑی سے نہیں اترے۔ ایک جہاز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔"یہ جہاز ہے۔"

ہم نے کوپن ہیگن میں جہاز پہلی بار دیکھا تھا۔ حیران ہوئے۔ انہوں نے بتایا۔"یہ ناروے کے شہر اوسلو جاتا ہے۔"

وہاں ہمارے شناسا اور ممتاز شاعر جمشید مسرور رہتے ہیں' اُن سے ملنے جانا چاہتے تھے۔ ہم نے کرایہ پوچھا۔ وہ معلوم کرنے گاڑی سے اترنے لگے۔ ہم نے روک دیا۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟ جب جانے لگیں گے' پوچھ لیں گے۔"

برکت پیا نے کہا۔"آیئے' کچھ کھاتے ہیں۔"

ہم نے چاروں طرف دیکھا' وہاں ریت اور سمندر کے سوا کچھ نہ تھا۔

"ایک پاکستانی ہوٹل کا پیزا کھلاتے ہیں۔" وہ بولے۔

ساحل سے شہر میں داخل ہوئے۔ گاڑی پارک کر کے جس ہوٹل میں پہنچے' یہ ترغیب کے علاقے آم مامیں تھا۔ کاؤنٹر پر جو صاحب کھڑے تھے' برکت پیا کو دیکھ کر پنجابی بولنے لگے۔ ہم بھی اُسی رنگ میں ڈوب گئے۔ تعارف ہوا' فیصل آباد کے ہیں۔ برسوں سے یہاں رہتے ہیں لیکن اپنے شہر کے نامی گرامی گھنٹا گھر نہیں بھولے۔

ہم بھی یاد کرنے لگے۔

ایک میز کے گرد بیٹھے' گرم اور خوش رنگ خوشبو اڑاتا پیزا آ گیا۔ ٹماٹو کیچپ اور سرخ کٹی ہوئی مرچیں ڈال کر کھایا' مزہ آ گیا۔

ایک لڑکی پیزا لینے آئی۔ برکت پیا کاؤنٹر پر تھے۔ لڑکی کی گود میں کتا تھا۔ پیا اس سے بات کرنے لگے۔ کتے کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک بار تو محسوس ہوا' یہ کتا گود میں لے لیں گے۔

واپس آئے تو ہم نے پوچھا۔

"آپ کی توجہ کتے پر زیادہ تھی؟"

"کتا اعلیٰ نسل کا ہے' اس کی قیمت 6 ہزار کراون ہے۔"

"اس کا مطلب' ایک ہزار امریکی ڈالر۔"

"جی جناب۔" وہ بولے۔

"اتنی رقم میں تو لڑکی بھی مہنگی ہے۔"

برکت پیا ہنسنے لگے' شاید ہماری نادانی پر۔

"یہاں انسان سے زیادہ کتے کی قدر و قیمت ہے' یہی تو وفادار رہ گیا ہے۔"

"سچ کہتے ہیں' میاں بیوی' کتا ایک مکمل خاندان ہوتا ہے۔ اکیلا کتا بھی خاندان کہلاتا ہے۔"

برکت پیا ایک محنتی' ایماندار انسان ہیں' ہم ان کے ساتھ ہوتے تو اپنا کام کرتے جاتے۔ ان کے پاس ایک ویگن ہے۔ دن میں معذوروں کو کھانا' شام کو گیس سلنڈر تقسیم کرتے۔ شعر سناتے جاتے ہیں۔ اچانک کسی دکان کے سامنے رک کر ویگن کے پیچھے سے بھرا ہوا سلنڈر نکالتے لڑھکا کر لے جاتے اور ذرا دیر میں خالی واپس لے آتے ہیں' بعض وقت شکوہ بھی کرتے ہیں۔ لوگ ادائیگی میں ٹالتے ہیں' ایسا تو سب جگہ ہوتا ہے۔

برکت پیا کی ایک عجیب عادت ہے' سگریٹ ہاتھ سے الگ نہیں کرتے۔ جس دن سردی ہوتی' گاڑی کے شیشے بند ہوتے۔ ہمیں دھویں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا۔ گاڑی کا شیشہ اتارتے ہیں تو سردی اور اندر دھواں سانس روکنے کی مشق ان دنوں بہت کی اور 30 سیکنڈ تک کامیاب ہوئے۔ اس سے زیادہ کی ہمت نہیں ہوئی۔ سنا ہے' اس سے زیادہ جو سانس روکتا ہے پھر وہ خود بھی رک جاتا ہے۔

برکت پیا اگر سگریٹ نہ پیئیں تو وہ کمپنیاں دیوالیہ اور لوگ بے روزگار ہو جائیں جو بڑے اہتمام سے تمباکو کاغذ میں لپیٹ کر پیکٹ میں بھر کر بازار میں لاتی ہیں۔

برکت پیا سے ہر وقت رابطہ ہو سکتا ہے۔ ان کے گھر فون، ساتھ موبائل، ویگن میں فون، تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ فون سنتے بھی ہیں، وعدے کے پابند ہیں۔ اگر کہا۔ ''6 بجے آؤں گا۔'' تو پونے چھ بجے آ گئے۔

جب لاہور کی یاد ستاتی، انہیں فون کر دیتے پھر ان کے آتے ہی لاہور آ جاتا اور ہم اس کے موسموں میں ڈوب جاتے۔

اک اجاڑ قلعہ

ایک قلعہ دیکھنے جا رہے تھے۔

ہم بادشاہ نہیں رہے نہ کبھی سپاہی تھے، اس کے باوجود بھی قلعہ سے ایک رشتہ ہے، پاکستان کے شہر حیدر آباد پہنچے تو قیام قلعہ میں ہوا۔ یہ غلام شاہ کلہوڑا کا بنایا ہوا ہے۔ سنا ہے، وہ عباسی خاندان سے تھے۔ اس مناسبت سے قلعہ میں رہنا ہمارا حق تھا۔ یہاں خوبصورت مکانات اور ہر طرف کھلا میدان تھا۔ رات آتے ہی ویرانی چھا جاتی۔ یہاں نانی اماں ہندوستان سے آئیں تو ایک رات چونک کر بولیں۔

''ارے، یہ الو کی آواز ہے؟'' ہم حیران ہوئے۔ اس کا نام بہت سنا تھا، کبھی دیکھا نہیں تھا۔ تلاش کیا، الو قلعہ کی دیوار پر بیٹھا ہوک رہا تھا۔ نانی اماں نے کہا۔ دیکھنا، قلعہ آباد ہو جائے گا۔ اگر یہ ویرانے میں بیٹھے تو آبادی اور بسے بسائے گھر پر بیٹھے تو ویران ہو جاتا ہے۔'' بزرگ سچ کہتے ہیں، ایسا ہی ہوا۔ قلعے میں ہندوستان سے آنے والے ہزاروں لوگوں نے ہر طرف کچے مکان بنا لیے اور پھر ہمارا گھر ویران ہو گیا۔ چند سال میں کوئی بھی نہیں رہا، یہاں تک کہ ہم بھی وہاں سے نکل لیے تاکہ الو سے منسوب روایات کا بھرم رہے۔

ہم جس ملک میں بھی گئے، لوگوں نے قلعے دکھائے۔ بعض جگہ تو کئی ایک کی سیر کی۔ یہ سب ہمارا ہی کیا دھرا تھا۔ ہم مقامات دیکھ کر اس حد تک تعریف کر دیتے ہیں کہ سننے والا سچ سمجھ کر خوش کرنے کو وہی دکھاتا ہے جس سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

کوپن ہیگن کے قلعے کا دیدار بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ ترغیب نے ذکر کیا اور حسبِ عادت ہم نے تڑپ کر کہا۔ ''یہاں قلعے ہوتے ہیں۔''

پروگرام بن گیا اور گاڑی اسی سمت رواں تھی۔ ترغیب کا چھوٹا بیٹا اسلم ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ دونوں طرف سبز کھیت گزر رہے تھے۔

ہمارے انتظار میں قلعہ کراون برگ تھا۔ ڈینش میں قلعے کو سلوٹ کہتے ہیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ پانچ سو سال سے زیادہ پرانا ہے۔ چھ سو سال پہلے یورپ میں جگہ جگہ بادشاہت تھی، یہ تو جمہوریت نے سارا کام خراب کر دیا ورنہ بادشاہ ہوتے تو ہم بھی جان کی امان مانگ کر ایک دو قلعے کے مالک بن جاتے۔ سنا ہے، ان دنوں ہماری حکومت ہے۔ ہم اقتدار کے مالک ہیں لیکن جس کا جو جی چاہتا ہے، وہ کر گزرتا ہے۔ صلاح مشورہ نہیں کرتا۔ ہم بھی خاموش رہتے ہیں اس لیے جیل اور جلاوطنی سے محفوظ ہیں۔

اسد بتا رہا تھا۔ ''کوپن ہیگن فلاحی ریاست ہے، سب کچھ حکومت کرتی ہے۔ ہمیں تعجب نہیں ہوا۔ ہمارا ملک بھی فلاحی ریاست ہے۔ پانچ وقت مؤذن ''حیی علی الفلاح'' کی صدائیں لگاتا ہے۔ ہم توجہ نہیں کرتے۔ یورپ والوں نے اس طرف رخ کیا۔ عوام کو خوش کیا۔ ہم ان کے شہری نہیں اس لیے فلاح اور بہبود سے کیا واسطہ۔



ایک خوبصورت شہر میں داخل ہوئے۔ سبزہ، پھول، صاف ستھرے مکانات، اکا دکا لوگ نظر آئے، وہ بھی نوک پلک سے درست، شاید ہمیں متاثر کرنے کا انتظام تھا۔

قلعہ ایسا ہی تھا جیسا ہونا چاہیے۔ اس کے تین طرف گہری کھائی بنی تھی جس میں پانی بھر دیا جاتا تھا دشمن سے بچنے کے لیے۔ ایک روایت یہ بھی کہ قیدیوں کو بھاگنے سے روکنے کے لیے یہ ترکیب کی گئی تھی۔ اس وقت نہ دشمن تھا نہ قیدی، صرف سیاح تھے۔ قلعہ دیکھنے ہزاروں مقامی اور غیر مقامی آتے ہیں۔

چھ سو سال پہلے ایرک بادشاہ نے 45 قلعے بنائے۔ اسے قلعہ بنانے والے ماہر انجینئر مل گئے ہوں گے۔ ہم نے یہ سنا تو غش کھانے لگے۔ کیا 45 قلعے دیکھنے ہوں گے؟ اس لیے احتیاط کی کہ دورانِ سیر کسی چیز کی تعریف نہ کریں۔

قلعے کی کھائی کے اوپر لکڑی کا پل بنا تھا۔ اس سے گاڑی اندر جا سکتی تھی اس لیے گاڑی سے داخل ہوئے۔ دائیں طرف ایک ریسٹورنٹ تھا، کرسیاں گھاس پر رکھی تھیں۔ ہم ان پر بیٹھے چہرے دیکھنے لگے۔ اس کے آگے پتھر کا راستہ اور چند کمرے۔ ایک سے ٹکٹ لیے جا سکتے تھے۔ اسد نے پوچھا۔ ''ہم گاڑی لا سکتے ہیں؟'' خوش قسمتی سے اجازت مل گئی۔ اوپر جانے کے لیے زیادہ چڑھائی تھی، شاید دشمنوں کو تھکانے کے لیے۔

اس قلعے کا مقصد یہ تھا کہ سمندر میں ملاحوں کے جہازوں کی نگہداشت کی جا سکے حالانکہ اس کے باوجود بھی بحری جہازوں کو لوٹنے کی وارداتیں عام تھیں۔

(یہ دلچسپ سفرنامہ ابھی جاری ہے
بقیہ آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔)

# غزل

ٹھہرا ہوا لمحہ بھی تو منظر کے لیے ہے
دریا کی روانی تو سمندر کے لیے ہے

وہ خواب کی صورت تھا اسے خواب ہی سمجھو
وہ خواب کسی درد کے پتھر کے لیے ہے

تم مجھ سے بچھڑنے کا اگر سوچ رہے ہو
کچھ ہجر کا موسم بھی دسمبر کے لیے ہے

ہر شخص کے ہونٹوں پہ دعا ڈھونڈ رہے ہو
یہ ایک ہی نسبت تو قلندر کے لیے ہے

اکبر میں کسی شخص کو بھولوں بھی تو کیسے؟
یہ وقف مصیبت بھی تو اندر کے لیے ہے

اکبر نواز حسن

نگہت اعظمی

# جب تھک کے سو جاتی ہے ماں

حامد علی سید کا خیال

زبان رکھتے ہیں پتھر بھی چٹانیں بولتی ہیں
جو چہروں پر لکھی ہیں داستانیں بولتی ہیں

**ہماری معتبر لکھاری کا اپنی مرحوم ماں کو لفظوں کا خراجِ عقیدت**

میرے ہاتھ میں قلم ہے، میرے سامنے کاغذ ہے اور میری نظروں میں ایک تصویر پھر رہی ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے، یہ تصویر مجسم ہو کر میرے سامنے آجائے اور میں ہاتھ تھام کر کہوں۔ ''اماں.....!'' اور اماں مجھے دیکھ کر دھیمے سے مسکرا دیں لیکن میں جانتی ہوں کہ اَب میری یہ خواہش کبھی بھی پوری نہیں ہوگی، میں کبھی اُن کی صورت نہیں دیکھ سکوں گی، چاہے روتے روتے میری آنکھیں سفید ہو جائیں یا چیختے چیختے میری آواز بند ہو جائے۔ اماں اب کبھی واپس نہیں آئیں گی کیونکہ وہ اُس دنیا میں جا چکی ہیں جہاں کے رہنے والوں کو ہماری دنیا اچھی نہیں لگتی!!

اماں کے بچھڑنے کا مجھے اتنا خوف تھا کہ جب سے ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا، میں ہر وقت سائے کی طرح اُن کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ جی چاہتا تھا، اماں کو ایسی جگہ چھپا دوں جہاں موت کا سایہ بھی اُن پر نہ پڑ سکے۔ شاید دنیا کے ہر بچے کو اپنی ماں خوبصورت لگتی ہو، میں بھی جب چھوٹی تھی اور اَب بھی یہی سمجھتی ہوں کہ میری اماں دنیا کی سب سے حسین خاتون تھیں، ویسے یہ حقیقت بھی ہے، میری ماں بے حد حسین تھیں، اُن کے حسن میں ایک ایسی تمکنت اور وقار جھلکتا تھا کہ لوگ خود بخود اُن کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ تو اس عمر میں بھی بیماری کے باوجود اتنی خوبصورت لگتی تھیں کہ ہر فرد اُن کی تعریف کرتا تھا۔ اُن کے آخری دنوں میں تو اُن کے چہرے پر ایسی روشنی، نور اور ایسی معصومیت تھی کہ جیسے انہوں نے زندگی میں کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو!!

میں نے زندگی میں شاید ایک آدھ بار ہی انہیں سجے سنورے دیکھا ہو۔ ظاہر ہے، جس عورت کے نو بچے ہوں اور اُن کے والدین ہندوستان میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آئے ہوں، جسے میکے اور سسرال سے کوئی سپورٹ نہ ہو..... کیونکہ وہ تو خود ہی اپنے قدم جمانے کی کوششوں میں مصروف تھے تو اِن بچوں کو گھر، لباس، غذا اور اچھی تعلیم دینے کے لیے وہ جس طرح محنت کرتی تھیں، اُن کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ اپنے آپ پر توجہ دیتیں۔

مجھے یاد نہیں کہ اماں کبھی بازار سے اپنے لیے کوئی چیز خرید کر لائی ہوں، وہ جب بازار جاتیں یا تو ہم بچوں کے لیے خریداری کرتیں یا اپنے گھر کے لیے..... اور پھر جب سے ہم بیٹیاں بڑی ہوئیں، انہیں کوئی گفٹ بھی دیتا تو وہ بھی ہمارے جہیز کے لیے رکھ دیتی تھیں۔

اماں بڑی محنتی اور جفاکش تھیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی انہیں فارغ بیٹھے نہیں دیکھا، دوسری طرف میرے ابا کا کام بھی کچھ اس طرح کا تھا کہ وہ صبح سے رات تک مصروف رہتے تھے۔ ابا صحافی تھے اور بیک وقت کئی جگہ کام کرتے تھے، سو اماں ہی ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ کتنی ہی مصروف ہوں، کتنی ہی پریشان ہوں، کبھی غصہ نہیں کرتی تھیں..... میں نے اپنی زندگی میں انہیں کسی کو جھڑکتے یا کسی سے تلخ لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے کبھی ہم اولادوں کو گھُر کا تک نہیں تھا ہاں البتہ کوئی بات بری لگتی تھی تو خاموشی اختیار کر لیتی تھیں اور ہم اُن کے چہرے کو دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ اماں ناراض ہیں!!

اماں کے ہاتھ میں اتنا ہنر تھا کہ انہوں نے نہ صرف ہم چھ بہنوں کے جہیز کی ایک ایک چیز اپنے ہاتھ سے تیار کی بلکہ ہماری شادیوں کے بعد وہ بڑے بڑے ہوٹلوں میں اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں (جن میں کڑھے ہوئے سوٹ، بیڈ کورز، کروشیے (chrochet) کی چیزیں شامل ہوتیں۔) کی exhibition کرتی تھیں اور جس زمانے میں گھروں میں بان کے پلنگ اور بید کی کرسیاں ہوتی تھیں۔ وہ پلنگ اور کرسیاں خود بُنتی تھیں۔ وہ اتنی ذہین تھیں کہ جس کام کو ایک دفعہ کسی کو کرتے ہوئے دیکھ لیتیں، فوراً ہی سیکھ جاتیں اور سیکھنے کا شوق تو انہیں اس قدر تھا کہ اس عمر میں بھی وہ کسی سے کوئی کام سیکھنے میں عار محسوس نہیں کرتی تھیں۔ ان کاموں کے علاوہ وہ رسالے اور ناول پڑھنے کی بے حد شوقین تھیں۔ پڑھنے لکھنے کا یہ شوق مجھے انہی کو دیکھ کر ہوا تھا۔

اماں ملنسار بھی بہت تھیں کہ ہر جگہ، ہر ایک کی خوشی اور غمی میں شریک رہتی تھیں۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ آج عورتیں گھر کے تھوڑے سے کام کر کے تھک جاتی ہیں مگر اماں تو گھر کے اتنے کاموں کے باوجود دوسروں کے کاموں کے لیے بھی پیش پیش رہتی تھیں۔ کسی کو نومولود بچے کی چھٹی کا سامان بنوانا ہوتا تو وہ اماں کے پاس آتا، اماں بے حد خوشی اور لگن سے چھٹی کا سامان تیار کرتیں۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہوتی تو اماں اُس کے جہیز کے لیے بازاروں کے چکر لگا رہی ہوتیں۔ کسی کے ساتھ اسپتال میں رہنا ہے تو اماں اُس کے ہمراہ ہیں۔ محلے میں کہیں جھگڑا ہو جائے تو صلح صفائی کرانے میں اماں آگے ہوتیں۔ وہ ہم سب بچوں کے کورس پر خود ہی جلد چڑھاتی تھیں۔

ہمارے گھر میں ۲۷ رجب المرجب کی نیاز بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوتی تھی جس میں سارے خاندان والے، دوست احباب، محلے والے مدعو ہوتے تھے اور نیاز کا سارا کھانا اماں خود پکاتی تھیں۔ میں

نے خود انہیں بیس کلو شکر قند کی کھیر اور سولہ کلو کی پوریاں تلتے ہوئے دیکھا ہے۔ آج کل کے زمانے میں شاید کسی کو اس بات کا یقین نہ آئے لیکن میں نے اماں کو اپنی آنکھوں سے یہ سب کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

خاندان میں سب سے پہلے ہمارا گھر بنا تھا۔ یہ گھر اماں نے اُس زمانے میں بنوایا تھا جب ناظم آباد سے پاپوش نگر تک کھلا میدان ہوتا تھا اور راتوں کو گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

اماں ایک کمرا، کچن اور واش روم بنوا کر اس گھر میں آ گئی تھیں اور پھر پورا گھر اپنے سامنے مزدوروں سے بنوایا تھا۔ اس گھر میں اماں نے زندگی کے بے حد خوشگوار اور بے حد تکلیف دہ دن گزارے۔

ایک سال پہلے انہیں پیٹ میں تکلیف ہوئی تھی، خون اور پیپ آنے لگی تو ڈاکٹر کو دکھایا، اُس نے فوراً آپریشن کا مشورہ دیا تھا حالانکہ اِس عمر میں آپریشن کرانا بہت خطرناک تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، سو فوری آپریشن کرایا گیا، آپریشن کے بعد معلوم ہوا کہ uterus میں کینسر ہے۔ ڈاکٹر نے پورا system نکال دیا پھر Onchologist کے پاس بھیجا جس نے ریڈیو تھراپی کا مشورہ دیا۔ ریڈیو تھراپی ہوئی بلکہ جسم کے اندر بھی ریڈیو تھراپی کی گئی کہ اگر کوئی cell رہ گیا ہو تو وہ بھی جل جائے اور پھر ڈاکٹر نے اطمینان دلا دیا کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ ہم مطمئن ہو گئے تھے لیکن پھر چند ہفتوں بعد اُن کا آنکھ کا آپریشن ہوا، شاید اس کی وجہ سے یہ مرض دوبارہ حملہ آور ہو گیا...... آپریشن کے چند ہفتوں بعد انہیں قبض کی شکایت ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "کوئی بات نہیں، ریڈیو تھراپی کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے......" وہ قبض کی دوائیں کھانے لگیں لیکن یہ تکلیف بڑھتی گئی پھر urine میں بھی تکلیف ہونے لگی تو انہیں آغا خان میں Nephrologist کو دکھایا، اُس نے ultrasound اور citi-scanning کا مشورہ دیا جس سے پتا چلا کہ کینسر اُن کے سارے جسم میں پھیل چکا ہے۔

اماں نے بہت بیماریاں برداشت کی تھیں۔ وہ بہت صابر خاتون تھیں۔ انہوں نے اس بیماری کو بھی بڑے صبر سے برداشت کیا تھا۔ مرنے سے تین دن پہلے وہ کومے میں چلی گئی تھیں لیکن بے ہوشی میں مسلسل باتیں کرتی رہتی تھیں یا اشاروں سے نماز اور تسبیحات پڑھتی رہتیں۔ اِس رمضان المبارک میں انہوں نے پانچ قرآن شریف ختم کیے تھے۔ مرنے سے دو دن پہلے میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "بارِالٰہ! قیامت کے دن میرا نامۂ اعمال میرے داہنے ہاتھ میں دینا۔" اور جب اُن کو بہت تکلیف ہوتی تو اُن کی زبان سے صرف یہ لفظ نکلتے کہ "خدایا! میرے گناہ معاف کر دے۔"

ڈاکٹرز نے ایک ماہ پہلے ہمیں بتا دیا تھا کہ آپ ان کے لیے دُعا کریں اور ان کو خوش رکھیں۔ میرے جو بہن بھائی جو ملک سے باہر تھے، وہ بھی آ گئے تھے اور یہ سارا وقت ہم نے اماں کے ساتھ گزارا تھا۔ جس دن اماں کا انتقال ہوا، اُس سے ایک رات پہلے وہ ہوش میں آ گئی تھیں۔ انہوں نے ہم سب کو سمجھایا تھا۔ ہم سب سے باتیں کی تھیں، سوپ پیا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ میں کون کون سی تسبیحات پڑھتی ہوں۔ رات کو میں اُن سے لپٹ کر سوئی تھی۔ میری بڑی



بہن اُن کا سر اور ہاتھ سہلاتی رہتی تھی۔ وہ رات کو کئی دفعہ درد سے بے چین ہوئی تھیں تو ہم نے انہیں بچوں کی طرح تھپک کر سلا دیا تھا۔ دوسرے دن صبح ہم نے انہیں بسکٹ کھلائے تھے اور دس بجے کے قریب نیم بے ہوشی کی حالت میں یخنی پلائی تھی حالانکہ ایک دن پہلے ہی دو ڈاکٹرز دو دفعہ آ چکے تھے اور بتا بھی چکے تھے کہ اَب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن نہ جانے کیوں دل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہم چھ بہنیں اور دونوں بہویں صبح سے اُن کے پاس تھیں پھر ہم نے اُن کے جسم کو تولیے سے اسفنج کیا تھا۔ اُن کے کپڑے بدلے تھے۔ فیروزی رنگ کا نیا سوٹ پہنایا تھا اور انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر صحن میں لے گئے تھے لیکن وہ بالکل بے ہوش سی تھیں...... اور پھر سہ پہر سوا چار بجے اُن کی سانس اکھڑنے لگی تھی، چہرے کا رنگ سفید ہو گیا تھا، پتلیاں پھیل گئی تھیں، فوراً ہی ایمبولینس منگوائی گئی تھی، جانے سے پہلے میری بھابھی نے انہیں قرآن پاک کی ہوا دی تھی۔ میں نے کان میں کلمہ پڑھا تھا۔ میری چھوٹی بہن نے آیت الکرسی کے حصار میں دیا تھا۔ گھر میں جو محلے کی عورتیں جمع ہو گئی تھیں، وہ بھی قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہی تھیں اور ہم سب لوگوں نے انہیں قرآنِ پاک اور دُعاؤں کی چھاؤں میں اُس گھر سے رخصت کیا تھا جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، آباد کیا تھا اور جس میں انہوں نے اپنی زندگی کا پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ گزارا تھا۔

اماں کے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے جب وہ لیاقت اسپتال کی ایمرجنسی میں تھیں تو چند لمحوں پہلے میں اُن کے پاس گئی تھی اور سورۃ رحمٰن کی تلاوت شروع کی تھی اور جب میں اِس آیت پر پہنچی تھی۔

هَل جزاُ الاحسانِ اِل الاحسان

تو انہوں نے بہت آرام سے آخری سانس لی تھی۔ مجھے لگا تھا جیسے فرشتے انہیں اپنے پَروں پر اٹھا کر لے گئے ہوں۔ میں نے سورۃ رحمٰن مکمل کی تھی اور اپنی ماں کو خدا کے حوالے کر کے ایمرجنسی سے باہر آ گئی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو اِس دنیا میں آیا ہے، اُسے جانا ہی ہے اور اماں بہت خوش نصیب تھیں کہ وہ ایک بے حد کامیاب زندگی گزار کر ایمان اور اعمالِ صالح کے ساتھ اُس سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں کہ جو ہر انسان کی منزلِ مقصود ہے۔ بس دُکھ یہ ہے کہ ہمارے سروں سے دُعاؤں اور شفقت و محبت کا سائبان ہٹ گیا ہے، ہمارے میکے کی رونق چلی گئی ہے، ہمارے لیے پل پل انتظار کرنے والی رخصت ہو گئی ہیں...... اور ہم بیٹیوں کا چمکتے ہوئے چہرے سے استقبال کرنے والی نہیں رہیں!!

میرے افسانوں کا اعزازیہ ہمیشہ وہی وصول کرتی تھیں اور وہ پیسے بڑی حفاظت سے رکھتی تھیں اور جب میں اُن سے ملنے جاتی تھی تو بڑے اہتمام سے اپنی دراز سے وہ پیسے منی آرڈر کی وصولی کی رسید کے ساتھ مجھے دیتیں اور کہتیں۔ "مجھے معلوم ہے تمہیں ان پیسوں کی کتنی خوشی ہوتی ہے جو پیسے اپنی محنت سے ملیں، اس کی بات اور ہے اس لیے میں یہ پیسے تمہیں اپنے ہاتھوں سے دیتی ہوں۔"

کیا کوئی دنیا میں آپ سے اس طرح محبت کر سکتا ہے اور آپ کی خوشی کو دل سے محسوس کر سکتا ہے؟

......☆☆......

سلسلے وار کہانی ایک نئی دلچسپ قسط وار کہانی جسے آپ ہر ماہ پڑھنا چاہیں گے

ارشد علی ارشد

# مکھنی

حزیں صدیقی کا خیال

جب حقیقت فسانہ بن جائے
کیا حقیقت کسی فسانے کی

**خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد ایک عجوبہ لڑکی کی داستان حیرت۔ پہلی کڑی**

مکھنی ایک زندہ کردار کی لازوال کہانی ہے۔ مجھے یقین ہے آپ مکھنی کو کبھی بھول نہیں پائیں گے کیونکہ مکھنی سے میں ایک بار نہیں ایک سو بار مل چکا ہوں اس لیے کوشش کی ہے کہ اس کردار کو مکمل سیاق و سباق کے ساتھ پیش کر سکوں..... قارئین سے گزارش ہے کہانی کو کہانی کے کرداروں اور اُن کی فطرت کو ملحوظِ خاطر رکھ کر پڑھیں۔ اگر قارئین میں سے کسی کو کرداروں کے خیالات و افکار سے اختلاف ہو تو اسے میری ذات سے منسوب نہ کیا جائے۔

نوٹ..... کہانی کے نام و مقامات بدل دیئے ہیں۔

(ا۔ع۔ا)

بات سے بات نکالنا، سوال در سوال کرنا اور کسی بھی واقعہ کو اس کے پورے سیاق و سباق کے ساتھ آخری تہہ تک لے جانا میری فطرت ہے۔ میرے سوالات کی بوچھار سے گھر والے، میری سہیلیاں اور خاندان والے کبھی کبھی عاجز آ جاتے ہیں تو وہ زچ ہو کر میرے بارے میں بڑی ہی بے سر و پا باتیں کرنے لگتے ہیں مگر میں ان کی باتوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں اس لیے بنا برا منائے اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہوں۔ یہ میری خصلت ہے خوبی ہے یا خامی؟ میں نہیں جانتی، ہاں مگر میرے اس طرزِ زندگی نے مجھے بیشتر لوگوں میں خبطی یا نیم پاگل قسم کی لڑکی مشہور کروا رکھا ہے، غمی خوشی میں جب عورتیں گاؤں کے کسی گھر میں اکٹھی ہوتی ہیں تو بتنگڑ باز قسم کی کئی عورتیں کچھ اس قسم کی باتیں کرتی ہیں۔

''بھئی خورشید' یہ لڑکی تم نے خوب پیدا کی ہے' اسے نہ ہماری سمجھ آتی ہے نہ ہمیں اس کی کوئی سمجھ آتی ہے۔'' جواباً امی کا ردعمل موقع کی مناسبت سے ہوتا یعنی غمی میں تاسف بھرا اور خوشی میں مسکراہٹ میں گندھا ہوا۔

ہماری امی ٹھنڈے مزاج کی عورت ہیں' بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انہیں غصہ آیا ہو۔ مردانہ نام کے باوجود گھر' فرماں بردار' ایمان دار اور وفادار عورت کی ساری خصلتیں میری امی میں موجود ہیں مگر میرے ابا اُن کے بالکل الٹ ہیں' غصہ اور گرم مزاجی سے لبالب بھرے ہوئے۔ میں بھی کبھی دھوپ چھاؤں کے اس ملاپ پر بڑی حیران ہوتی ہوں اور اللہ تعالیٰ پر میرا ایمان مزید پختہ ہو جاتا ہے۔ وہ جسے آباد رکھنا چاہے' کوئی برباد نہیں کر سکتا۔ ابا اتنے گرم مزاج ہیں کہ سردیوں میں بھی گرمیوں کی سخت دھوپ کی طرح شڑشڑاتے ہیں اور امی گرمی ہو کہ سردی' ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہیں' یوں دو مختلف مزاج اور فطرت کے انسانوں نے چھبیس برسوں کے دن اور راتیں اکٹھے ایک ہی چھت تلے گزار دیئے تھے۔

میرے دو بڑے بھائی ہیں' جی حضوری میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ کولہو کے بیل کی طرح جو ابا نے کہا' وہ پتھر پہ لکیر جان لیا' کوئی جیے یا مرے' انہوں نے ابا کا کیا پورا کرنا ہے۔ اس میں کچھ تو ان کی فرماں برداری شامل تھی اور کچھ ابا کی سخت مزاجی کا رفرما تھی جو انکار سننے کے عادی نہیں تھے۔ ہمارے گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کا اعزاز مجھے حاصل ہے' مجھ سے اوپر میری بہن سکھاں کا نمبر ہے۔ ہم دونوں کی عمروں میں صرف ایک سال کا فرق ہے اس لیے پتا نہیں چلتا کہ بڑی وہ ہے یا میں؟ ٹاپ پر اظہر بھائی اور دوسرا نمبر مظہر بھائی کا ہے اور ہاں! ذکیہ پھوپھو بھی ہماری فیملی ممبر ہیں جو موڈ میں ہوں تو میری ساری اچھی بری باتیں سنتی ہیں اور اگر موڈ نہ ہو تو مجھے دیکھ کر کنی کترا کر گزر جاتی ہیں' ایسے موقع پر وہ کبھی میرے ہاتھ میں آ بھی جائیں تو کانوں کو ہاتھ لگا کے ''توبہ ہے اس لڑکی سے۔'' کہتی ہوئی بھاگ جاتی ہیں۔

ذکیہ پھوپھو نے جوانی میں محبت کا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں ہمارے دادا جان یعنی پھوپھو کے ابا نے دو سزائیں منتخب کی تھیں۔ ایک یہ کہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے گی نہ کھیتوں میں کھانا دینے جائے گی نہ پانی بھرنے' گویا ہمیشہ گھر کی چار دیواری میں گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہے گی۔ پھوپھو کا کہنا تھا۔ ''محبت میں سلگنا بھی باعثِ تقویت ہوتا ہے جب دل میں دھواں سا بھرتا ہے تو احساسِ محبت پختہ ہو جاتا ہے۔'' مگر دوسری سزا ان کے لیے بہت کڑوی ثابت ہوئی تھی کہ اب کبھی ذکیہ کی شادی نہیں ہوگی۔'' بظاہر یہ ان کے ابا کی ہٹ دھرمی تھی اور سادہ لوحی کی پرلے درجے کی مثال مگر بہرحال وہ یہ حکم صادر فرما چکے تھے۔

انسان محبت کے بغیر رہ سکتا ہے مگر شاید فطرت کے برعکس زندگی نہیں گزار سکتا۔ فطرت کے بغیر جینا ایسے ہی ہے جیسے دھوبی کپڑے کو پتھر پر پٹخ پٹخ کے مارتا ہے اس لیے دادا جان جب وقت کے اسٹیج پر اپنا کردار نبھا کر منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گئے تھے تو میری امی نے ابا کو سمجھایا تھا۔

''یہ ظلم ہے' آپ کیوں ظالم بنتے ہیں؟ ذکیہ کی شادی کرا دیں۔'' ابا کے سامنے اپنے ابا کی وصیت تھی جنہیں وہ وقتِ نزع تازہ بھی کر گئے تھے مگر امی کی محنت اور شاید محبت بھی بہرحال رنگ لے آئی تھی۔ ابا نے مولوی صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ کچھ مولوی صاحب نے رعایت کی' کچھ ابا نے ڈنڈی ماری تھی کیونکہ جس کام کو انسان نے کرنا ہوتا ہے تو اس کے بارے میں بہت سی باتیں از خود اخذ کر لیتا ہے اور بہت سے اسباب بھی پیدا کر لیتا ہے۔ ضمیر بہت زیادہ چیخنا شروع بھی کر دے پھر بھی اس کی دال نہیں گلتی' یوں پھوپھو کی شادی ہو گئی مگر شومئی



قسمت' تین سال بعد ہی انہیں طلاق ہو گئی اور وہ اپنے ابا کے گھر چلی آئیں جو اب ہمارے ابا کا ہو چکا تھا' بس تب سے لے کر اب تک پھوپھو ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں اور امی بوقتِ ضرورت انہیں مختلف روپ میں استعمال کرتی رہتی ہیں۔

سکھاں کتابیں پڑھنی چاہتی ہے اور میں زندگی کو پڑھنا اور پرکھنا چاہتی ہوں کہ ''اگر زندگی میں کوئی روشن پہلو ہے تو کیوں ہے؟ اور ہمیشہ روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو کیوں نتھی رہتا ہے! اور اگر یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں' ندی کے دو کناروں کی طرح ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو ایک دوسرے میں ضم ہو کر کسی تیسرے پہلو کی شکل میں نمودار کیوں نہیں ہوتے یعنی زندگی غم و خوشی کا ہی امتزاج ہے یا اس میں کوئی تیسری چیز بھی کارفرما رہتی ہے' وہ تیسری چیز!'' میں سوچوں کے اتھاہ گہرے سمندر میں گر جاتی ہوں۔ ''وہ تیسری چیز مقدر بھی ہو سکتا ہے کیونکہ غم ملے یا خوشی' کہا جاتا ہے' مقدر میں تھا۔ مقدر اللہ تعالیٰ لکھتا ہے جو اپنے بندوں سے ماں سے ستر گنا زیادہ پیار کرتا ہے۔ اب اتنا زیادہ پیار کرنے والا اللہ تعالیٰ مقدر کو غم زدہ اور دکھوں سے بھرا کیسے لکھ سکتا ہے؟'' اس قسم کی باتیں سوچنا اور دوسروں پر سوال کرنا میرا وطیرہ تھا' میرے یہ انوکھے سوالات بڑے بڑوں کو چکرا کر رکھ دیتے تھے حالانکہ میں نے قرآنِ پاک ناظرہ میں پڑھا اور مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ مڈل کے بعد سکھاں اور دوسرے کلاس فیلوز لڑکیوں کی طرح لگے بندھے انداز میں اسکول نہیں گئی نہ کندھے پر بستے کا بوجھ اٹھایا نہ ٹیچرز کی مغز کھپائی کی۔

ہاں البتہ کتابوں کا تعاقب نہیں چھوڑا تھا۔

.....•.....•.....•

میں سکھاں اور پھوپھو ایک ہی کمرے میں رہتی تھیں۔ سکھاں کے ٹیبل پر نصاب کی کتابیں رکھی ہوتی ہیں جن سے وہ کبھی باہر نہیں نکلتی اور میرے ٹیبل پر ہر موضوع کی بے شمار کتابیں سجی ہوتی ہیں مگر میں ہمیشہ ان کے اندر نہیں رہتی' اُن سے ہٹ کر بھی سوچا اور سمجھا ہے' میں کتاب کے لکھے ہوئے حرفِ آخر نہیں سمجھتی بلکہ اُسے ابتدا سمجھتی ہوں۔ کتابیں ہمیں سوچنے کی پہلی سیڑھی فراہم کرتی ہیں جس پر جتنے اعتماد سے چڑھا جائے' منزل مل جاتی ہے جبکہ ڈر اور خوف سے چڑھنے والے لڑکھڑا کر گر پڑتے ہیں۔ مڈل پاس کرنے کے بعد جب سکھاں نے نویں کلاس میں داخلہ لیا تھا تو مجھے سمجھانے والے انداز میں بولی تھی۔

''ملھنی! تم آگے نہ پڑھ کر بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔ ہمارے ابا نے اپنی سخت مزاجی اور متوسط معاشی حالات کے باوجود ہمیں پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ پڑھائی ہر کسی کے مقدر میں نہیں ہوتی۔ میری بات مانو' تم بھی میرے ساتھ نویں کلاس میں داخلہ لے لو۔'' اُس وقت سکھاں مجھے نانی اماں سے بھی زیادہ بڑی عمر کی لگ رہی تھی کیونکہ یہ باتیں اس کے قد سے بڑھ کر تھیں۔

میں نے ہنس کر اس کے گال پر چٹکی لے کر کہا تھا۔ ''تم تعلیم کیوں لینا چاہتی ہو سکھاں؟ کیا تمہیں نوکری کرنی ہے؟''

میری بات سن کر اس نے حیرت سے پلکیں جھکا کر کہا تھا۔ ''تعلیم نوکری کے لیے حاصل نہیں کی جاتی' تعلیم انسان کو شعور دیتی ہے۔ زندگی کو سمجھنے اور پرکھنے میں مدد دیتی ہے۔'' مجھے معلوم تھا جو بات سکھاں کہہ رہی تھی' اسے سمجھتی نہیں تھی۔ وہ سنی سنائی یا پڑھی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔

میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھایا تھا اور اس کے پاس بیٹھ کر بولی تھی۔ ''سکھاں! انسان سیکھنے کے عمل سے ہمیشہ گزرتا ہے' اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اسکول و کالج کے چکر کاٹے' بڑی بڑی کتابوں کا بوجھ اٹھائے اور ڈھیر سارے پیسے ضائع کرے۔''

''میں سمجھی نہیں ملکھنی' تم کہنا کیا چاہتی ہو!'' معصوم سکھاں کے خوبصورت چہرے پر حیرانی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''اگر کوئی سیکھنے والا ہو تو وہ چیونٹیوں کی لمبی قطار سے بھی سیکھ لیتا ہے کہ زندگی میں نظم و ضبط بہت ضروری ہے' پرندوں کے غول سے جان سکتا ہے کہ اتفاق میں بہت برکت ہے' روشن صبح کے بعد تاریک شام کو دیکھ کر اسے پتا چل سکتا ہے کہ زندگی کی ایک دن شام ہو جائے گی۔ میں دعویٰ سے کہتی ہوں' بہت زیادہ پڑھائی زندگی کو سیکھنے کے لیے نہیں ہوتی۔''

''تو پھر!'' سکھاں الجھ گئی' وہ نانی اماں والی عمر سے اتر کر چار سال والی سکھاں بن گئی تھی۔

''زیادہ تعلیم زندگی کو مختلف روپ دینے کے لیے حاصل کی جاتی ہے' کون سا روپ کب اور کیسے دھارنا اور استعمال کرنا ہے' تعلیم یہ بہتر انداز میں سکھا دیتی ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت سیکھنے یا دیکھنے کے لیے اپنے گاؤں کے اَن پڑھ اور سادہ لوگ ہی کافی ہیں۔ کبھی انہیں غور سے دیکھنا' زندگی کی اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی کیونکہ ان کے پاس صرف روپ ہوتے ہیں' بہروپ نہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کے پاس روپ بھی ہوتے ہیں اور بہروپ بھی۔''

''لیکن ملکھنی' اگر مقصدِ حیات پانا اتنا ہی آسان ہوتا تو لوگ اسے حاصل کرنے کے لیے تعلیم کے پیچھے جُل خوار نہ ہوتے۔ بڑے بڑے عالم' پروفیسرز اور ڈاکٹرز نہ بنتے۔'' سکھاں کی بات سن کر میری ہنسی نکل گئی۔

اس نے ناراض نظروں سے مجھے دیکھا تھا اور ناراض ہو کر اٹھنے کی کوشش بھی کی تھی مگر میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔ ''سنو! ایک منٹ' اپنی بات کا جواب تو سن لو۔'' اس کے اعصاب ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اس نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا' تاہم لب کشائی نہیں کی تھی۔

''عالم' پروفیسرز' ڈاکٹرز سب ضرورتوں کے لیے بنتے ہیں' مقصدِ حیات کے حصول کے لیے نہیں' کچھ سیکھنے کے لیے عالم فاضل لوگوں کی لمبی لمبی تقریریں اور وعظ سننا ضروری نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی چپ بھی زندگی کے بہت سے راز افشا کر جاتی ہے۔ شیخ سعدیؒ کو ایک محفل میں کسی نے کہا۔ ''حضرت! آپ چپ بیٹھے رہتے ہیں' کچھ بولا کیجیے تاکہ حاضرینِ محفل آپ کی باتوں سے سیکھ سکیں۔''

شیخ سعدیؒ نے فرمایا۔ ''جس نے میری خاموشی سے نہیں سیکھا' وہ میرے بولنے سے کچھ نہیں سیکھ سکتا۔''

سکھاں خاموش ہو گئی تھی' میری باتیں شاید اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ سکھاں مجھے نویں کلاس میں داخلہ لینے پر آمادہ نہ کر سکی تھی۔ وہ اسکول میں کتابیں پڑھنے چلی جاتی اور میں گھر میں پڑھنے بیٹھ جاتی اور پھوپھو گھر کے کاموں میں جتی رہتیں۔ لڑکی جب تک ماں کے گھر میں ہوتی ہے' کام کم ہی کرتی ہے۔ یہ اور بات کہ دوسروں کے سامنے ماں اس کی تعریفیں کرتی نہیں تھکتی حالانکہ تنہائی میں وہ اکثر یہی فریاد کرتی ہے۔ ''ارے' کچھ گھر کے کام کاج ہی سیکھ' پرائے گھر جائے گی تو کیا کرے گی؟ پرائے لوگ چارپائی پر بٹھا کر نہیں کھلاتے' چارپائی پہ بیٹھ کے کھاتے ہیں۔'' ماں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر بیٹی کو یہ باتیں سمجھا رہی ہوتی ہے مگر جیسے ماں نے گزرے وقت



میں اپنی ماں کی بات پر کان نہیں دھرے ہوتے' اسی طرح اس کی بیٹی بھی ماں کی نصیحت کو ہنسی میں ٹال دیتی ہے۔ اب بندہ پوچھے کہ پرائے لوگوں پر بے اعتمادی کی یہ حالت ہے تو اپنی پھولوں ایسی نازک بچی ان کے حوالے ہی کیوں کرتے ہو؟

میں نے امی سے ایک بار یہ پوچھا بھی تھا تو وہ مجھے سمجھانے والے انداز میں بولی تھیں۔ ''ملکھنی' یہ قانونِ شریعت بھی ہے اور دنیا داری بھی۔ تو ابھی اس بات کو نہیں سمجھے گی۔''

''امی کا جواب سن کر میں نے جی میں کہا تھا۔ اگر سمجھ بھی لوں تو کیا ہو گا امی! وہی ہو گا جو دنیا داری میں ہوتا ہے۔ شریعت پر یہاں کون عمل کرتا ہے؟ وہ بھی دیہاتوں میں جہاں لڑکیوں کو ہمیشہ لب سی لینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ مردوں کے معاملے میں چپ کا روزہ رکھنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اظہارِ پسندیدگی کا یہاں تصور بھی نہیں ہوتا۔ میں کانپ اٹھتی ہوں یہ سوچ کر کہ جب مجھ پر یہ مرحلہ آئے گا تو کیا ہو گا؟ میں اپنے آپ سے لڑ سکتی ہوں' جیت نہیں سکتی۔ میں آج تک کبھی اپنے آپ سے نہیں جیتی۔ میرا اندر میرے باہر سے زیادہ قوی اور مضبوط ہے چونکہ میں ہر قسم کی کتابیں پڑھتی ہوں اور الفاظ سے زیادہ ان کے معنی پر غور کرتی ہوں اس لیے چند موضوعات پر مجھے خاص ملکہ حاصل ہے۔ علمِ تصوف' تاریخ اور ادب کو میں نے زیادہ گہرائی سے پڑھا ہے' شاید انہی کی بدولت میرے اندر انوکھے سوالات اور خیالات جنم لیتے ہیں۔

•.....•.....•

سکھاں نے میٹرک کلیئر کر لیا تو کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ ابا اسے مزید پڑھنے کی اجازت دے گا مگر خلافِ توقع ابا نے اجازت دے دی۔ ہم نے مظہر بھائی کو آگے کیا تھا۔ ابا' مظہر بھائی کی بات مشکل سے ہی ٹالتا ہے۔ اس بارے میں' میں نے بارہا سوچا ہے' ابا جیسے اوروں کے لیے ہے' ویسا مظہر بھائی کے لیے کیوں نہیں ہے؟ اس عمل نے مجھے زندگی کا ایک پہلو سکھا دیا تھا۔ ہر انسان کی خصلت' ہر انسان کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ کوئی ایک شخص نہ ساری دنیا کے لیے اچھا ہو سکتا ہے اور نہ ہی برا بلکہ وہ دس کے لیے برا ہو گا تو آٹھ کے لیے بہت اچھا بھی ہو گا۔ غصہ میرے ابا کی فطرت ہے' تند ہی ان کی طبیعت کی ناقابلِ تردید حقیقت ہے مگر بات جب مظہر بھائی کی ہو تو ابا کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے اور ہم میں سے کسی کی بات ہو تو ابا کا غصہ سونامی کی طرح طول و عرض میں بڑھتا ہی جاتا ہے' ویسے تو ابا میری ضروریاتِ زندگی کا پورا خیال رکھتا ہے۔ میں بیمار ہو جاؤں تو پریشان ہو جاتا ہے' میری کچھ فرمائشیں بھی کبھی کبھی پوری کر دیتا ہے' جس سے مجھے احساس ہوتا ہے' یہ شخص میرا باپ ہے مگر میرا ابا' مظہر بھائی کے لیے ان ساری باتوں کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہے۔ وہ مظہر بھائی کی وہ ضد بھی پوری کر دیتا ہے جسے ہماری ناجائز بات کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے' اس لیے مجھے لگتا ہے' ہمارا ابا مظہر بھائی کے لیے صرف باپ نہیں بلکہ باپ سے کچھ اوپر کی چیز ہے۔

مظہر بھائی سے میری خوب بنتی ہے' میری اکثر کتابیں ان کے اور میرے جیب خرچ کو ملا کے آتی تھیں اور ابا سے کچھ منوانا ہو تو بھی میں مظہر بھائی کا سہارا لیتی ہوں۔ مجھے پھوپھو نے بتایا تھا جب تیری عمر چار سال تھی' تب ہمارے گھر پہلا بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی آیا تھا' ویسے چوہدری اللہ رکھا کی حویلی میں تو نجانے کب سے آیا ہوا تھا مگر ہمارے پنڈ مہر داد نگر میں سب سے پہلا ٹی وی رفیق کمہار نجانے کہاں سے اٹھا لایا تھا' اس کی دیکھا دیکھی اس کا بھائی عبدالرحمان بھی لے آیا۔ ایک سال بعد اقبال تیلی بھی سر پر ٹی وی کا ڈبہ اٹھائے فخریہ انداز میں پنڈ میں

داخل ہوا تو ہمارا صبر کا پیمانہ ٹوٹ گیا۔ ہم نے بھائی یعنی میرے ابا کے پیچھے اس کے چہیتے پتر مظہر کو لگا دیا' مظہر پتر کی عمر اُس وقت دس سال ہوگی۔ مظہر نے ضد پکڑلی اور وہ دو بار ہی رویا ہوگا' بس پھر کیا تھا' نئی فصل کٹی اور ہمارے گھر ٹی وی آ گیا۔ مظہر بھائی ہمارے گھر کی واحد سستی ہے جو ابا کی کمزوری ہے۔ ہم نے اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا اور سکھاں کو داخلہ مل گیا۔ وہ بہت خوش تھی۔ سکھاں چادر میں لپٹی لپٹائی تانگے پر سوار کالج جانے لگی تھی۔ کالج ہمارے پنڈ مہر داد نگر سے بارہ یا پندرہ میل دور تھا۔ کالج کے آگے پیچھے پچاس سے اوپر دوسرے پنڈ تھے۔ یہ سب کا واحد سرکاری کالج تھا۔ سکھاں نے بتایا تھا' اس کی کلاس میں صرف دس لڑکیاں ہیں۔ پسماندہ علاقے کے اَن پڑھ لوگ جن کی کمر کھیتوں میں کام کرتے کرتے ٹیڑھی ہو جاتی ہے' اپنی دھی بھینڑ (بیٹی اور بہن) کو کم ہی کالج و اسکول چھوڑتے تھے۔ عجیب بات ہے ناں!..... کتابیں مجھے بتاتی ہیں' پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ اس کی 70 فیصد آبادی دیہاتی ہے جن کا انحصار زراعت پر ہے۔ پاکستانی معیشت بھی زراعت پر انحصار کرتی ہے پھر بھی زراعت کا فریضہ سرانجام دینے والے دیہاتی لوگ نچلی سطح کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہے۔ شہر کے کسی سیٹھ کو پنڈ میں لے جا کر کسان کو ہل چلاتے ہوئے دکھایا جائے اور اسے بتایا جائے کہ..... ''یہ تمہارے لیے مزے دار لذیذ ہانڈی بنا رہا ہے۔'' تو وہ کہے گا' تمہارا دماغ خراب ہے!

•.....•.....•

سکھاں اُس دن معمول سے کچھ لیٹ آئی تھی' کپڑے بدل کر اور کھانا کھانے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو میں نے دیر سے آنے کا سبب پوچھا تھا۔

وہ بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی تھی۔ ''آتے ہوئے راستے میں شمیم مل گئی تھی' ہم نے تانگے پر ساتھ بٹھا لیا..... پوچھا' کہاں جا رہی ہو شمیم؟ کہنے لگی۔ ''مولی بابا کی زیارت کو جا رہی ہوں' تم لوگ بھی چلو۔'' اپنے پنڈ کی ہم تین ہی لڑکیاں کالج جاتی ہیں اور ہماری سواری بھی فضلو چاچا کا واحد تانگہ ہی ہے اس لیے زہرہ اور فوزیہ نے بھی وہاں جانے کی فوراً ہامی بھر لی۔ ان کے متفق ہو جانے کے بعد چار و ناچار مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔''

''اچھا تو کیا کیا مولی بابا کی زیارت پر؟''

''کچھ نہیں' شمیم نے دِیا جلایا۔ ہم نے آنکھیں بند کر کے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جو کچھ یاد تھا' پڑھا اور دُعا مانگ کر واپسی کی راہ لی۔''

بالوں کا جُوڑا بنا کر سکھاں چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ سکھاں کی رنگت سانولی تھی مگر نین نقش بہت پرکشش تھے' اوپر سے بالی عمر اور کالج کی پڑھائی اسے پنڈ کی دوسری لڑکیوں سے ممتاز بناتی تھی' میں نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

''خیال کرنا' پنڈ کے کسی سجیلے نوجوان نے دیکھ لیا ناں تو مرمٹے گا تم پر پھر مانگتی رہنا مولی بابا سے خیر کی دعائیں۔''

''چھی!'' اُس نے ایسے کہا جیسے ابکائی لی ہو۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو' ہٹ پرے۔ (دور ہٹو۔)'' میرے قریب جانے پر سکھاں نے مصنوعی ناراضگی سے مجھے دھتکارا تھا۔ میں اس کی سادہ لوحی پر ہنس پڑی تھی۔ لڑکی اَن پڑھ ہو یا پڑھی لکھی' وہ لڑکی ہی ہے۔ سکھاں کہہ رہی تھی۔ ''مولی بابا کی زیارت پر کوئی ایسے ارادے سے جاتا ہے



بھلا!''

''کوئی نہیں جاتا مگر جا بھی سکتا ہے!''

''اچھا' زیادہ باتیں مت کرو' ایک بات بتاؤ؟'' سکھاں یکدم سنجیدہ ہو کر بولی تھی۔

''ہاں پوچھو!'' میں اس کے قریب کھسک گئی تھی۔ اس نے میری طرف بغور دیکھا تھا یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ میں سنجیدہ ہوں یا نہیں!

''میں جب مولی بابا کی زیارت میں داخل ہوئی تھی تو میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا تھا۔ 'زیارت' 'مزار' مقبرے ہمیشہ مرد حضرات کے ہی کیوں ہوتے ہیں؟ عورتوں کے کیوں نہیں ہوتے؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو' اولیائے کرام صرف مرد ہی کیوں ہوتے ہیں' عورتیں کیوں نہیں ہوتیں؟''

میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''شکر ہے سکھاں' تمہارے ذہن میں بھی کچھ تو آیا۔''

اُس نے مجھے ناقابلِ فہم نظروں سے دیکھا تھا' وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی' میں نے اسے چھیڑا ہے یا سنجیدہ بات کر رہی ہوں مگر وہ بولی کچھ نہیں تھی' جواب سننے کے لیے بیٹھی رہی تھی پھر فوراً ہی اسے کوئی خیال آیا تھا تو چونک کر بولی تھی۔

''میں صحابیات یا اِس زمانے کی بات نہیں کر رہی' بعد کے زمانے کی جبکہ بڑے بڑے اولیائے کرام پیدا ہوئے جن کے توسط سے دین ہم تک پہنچا اور آج ہم الحمدللہ' مسلمان ہیں۔'' اُس کی بات سن کر مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا' سکھاں کالج پڑھنے اور کچھ حاصل کرنے کے لیے جاتی ہے۔

''سکھاں! تم نے حضرت رابعہ بصریؒ کا نام سنا ہے؟''

''ہاں' سنا ہے!'' بلا تامل جواب ملا تھا۔

''کون تھیں وہ؟'' میرے اگلے سوال پر وہ جز بز ہو گئی تھی۔

''نام سنا ہے! کام کا پتا نہیں۔''

''جس سے نام سنا ہے' اُس سے پوچھا کیوں نہیں کہ حضرت رابعہ بصریؒ کون ہیں؟ تم بھی بس دوسروں کی طرح مولی بابا کی زیارت پر جا کر نہ سمجھ آنے والے حرفوں سے دُعا مانگ کر چلی آئی ہو۔ تم نے یہ سوچا' مولی بھی کوئی لفظ ہے؟ ہاں' مولی ایک سبزی کا نام ضرور ہے جسے ہم سلاد میں کھاتے ہیں اور یہ نام کسی بزرگ ہستی کا ہو ہی نہیں سکتا۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا!''

''بھئی' اصل لفظ ہے مولوی بابا' پنڈ کے اَن پڑھ' سادہ مزاج لوگ ہیں' مولوی کو مولی بنا دیا۔ تم تو کم از کم پڑھی لکھی لڑکی ہو' لفظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کیا کرو۔''

''اچھا بھئی' یہ بات چھوڑو' ہماری وہ بات تو درمیان میں ہی رہ گئی حضرت رابعہ بصریؒ والی۔'' سکھاں نے زچ ہو کر مجھے سابقہ موضوع یاد کرایا تھا۔

''رابعہ بصریؒ بصرہ کی مشہور عارفہ تھیں۔ اُن کا شمار اولیائے کرام میں ہوتا ہے۔ بچپن میں ہی انہیں کسی شخص نے پکڑ کر فروخت کر دیا تھا مگر پاک طینت ایسی پائی تھی کہ رہائی مل گئی۔ گوشہ نشینی کے لیے صحرا نشینی کی زندگی کو پسند کیا۔ صحرا نشینی کی زندگی سے جب بصرہ واپس لوٹیں تو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ عنایت کر دیا تھا اس لیے بہت

سے رفقاء اُن کے پاس دُعائے خیر کروانے کے لیے آنے لگے۔ زیارتِ بزرگان کفارۂ گناہ' لوگ زیارت کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ مشہور صوفی مالک بن دینارؒ درویش صفت رباحؒ وغیرہ تعلیم سے مستفید ہونے کے لیے اُن کے پاس تشریف لاتے تھے۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے انتہائی زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کی تھی۔ وہ ہر روز رات میں عموماً مکان کی چھت پر دُعا مانگا کرتی تھیں۔"

"ہاں مکھنی' وہ دُعا اُن کی بہت مشہور ہے۔" سکھاں فوراً بولی۔ "مجھے ایک بار امی نے بھی سنائی تھی۔"

"کیا تمہیں وہ دُعا یاد ہے؟"

"ہاں! میں سناتی ہوں۔ "اے میرے رَب! ستارے چمک رہے ہیں اور تمام لوگوں کی آنکھیں نیند سے بند پڑی ہیں۔ ہر کوئی اپنی خلوت میں ہے اور میں تیری جلوت میں۔ اگر میں دوزخ کے ڈر سے تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے جنت سے محروم کر دے اور اگر میں محض تیری خوشنودی اور رَضا کے لیے عبادت کرتی ہوں تو مجھ سے اپنے لازوال حسن کو پوشیدہ نہ رکھیو۔"

میں نے بہت محبت سے سکھاں کی پیشانی چُوم لی۔ "بس سکھاں' اس دُعا کو ذہن نشین کر لو اور اس کا مفہوم سمجھ کر اس پر عمل کرو۔ زندگی کا حاصل پا لو گی اور اب اہلِ تصوف کا ذکر چھیڑا ہی گیا ہے تو ایک اور بات تمہیں بتاتی ہوں۔ تم نے امام بخاریؒ کا نام سنا یا پڑھا ہے؟"

"ہاں' نام بھی پڑھا ہے اور کام بھی۔" اِس بار سکھاں کا لہجہ پر جوش تھا۔

"تم نے کیا پڑھا ہے سکھاں؟ مجھے بھی بتاؤ!"

"امام بخاریؒ خراسان کے مشہور شہر بخارا میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام محمد تھا اور کنیت!" سکھاں رک گئی تھی۔

"کنیت ابوعبداللہ تھی۔ امام المحدثین اور امیر المومنین فی الحدیث کے نام سے پکارے جاتے تھے۔" میں نے اسے یاد کروایا تو وہ جھنجلا کر بولی۔

"جب سب کچھ پتا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھتی ہو؟ میں زیادہ نہیں جانتی' تم ہی بتاؤ!"

"تمہیں جو بھی پتا ہے' بتاؤ سکھاں؟"

"امام بخاریؒ کو دس سال کی عمر میں ہی سیکڑوں احادیث سند کے ساتھ ازبر ہو گئی تھیں حتیٰ کہ چند سالوں میں ستر ہزار احادیث نہ صرف یاد ہو گئی تھیں بلکہ اُن احادیث میں مرفوع اور موقوف کون سی احادیث ہیں' یہ بھی ازبر تھا اور اُن کی سند جن راویوں نے اُن احادیث کو سند کہا' اُن کے حالاتِ زندگی' وفات اور رہائش گاہوں کے بارے میں بھی سب کچھ بتا سکتے تھے۔ زندگی کے ابتدائی سولہ سال بخارا شہر میں گزرے۔ اس دوران میں تمام بڑے بڑے محدثین سے حدیثیں پڑھ اور یاد کر لی تھیں مگر علم کی پیاس بڑھتی گئی۔ سولہویں سال والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی احمد کے ساتھ بخارا سے مکہ شریف کے سفر پر نکل گئے۔ بھائی اور والدہ صاحبہ حج کر کے واپس ہو لیے مگر امام صاحبؒ وہیں ٹھہر گئے۔ مکہ بڑے بڑے جید علماء سے آباد تھا۔ اُن سے فیض یاب ہونے کے بعد مدینہ شریف کے لیے رختِ سفر باندھا' وہاں سے بصرہ چلے گئے جو اُن دنوں علم و اشاعت اور حدیث میں سب سے بڑھ کر تھا۔ وہاں علم کی روشنی سے خود کو منور کیا مگر تشنگی ابھی باقی تھی اس لیے کوفہ چلے گئے۔ کوفہ سے بغداد جو اُس وقت خلافتِ عثمانیہ کا دار الحکومت تھا' بغداد میں اُس وقت!" کہتے کہتے سکھاں ایک بار پھر چپ ہو گئی۔ جتنا اُس



نے بتا دیا تھا' اُس کے حافظے کے لیے کافی تھا۔ وہ ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آگے میں بتاتی ہوں تاکہ تمہارے ذہن میں بھی تازہ ہو جائے۔" میں نے بہت محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"ہاں بولو' میں شاید کچھ بھول رہی ہوں۔" سکھاں نے بخوشی مجھے بولنے کی اجازت دے دی تھی تو میں نے سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا تھا جہاں سے سکھاں نے چھوڑا تھا۔

"جب امام صاحبؒ بغداد گئے تھے' اُس وقت وہاں علماء کا ایک بہت بڑا گروپ رہتا تھا۔ اُس میں امام احمد بن حنبلؒ' محمد بن عیسیٰ الصباغؒ' محمد بن سالقؒ اور تشریح بن لقمانؒ موجود تھے اس لیے امام صاحبؒ نے اپنی پوری زندگی میں جس طرح بصرہ کے چار مرتبہ چکر لگائے' اُسی طرح بغداد کا آٹھ بار رخ کیا۔ بغداد کے بعد امام بخاریؒ شام گئے۔ وہاں سے مصر اور جزیرہ سے ہوتے ہوئے خراساں پہنچ گئے۔ خراسان سے بلخ کے لیے رختِ سفر باندھا۔ تم نے اُردو کی مشہور کہاوت سنی ہو گی؟"

"کون سی کہاوت؟"

"جو سکھ چوبارے' وہ بلخ نہ بخارے۔ بلخ اور بخارا' یہ دونوں خوبصورت شہر ہیں تو میں کہہ رہی تھی' یہ سارے سفر امام صاحبؒ نے اوائلِ عمری یعنی سولہ سال سے ۲۰ رسال کی عمر میں ہی کر لیے تھے۔ اب میں آتی ہوں' اصل موضوع پر کہ میں نے یہ تمہیدی قصہ کیوں چھیڑا!" سکھاں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا' تاہم بولی کچھ نہیں۔ میں نے پوچھا۔ "تمہیں پتا ہے سکھاں' چھوٹی عمر میں حضرت امام بخاریؒ کی آنکھوں سے بینائی کھو گئی تھی؟"

"نہیں' یہ بات میرے لیے نئی ہے۔"

"ہاں آپؒ کی بینائی نہیں تھی' کافی علاج معالجہ ہوا مگر بے سود' بینائی نہ لوٹی۔ بچے کی بینائی نہ ہونے پر آپ کی والدۂ ماجدہ اکثر رو رو کر اللہ تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی بصارت مانگا کرتی تھیں۔ ایک رات خواب میں انہیں جد الانبیاء سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے اور بتایا۔ "تمہارے رونے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنے کی بدولت اللہ تعالیٰ نے تمہارے بیٹے کی بصارت بحال کر دی ہے۔" صبح اٹھ کر دیکھا تو واقعی حضرت امام بخاریؒ کی بینائی لوٹ آئی تھی اور بینائی کا یہ عالم تھا کہ آپؒ نے اپنی مشہور و معروف کتاب "تاریخِ کبیر" چاندنی راتوں میں لکھی۔ سوچو سکھاں' وہ کوئی عام عورت تھیں جنہیں سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام خواب میں بیٹے کی بصارت لوٹ آنے کی بشارت دے رہے ہیں؟ کیا وہ عام عورت ہو سکتی ہیں جن کا رونا اور دُعا کرنا اللہ تعالیٰ کو ایسے پسند آیا کے بچے کی بینائی یوں لوٹا دی کہ وہ چاندنی راتوں میں کتابیں لکھے؟ سکھاں! وہ اپنے وقت کی عالمہ اور فاضلہ خاتون تھیں۔ تاریخ بھری پڑی ہے ایسی عالمہ و فاضلہ عورتوں سے۔ اب ہم ہی لاعلم رہیں تو قصوروار کون ہے؟ میں توقع کر رہی تھی کہ سکھاں مزید کوئی سوال اٹھائے گی مگر وہ چپ رہی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ میں نے محسوس کیا تھا کہ سکھاں کچھ زیادہ ہی چپ رہنے لگی ہے اور نا ہی پہلے جیسے معمولات رہے تھے۔ کہیں کوئی گڑبڑ ہے' میرے دل میں خیال آیا تو پھوپھو سے پوچھا۔ اُن کا جواب بھی یہی تھا۔

"ہاں مکھنی' سکھاں کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔"

میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا' سکھاں جس کالج میں پڑھنے جا رہی تھی' اس میں صرف دو ہی کلاسیں

پڑھائی جاتی ہیں' سکھاں اب ایف اے میں پڑھ رہی تھی۔ ایف اے سے آگے راولپنڈی شہر میں جانا تھا جو ممکن نظر نہیں آتا تھا' یقیناً آگے کی سوچ نے اسے پریشان کر رکھا ہوگا اس لیے کہ وہ بہت آگے تک پڑھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں نے جب سکھاں سے اس بارے میں بات کی تو وہ بولی تھی۔

''مکھنی' مجھے پتا ہے' ایف اے سے آگے پڑھنا میری خواہش کے باوجود ناممکن ہے اس لیے میں نے کبھی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

''پھر یہ خاموشی' نامانوس سی اداسی! سکھاں' میں سمجھ نہیں پا رہی تو بدلتی جا رہی ہے یا میری بصارت اور سوچ میں فرق آ گیا ہے؟'' اُس وقت سکھاں برتن دھو رہی تھی اور میں آستین چڑھائے ویسے ہی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں' کبھی کبھی جھاگ لگے کسی برتن پر پانی کا کٹورا انڈیل دیتی تھی۔

میری بات سن کر سکھاں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا دیگچا نیچے رکھا اور کھڑی ہوگئی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی' میں سر اٹھا کر لمحہ بہ لمحہ بدلتی اس کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ وہ اضطراری حالت میں انگلیوں پر اپنا دوپٹا لپیٹ رہی تھی۔ مجھے معاملہ گمبھیر ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے عقب میں چلی گئی اور اس کا چہرہ شانے سے پکڑا' اپنی طرف گھمایا' سکھاں کی اداس آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی۔ میں نے صحن میں نگاہیں دوڑائیں' مرغیوں اور بکریوں کے علاوہ صحن ویران تھا۔

میں نے سکھاں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''بتا میری بہن! کیا مسئلہ ہے؟''

کچھ کہنے کے لیے اُس نے لبوں کو جنبش دی مگر کہہ نہیں پائی۔ میں نے اُس کا حوصلہ بڑھایا' محبت سے شانے تھپتھپائے۔ ''تو باہمت لڑکی ہے سکھاں' پورے مہرداد نگر میں تو اُن لڑکیوں میں شامل ہے جنہوں نے کالج جانے کی ہمت کی ہے ورنہ چوہدری اللہ رکھا کی بیٹیوں کو راولپنڈی شہر سے دو ٹیچرز پڑھانے آتی ہیں۔ ہم نے اب تک زندگی کے دکھ سکھ اکٹھے دیکھے اور سہے ہیں' مجھے بتا' شاید میں تیرے مسئلے کا کوئی بہتر حل نکال سکوں۔''

میری باتوں نے سکھاں کی ڈھارس باندھی تھی اور پھر اس نے پریشان رہنے کا سبب بتا کر مجھے پریشان کر دیا تھا جسے سن کر میں بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور میرے ہاتھوں میں دبا ہوا سکھاں کا ہاتھ چھوٹ گیا تھا۔

•.....•.....•

بہت کم ایسا ہوتا ہے' انسانی زندگی ٹھہراؤ اور تسلسل سے آگے بڑھتی رہے' پیچ و خم' نشیب و فراز' اتار چڑھاؤ زندگی کا خاصا ہیں۔ ہم نے زندگی کا نغمہ ایک ہی لے اور دھن میں جو گا لیا' سو گا لیا' اب ہماری طرزِ حیات بدلنے والی تھی' سکھاں نے جو کچھ مجھے بتایا تھا' اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے ابا کی طرف سے ڈر تھا' امی کو سمجھایا جا سکتا تھا مگر ابا..... ابا کو جیسے ہی پتا چلتا' اس نے گھر میں لٹکنے والی واحد رائفل اٹھا لینی تھی' رائفل میں دو ہی کارتوس آتے ہیں اور ہم بھی دو ہیں' میں اور سکھاں' مجھے یقین تھا' ابا نے ہم دونوں کے سینے کے اندر کارتوس اتار دینے ہیں اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ سکھاں کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے سرزنش کی جائے' اس کی بات کو مذاق میں اڑا دیا جائے' اس پر باور کر دیا جائے کہ ''سکھاں کملی' یہ سب کچھ ہنسی مذاق اور وقت گزاری کا ایک بہانہ ہے' تم کیوں سنجیدہ ہو کر اپنی ہنستی مسکراتی زندگی کو اجیرن بنانے پر تلی ہوئی ہو؟''

''سکھاں' یہ کیا تم ہر وقت ہیئر کی طرح منہ لٹکائے بیٹھی رہتی ہو' مرنا ہے کیا؟'' میری بات سن کر وہ مصنوعی طریقے سے بولی تھی۔



''میں نے نہیں' تمہیں مرنا ہے' وہ بھی میرے ہاتھوں.....'' اُس نے میری طرف مکہ لہرایا تھا تو میں نے اس کے سامنے مسکرا کر ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''سوری بابا! مگر یہ جو تم نے محبت کا طوق گلے میں لٹکا لیا ہے ناں! اس سے کچھ حاصل وصول نہیں ہے' خوامخواہ وقت کا ضائع کرنا اور دل کا روگ ہے۔''

''تم نہیں سمجھ سکتی مکھنی' تم نے کبھی محبت کی نہیں کی نا! اس لیے ایسا کہہ رہی ہو۔''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو سکھاں' مگر میرا دعویٰ ہے کہ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں' امی' ابا' اظہر بھائی' مظہر بھائی' سب سے پیار کرتی ہوں۔''

''وہ محبت اور ہے پگلی' اور یہ محبت اور!''

''اچھا تو تم ہی سمجھا دو' مجھے تو بس اتنا پتا ہے' محبت' محبت ہے۔''

''وہ مقدس رشتوں کی محبت ہے اور یہ محبوب کی محبت ہے!''

سکھاں محبت کر کے بھی محبت کو ابھی سمجھی نہیں تھی' میں نے پوچھا۔ ''اس محبت کی منزل کون سی ہے؟''

''محبوب کو پا لینا ہی محبت کی منزل ہے۔''

''اچھا تو پھر محبوب کو کیسے پایا جاتا ہے؟''

''سیدھی سی بات ہے' اس سے شادی کر کے!''

اس بار میں سکھاں کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی' وہ مجھے حیرانی سے دیکھ رہی تھی' میری ہنسی تھمی تھی تو میں نے پوچھا تھا۔ ''میں صلاح الدین ایوبی سے محبت کرتی ہوں' کیا اُس سے شادی کر لوں؟''

سکھاں کی آنکھیں حیرت سے کچھ پھیل گئی تھیں۔ ''تم تو پاگل ہو' مجھے لگتا ہے' پہلے نہیں مگر اب تمہارا پاگلوں کے اسپتال میں داخلہ ضروری ہو گیا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے' میں پاگل سہی' تم تو نہیں ہو نا؟ چلو' تمہی بتاؤ' تم سانول (وہ لڑکا جس سے سکھاں پیار کرنے کی دعوے دار تھی۔) کو کیسے پانا چاہو گی؟''

''اُس سے شادی کر کے یار!'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولی تھی۔

''شادی تو ساری دنیا کرتی ہے' تم اپنے پیار کی کوئی انوکھی منزل بتاؤ!''

''مجھے کچھ نہیں کہنا۔'' سکھاں منہ بسورے چارپائی کے کنارے ٹک گئی تھی' میں اس کے سامنے دوزانو بیٹھ کر بولی تھی۔ ''سکھاں' تیری شادی ہو گی پھر بچے پیدا ہوں گے' زندگی یوں ہی ٹیڑھے میڑھے انداز میں آگے بڑھتی رہے گی' یار! ایسا تو ساری دنیا کرتی ہے' تم اسے پیار کہتی ہو' میں اسے ضرورت کہتی ہوں یا زندگی کا حصہ کہہ لو' اس کے لیے!''

''بس میری ماں..... بس!'' اس نے غصے میں میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ ''مجھے نہ تم سے کچھ کہنا ہے نہ سننا ہے۔''

سنجیدہ و غیر سنجیدہ' میں نے اپنے تئیں کوشش کر دیکھی مگر مجھے لگا کہ سکھاں اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہے' اس کے رویے اور باتوں میں کوئی لچک نظر نہیں آئی تھی۔ پھوپھو ہمارے ساتھ کمرے میں سوتی تھیں اس لیے وہ بھی شریکِ راز تھیں۔ سکھاں کی خوش قسمتی تھی کہ پھوپھو بھی کبھی محبت کی اُس کشتی میں سوار تھیں اس لیے پھوپھو کا ووٹ

سکھاں کے بکس میں تھا۔

سکھاں کہتی۔ ''پیار کی دلدلی زمین پر جس نے بھی قدم رکھا' وہ اندر ہی اندر دھنستا چلا گیا' یہ وہ سفر ہے جس کی واپسی کی ساری راہیں بند ہو جاتی ہیں' بندہ جیے یا مرے' اس میں آگے ہی آگے چلنا پڑتا ہے' میں نے دیکھا' اب سکھاں کی ٹیبل پر شاعری کی کتابیں اور رومانوی ناول بھی نظر آنے لگے تھے۔ میری وہ کتابیں جن کو کبھی اُس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا' اب اُن میں کھوئی ہوئی نظر آتی' سکھاں کی طرزِ زندگی میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو گئی تھی' وہ ہر روز رات کو وارث شاہؒ کی ''ہیر'' پڑھتی' جب سونے لگتی ہے تو کتاب کو بڑے احترام سے بوسہ دیتی ہے اور ادب سے تکیے کے ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ کتاب کا پڑھنا میری سمجھ میں آتا ہے مگر مذہبی کتاب کی طرح اُس کی تکریم کرنا میری عقل سے باہر تھا۔ سکھاں ایسا کیوں کرتی ہے؟ اور پھر یہ بھی ہوا کہ ایک بار کتاب ختم ہوئی تو اُس نے دوبارہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔

''سکھاں! ''ہیر'' میں نے بھی پڑھی ہے' اس میں ایسا کیا ہے کہ تو پھر سے پڑھنے لگی؟''

سکھاں نے ایک لمحہ کتاب سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا پھر کتاب کو دیکھا' دو تین اوراق پلٹ کر پھر مجھے دیکھا اور متوجہ پا کر بولی۔

''جوگی آکھدا آجے جاننا ایں' رہیں ایس خیال تھیں بازیاں
ایس جوگ دا جالنا بہت مشکل' رنگ رنگ دے سوز گدازیاں
ایتھے اپنے آپ نوں گالنا ایں' نہیں کھیلنے چرخ تے بازیاں
سر سختیاں نرمیاں جھیلنا اے' دسنا دل دارازیاں

''تسبیح کے دانے بکھرے ہوئے پڑے ہوں تو وہ تسبیح نہیں ہوتی' صرف دانے ہوتے ہیں' جب انہیں ایک لڑی میں پرو دیا جائے تو پھر تسبیح بنتے ہیں۔ لکھے ہوئے پر پڑھنے والے بہت اثر انداز ہوتے ہیں' کسی بہت اچھی تحریر یا اشعار کو اس کے مکمل سیاق و سباق کے ساتھ نہ پڑھا جائے تو الفاظ اور معنیٰ گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور کبھی کسی بہت اچھے شعر کا غلط انداز میں پڑھنے سے ستیاناس ہو جاتا ہے۔'' سکھاں نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے جس طرح ڈوب کر اشعار پڑھے تھے' مجھے لگا جیسے یہ الفاظ وارث شاہؒ نے نہیں' سکھاں نے لکھے ہیں۔ اُس نے الفاظ کو نئے معنیٰ سونپ دیئے ہیں۔ اُس کا انتخاب لاجواب تھا مگر خود اسے اِن اشعار کا مطلب معلوم تھا؟ میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

''جوگی رانجھے کو سمجھا رہا ہے' میاں' یہ روگ نہ لے۔ یہ روگ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے' اس جوگ میں بڑے بڑے بھاگ جاتے ہیں۔ اس میں ہر طرح کی تکالیف اور امتحان ہیں' خود کو تباہ کر کے جوگی بننا پڑتا ہے' یہ ایسے نہیں کہ دو شکاری پرندے ایک شکار کے پیچھے ایک دوسرے سے کھیلا کرتے ہیں۔ عمریں بیت جاتی ہیں کچھ حاصل کرنے کے لیے اور سر سختیاں' نرمیاں جھیلنا اے' نہیں دسنا دل دارازمیاں۔ اس روگ میں سختیاں' مصیبتیں جھیل کر بھی چپ رہنا ہے' کسی سے کچھ نہیں کہنا نہ دل کے راز نہ دُکھاں دے دکھ''

میں بے اختیار اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی' اس کے سامنے بیٹھ کر کتاب ہاتھوں میں لی اور ایک طرف رکھ دی' سکھاں ابھی تک اشعار کے سحر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چُوم لیے اور کہا۔



''سکھاں! پلٹ آ میری بہن! مت جا آگے..... آگے..... آگ ہی آگ ہے اور آگ اپنے پجاری کو بھی جلا دیتی ہے!''

''مکھنی' پلٹ آنے کے لیے میں آگے نہیں بڑھی تھی' اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔''

''سکھاں' یہ ہیر' وہ رانجھا' یہ لیلیٰ اور مجنوں' سارے قصے ڈراموں اور کتابوں میں ہی اچھے لگتے ہیں' تب دور اور تھا' اب دور اور ہے' آج کے دور میں نہیں ہوتا یہ سب۔''

''مکھنی' تو اکثر مجھے کہتی ہے ناں' پیار کرو اُن راہِ حق کے شہیدوں سے جو کبھی نہ مرنے کے لیے اَمر ہو چکے ہیں۔''

''ہاں' وہ تو میں اَب بھی کہتی ہوں۔''

سکھاں نے میری بات سن کر تیزی سے پاؤں چارپائی سے نیچے لٹکائے اور میرے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیز لہجے میں بولی۔ ''تو بتا مکھنی' تو صلاح الدین ایوبیؒ سے کتنی محبت کرتی ہے؟ محمد بن قاسمؒ نورالدین زنگیؒ اِن میں سے کون تمہیں بہت زیادہ یاد آتا ہے؟''

میں لحظہ بھر کے لیے سکھاں کے انداز اور الفاظ پر چکرا کر رہ گئی' یہ سکھاں کی سوچ اور سوال نہیں ہو سکتا' اس نے مجھے خاموش پا کر شانوں سے جھنجھوڑ ڈالا۔ ''بول مکھنی' چپ کیوں ہے؟ بتا' مجھے تیرے پیار کا ضابطہ کیا ہے؟''

''سکھاں' میری عقیدت کا یہ عالم ہے کہ مجھے صلاح الدین ایوبیؒ اِس وقت کمرے میں نظر آ رہا ہے!''

''یہ تیری محبت ہے مکھنی' صدیوں پہلے دنیا سے جانے والا شخص تجھے آج بھی اِس کمرے میں نظر آ رہا ہے تو مکھنی' جسے میں پیار کرتی ہوں' وہ تو ابھی زندہ ہے' اسی سماج اور اسی پنڈ کا حصہ ہے' میں اسے کیسے بھول جاؤں اور واپس پلٹ آؤں؟''

''سکھاں' صلاح الدین ایوبیؒ اور سانول میں بہت فرق ہے۔'' میں نے اسے بتانا چاہ رہی تھی' عقیدت اور عشق میں فرق ہوتا ہے۔''

پر وہ جھٹ سے بولی۔ ''افراد میں فرق ہے' محبت میں کوئی فرق نہیں۔''

سکھاں جو کچھ کہہ رہی تھی' ایسا کبھی موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر بھی نہیں کہا مگر اَب وہ بلا تامل اور مدلل بول رہی تھی۔ سکھاں میرے ان نظریات کی زندہ مثال بن گئی تھی کہ انسان کو کتابیں ہی ہمیشہ نہیں سکھاتیں' اُسے حالات و واقعات اور زندگی کے سفر بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ سکھاں جب تک کتابوں کا کیڑا بنی رہی' اَن پڑھ ہی رہی مگر جب پیار کیا تو پڑھے لکھوں کی طرح بولنے لگی۔

''سکھاں! جس پیار کی میں بات کر رہی ہوں' وہ عبادت کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ وہ عام انسان نہ تھے' انہوں نے کفار کے خلاف جنگیں لڑی ہیں اور اسلام کو سربلند کیا ہے' وہ جہاں بھی گئے' جس طرف بھی گئے' اسلام کا پرچار کیا' وہ ذات کے اسیر لوگ نہیں تھے' اسلام کے اسیر' محافظ اور داعی تھے۔ ہماری اُن سے عقیدت کارِ ثواب ہے جبکہ تمہارے پیار کا الگ پیرہن ہے' اس میں رسوائی اور ذلت کا خدشہ ہے۔ میرے پیار میں عزت ہی عزت ہے' تیرے پیار میں آہیں اور سسکیاں ہیں' میرے پیار میں راحت ہی راحت ہے' جو پیار تم کر بیٹھی ہو' ہم جیسے غریبوں کا شیوہ نہیں اس لیے میری بات مانو' پانی ابھی بہنا شروع ہوا ہے' سیلاب نہیں بنا ہے' اس کے سامنے فوراً بند باندھ دو' سیلاب بن بھی گیا تو نقصان نہیں اٹھے گا۔''

''ملکھنی' پیار نہ رتبہ دیکھتا ہے' نہ دھن اور دولت' پیار جس سے ہونا ہوتا ہے' ہو کر رہتا ہے۔''

سکھاں ہار ماننے والی نہیں تھی نہ وہ میری باتوں سے زچ ہو رہی تھی اور نہ اپنے موقف سے پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ''ملکھنی! پیار کو امیری غریبی کے ترازو میں نہیں تولا جاتا تو کہتی ہے ملکھنی' پانی ابھی بہنا شروع ہوا' سیلاب نہیں بنا' میں کہتی ہوں' یہ سیلاب بنا ہو یا نہیں مگر سمندر ضرور بن چکا ہے' میں تیری عقیدت سے زیادہ سانول کو پیار کرنے لگی ہوں۔'' سکھاں کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''اگر یہ بات ہے تو میرا دعویٰ ہے' مجھے یہاں صلاح الدین ایوبی نظر آرہا ہے تو بھی اگر سانول کو یہاں دیکھ اور محسوس کر رہی ہے تو سامنے لا۔''

میری بات سن کر سکھاں نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کردیا اور بولی۔ ''تو اللہ تعالیٰ کو مانتی ہے؟''

''ہاں سکھاں! یہ کیسا سوال ہے؟'' میں واقعی اس کی بات نہیں سمجھی تھی۔

وہ میری حیرت اور بات کو یکسر نظر انداز کر کے بولی تھی۔ ''اور تیرا یہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت یہاں موجود ہے۔ ہمیں دیکھ بھی رہا ہے اور سن بھی رہا ہے!''

''ہاں بھئی' بے شک' اس میں شک تو کفر ہے اور ہم کافر نہیں۔ الحمدللہ' مسلمان ہیں' یہ تو ہمارا ایمان ہے۔''

''ملکھنی' تم مجھے یہاں اللہ تعالیٰ کو دکھا سکتی ہو؟ جبکہ ہمارا ایمان ہے کہ وہ اس وقت یہاں موجود ہے!''

''سکھاں' تم عقل کو مانتی ہو مگر دکھا نہیں سکتی' روح کو مانتی ہو' نکال نہیں سکتی' سوچ کو مانتی ہو' دیکھ نہیں سکتی' تم یہ بھی یقیناً جانتی ہو کہ ہم میں آئرن ہے' چونا ہے' مٹی ہے مگر جسم سے چٹکی بھر آئرن یا نمک نکال سکتی ہو؟ نہیں ناں سکھاں!......اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی بلاتردد ہر جگہ حاضر و ناظر ہے مگر ہم اسے دکھا نہیں سکتے۔ وہ خالق ہے سکھاں! اور ہم مخلوق کی بات کر رہے ہیں۔''

''صلاح الدین ایوبی تو مخلوق ہے ملکھنی' اُسے دکھادو۔'' سکھاں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اسے ہرا کر رہے گی۔

میں اس کی بات پر زیرلب ہولے سے مسکرائی تھی۔ ''ہاں' اب آئی ہو ناں' اصل بات پر' تم صلاح الدین ایوبی کو دیکھنا چاہتی ہو؟''

''ہاں' ابھی' اسی وقت۔''

''میری عقیدت اتنی ناپختہ نہیں ہے سکھاں کہ وہ تمہیں دکھائی دے۔ دیکھو وہ سامنے کیا ہے!''

''سفید چونے کی کھردری دیوار!'' اس نے سامنے دیوار کی طرف نسبتاً حیرت سے کہا تھا۔

''غور سے دیکھو!'' میں نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر دیوار کی طرف اشارہ کیا تو دیوار کسی پردۂ اسکرین کی طرح روشن ہوگئی۔ سکھاں کی چیخ نکل گئی تھی' روشن اسکرین پر گھوڑے بھاگ رہے تھے' ٹھکا ٹھک' ٹھکا ٹھک' جوان اور توانا گھوڑے' کشادہ سینے اور اکڑی ہوئی گردن جن کی ٹانگیں گوشت اور ہڈی کی نہیں' فولاد کی بنی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں جو سمندر کا سینہ چیر دیں' چٹانوں کو پاٹ لیں اور جنگلات کو خاطر میں نہ لائیں۔''

سکھاں مجھ سے لپٹ گئی' میں نے اس کے گال تھپتھپائے پھر شانوں پہ تھپکی دی۔ ''ڈرو مت' سامنے دیکھو' گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ٹھکا ٹھک اٹھتے ہوئے قدم' مجاہدینِ اسلام کا لشکر اپنی پوری ایمانی قوت کے ساتھ دشمنانِ اسلام کی طرف لپک رہا ہے' دیکھو سکھاں' لشکر کے آگے کون ہے؟

اس حیرت اور اسرار بھرے' ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے گا۔



# مسئلہ یہ ہے

## خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' ایک مفید معلوماتی اور مستقل سلسلہ ہے۔ یہ کالم خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اولین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے استفادہ کیا اور ہزاروں لوگوں نے اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ حاصل ہوتا رہا' اسی تناسب سے ہر ماہ وصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گزشتہ کئی برسوں میں ان خطوط کی تعداد اتنی تجاوز کرگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں جواب دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے اپنے جواب کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے کے صفحات بہرحال محدود ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ لوگوں کے مسائل اور مشکلات بہت زیادہ اور عموماً فوری حل طلب ہوتی ہیں۔ ان کے لیے طویل انتظار ایک اذیت ناک کام ہے۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جواب براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے اور مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی' قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ)' کے لیے دُعائے خیر ہے اور بس۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ صاحبِ استطاعت حضرات اور خواتین سے درخواست ہے کہ وہ ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ اپنی بساط کے مطابق اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والی اُن خواتین کے جوابات بھی سپردِ ڈاک ہوجائیں گے جو کسی مجبوری کی بنا پر ڈاک خانے تک نہیں جاسکتیں اور =/300 روپے کا منی آرڈر نہیں کرسکتیں۔ یہ ایسی نیکی ہوگی جس کا اجر اس دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ اب تک صرف ممالکِ غیر میں مقیم حضرات نے ازخود تعاون کیا ہے۔ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو قارئین کے خطوط اور میرے جوابات کو فوری سپردِ ڈاک کرنے کا ریکارڈ مرتب کرنے اور دیگر متعلقہ امور کو سرانجام دینے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں تو برائے کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ لفافے میں بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ کا نمبر ضرور تحریر کریں۔ وہ تمام خطوط جو =/300 روپے ٹوکن منی اور جوابی لفافے کے بغیر موصول ہوں گے' ان کے جوابات حسبِ سابق پرچے میں شائع ہوتے رہیں گے۔ خط ارسال کرنے سے پہلے درج ذیل ہدایات نوٹ فرمالیں۔

(۱) براہِ راست جواب درکار ہو یا کالم کے ذریعے' دونوں صورتوں میں اپنا اور اپنی والدہ کا اصل نام تحریر کریں۔ کالم میں اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو اصلی نام کے ساتھ کوئی فرضی نام بھی تحریر کریں تاکہ مسئلہ اُسی نام سے شائع کیا جائے۔ جان بوجھ کر گمنام اور فرضی پتوں کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ اپنے مسائل پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں۔ غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ اس سے فائدے کی بجائے' نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ (۲) منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ صرف ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔ (۳) اپنا مسئلہ مختصر' واضح اور کاغذ کی ایک جانب لکھیں۔ ایک خط میں دو سے زائد مسائل تحریر نہ کریں۔ (۴) کوئی عمل یا وظیفہ کریں تو نماز کی پابندی کا عہد کریں اور اپنے لیے دُعا کرنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دُعائے خیر کریں۔ (۵) صرف خصوصی وظائف کی اجازت درکار ہوگی۔ لفافے کو بند کرنے کے لیے زیادہ گوند نہ لگائیں' اس طرح خط پھٹ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط ہم تک نہیں پہنچتے لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ خط رجسٹری ڈاک سے بھیجے جائیں۔ جوابی لفافے پر مکمل پتا واضح اور خوشخط لکھا جائے۔ فوری جواب کے لیے اپنی ڈاک اِس پتے پر روانہ کریں۔

**ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110۔ آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی۔**

## ماہِ جمادی الاول

**عزیزو.....!**

یہ ماہِ جمادی الاول ہے۔ ہدایاتِ بزرگانِ دین میں مرقوم ہے کہ اِس ماہِ مبارک کے ایّامِ بیض (۱۴۔۱۵۔۱۶ کی تاریخ) کی شب نہایت مبارک ہیں۔ اگر اِن ایّام میں نمازِ تہجد کا خصوصی اہتمام ہوتو فرشتگانِ رحمت مقرر کردیئے جاتے ہیں جو اُس کی بخشش کے واسطے ہمہ وقت مشغولِ دُعا رہتے ہیں۔ بعد نمازِ تہجد ایک سو ایک بار مندرجہ ذیل دُعا کا وِرد حلِ مشکلات ہے۔ آپ ضرور پڑھیں۔

اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلکِ تُوتِی الْمُلکَ مَن تَشَآئُ وَتَنزِعُ الْمُلکَ مِمَّن تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَآءُ بِیَدِکَ الخیر اِنَّکَ عَلیٰ کُلِّ شَیءٍ قَدِیر تُولِجُ اللَّیلَ فِی النَّھَارِ وَتُولِجُ النَّھَارَ فِی اللَّیلِ وَتُخرِجُ الحَیَّ مِنَ المَیِّتِ وَتُخرِجُ المَیِّتَ مِنَ الحَیِّ وَتَرزُقُ مَن تَشَآءُ بِغَیرِ حِسَابٍ یَارَحمٰنَ الدُّنیَا وَالاٰخِرَةِ وَرَحِیمَھُمَا تُعطِی مِنھُمَا مَن تَشَآءُ وَتَمنَعُ مِنھُمَا مَن تَشَآءُ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاقضِ عَنِّی دَینِی



نسیم زہرہ، جھنگ۔

☆ بیٹی نسیم! خطوط مجھے جیسے ہی ملتے ہیں، میں فوراً جواب دیتا ہوں۔ آئندہ ایسا کرنا کہ خط کے ہمراہ جوابی لفافہ ضرور ارسال کرنا۔ میں تمہیں سہل سا وظیفہ دے رہا ہوں، نہایت پابندی کے ساتھ کرو، انشاءاللہ، ضرور کرم ہوگا۔

اَلَّذِینَ آمَنُوا وَتَطمَئِنَّ قُلُوبُھُم بِذِکرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکرِ اللّٰہِ تَطمَئِنُّ القُلُوب

نمازِ فجر اور عشاء کے بعد مندرجہ بالا آیت 99-99 بار پڑھو اول و آخر درود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ کر گھر کے تمام افراد پر ضرور دم کردیا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔

روزی خان، لاہور۔

o بابا جی! میری بڑی بھاوج نے آپ کے بارے میں بتایا، وہ بہت عرصے سے آپ سے رابطے میں ہیں اور آپ کے مشوروں سے انہیں بہت فائدہ ہے۔ بابا جی، میری شادی کو 3 سال ہو چکے ہیں۔ میرے شوہر اکلوتے ہیں لہٰذا سب کو ان کی اولاد کی بہت چاہ ہے۔ مجھے بھی جلدی ہے مگر میرے ہاں اولاد نہیں ہو رہی۔ تمام ٹیسٹ نارمل ہیں۔ آپ کے بارے میں سنا کہ آپ تعویذ دیتے ہیں۔ بابا جی، مجھے بھی تعویذ دے دیں تاکہ میں بھی جلد صحت مند بچے کی ماں بن جاؤں۔

☆ بیٹی روزی، اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تمہیں تفصیل سے بتایا جاسکے۔

نواز احمد، گھوٹکی۔

o بابا سائیں، اللہ آپ کو صحت دے۔ میں سرکاری محکمے میں انجینئر ہوں اور آج کل نہایت پسماندہ علاقے میں پوسٹنگ پر ہوں اور امید ہے کہ یہاں تقریباً 3 سال رہوں گا۔ بابا سائیں! فیملی ساری حیدرآباد میں ہے۔ بعض اوقات رابطہ بھی نہیں ہو پاتا۔ میری بیوی بیمار ہے۔ آپ برائے مہربانی ایسا عمل بتائیں جس کے کرنے سے میری پوسٹنگ واپس اپنے شہر میں ہوجائے۔ وظیفہ میری والدہ کریں گی۔

☆ بیٹے نواز، اللہ تمہاری مشکلات حل فرمائے۔ وظیفہ تحریر کر رہا ہوں، بہت سہل ہے۔ اگر یہ تمہاری بیوی خود کرے تو بہت اچھا ہے۔ کسی بھی وقت جب سہولت ہو، ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھے اور پانی پر دم کرکے پھر یہ پانی پی لے۔ انشاء اللہ، ضرور شفا ہوگی۔ بیٹے، تم بیوی پر سے حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

صفیہ شاہ۔ سیالکوٹ۔

o بابا جی، میں بہت پریشان ہوں، میری شادی میرے چچازاد سے ہوئی ہے۔ اس شادی میں دونوں خاندان راضی تھے پھر نکاح کے بعد جھگڑے شروع ہوگئے اور نکاح ٹوٹنے کی نوبت آگئی مگر ساری مخالفتوں کے بعد آخرکار شادی ہوگئی۔ شروع کے کچھ دن تو سکون رہا مگر بابا جی، اب روزانہ گھر میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ شوہر بھی بات بات پر پچھلی باتوں کے طعنے دیتے ہیں۔ میری عادت چپ رہنے کی ہے مگر اب میں اکثر بول جاتی ہوں جس سے حالات بہت خراب ہوتے ہیں۔ شوہر بالکل میری ساس کی زبان بولتے ہیں۔ بات بات پر کہتے ہیں کہ گھر سے نکل جاؤ، ہر نقصان کا الزام مجھے دیتے ہیں۔ بابا جی، ان سب باتوں کا اثر میرے بیٹے پر بہت ہو رہا ہے۔ وہ بہت ڈرا سہما رہتا ہے۔ میں اپنا گھر تباہ کرنا نہیں چاہتی مگر یہ رویئے اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہے۔ خدارا، میری مدد کریں۔

☆بیٹی صفیہ! پتا نہیں لوگوں کو کیا ہوتا جارہا ہے؟ بیوی کو تنگ کرتے ہوئے وہ یہ نہیں سوچتے کہ اثر ان کی اپنی اولاد پر بھی ہوگا۔ ایک اچھے مکمل اور محبتوں سے پر گھر کے بچے اور ایک فساد اور بدتمیزیوں میں پلنے والے بچے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک اپنی زندگی میں کامیاب اور دوسرا ناکام ہوتا ہے۔ جو والدین واقعی میں اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں وہ جھگڑے فساد سے دور رہتے ہیں۔ بہرحال بیٹی! ہمت اور مستقل مزاجی بہادروں کا ہتھیار ہے۔ تم اپنے آپ کو کمزور مت جانو۔ نماز پابندی سے پڑھو۔ کسی فضول بات کا جواب مت دو۔ اپنا زیادہ وقت اپنی اولاد کو دو اور معاملات میں خاموشی رکھو۔ ہر نماز کے بعد یا اللہ کی ایک تسبیح پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

نازلی۔ لندن۔

o بابا جی! میں ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کا جواب دینے کا انداز مجھے بہت پسند ہے۔ آپ اتنے سہل وظائف دیتے ہیں کہ ہم یہاں کی تیز رفتار زندگی میں بھی سہولت کے ساتھ کرلیتے ہیں۔ بابا جی! مسئلہ دراصل یہ ہے کہ میری دو بیٹیاں ہیں، پڑھی لکھی ہیں اور جاب کرتی ہیں۔ چھوٹی بیٹی کافی خوش شکل ہے لہٰذا اس کے رشتے بھی بہت ہیں۔ بڑی مجھے تو بہت پیاری ہے مگر لوگوں کی نظروں میں وہ معمولی ہے۔ رنگ بھی کافی دبتا ہوا ہے اس لیے اس کے لیے مناسب رشتہ نہیں۔ جو بھی رشتے ہیں، وہ صرف گرین کارڈ کے چکر میں ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے وظیفہ اور تعویذ ارسال کریں تاکہ اللہ کے کلام کی برکت سے یہ معاملہ احسن طریقے سے حل ہو۔ میرا بھائی دسمبر کے وسط میں کراچی آرہا ہے، وہ آپ سے رابطہ کرے گا۔ اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر رکھے۔

☆بیٹی نازلی! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ تمہارا یہ جملہ مجھے بہت اچھا لگا کہ بیٹی مجھے تو بہت پیاری ہے۔ بیٹیاں یقیناً بہت پیاری ہوتی ہیں۔ تم اس کے لیے دعا کرو جس کے ساتھ ماں کی دعائیں ہوں، وہ اولاد ہمیشہ خوش رہتی ہے۔ بہرحال میں تعویذ تیار کردوں گا۔ اپنے بھائی سے کہو وہ آنے سے پہلے دفتر میں ضرور مطلع کردیں۔ بیٹی! تم نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۂ طٰہٰ ضرور پڑھو اور دعا کرو۔ تعویذ ملنے کے بعد مجھے پھر حالات سے آگاہ کرنا۔

جمال آراء۔ کوئٹہ۔

☆بیٹی! تمہارا خط چھاپنا تمہارے حق میں بہتر نہیں لہٰذا صرف جواب دے رہا ہوں۔ اپنی غلطی مان لو کسی کے سامنے اعتراف کرنے کی ضرورت نہیں مگر اپنے آپ کو قائل کرلو کہ تمہارا رویہ غلط تھا اور پھر پورے خشوع و خضوع کے ساتھ معافی مانگو۔ بیٹی! معافی کے در ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ شرمندگی اور معافی کی طلب میں جو آنسو آنکھ سے گرتا ہے وہ اس کو بہت پسند ہے۔ جب اللہ تمہیں معاف کردے گا تو بندے بھی معاف کردیں گے۔ ہر نماز کے بعد 7 بار سورۂ توبہ پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

ڈاکٹر رضیہ۔ نوشہرہ۔

o بابا جی! اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ میں آج کل شدید ذہنی اذیت کا شکار ہوں۔ میں سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر ہوں۔ پچھلے ماہ مجھے پشاور سے یہاں بھیج دیا گیا۔ افسرانِ بالا سے اختلافات تو چل رہے تھے مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ یہ سب ہوجائے گا۔ بابا جی! میرے شوہر اور بچے پشاور میں ہیں اور میں ان سے اتنی دور پڑی ہوں۔ بہت سارے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ برائے مہربانی ایسا تعویذ دیں کہ میں واپس اپنے شہر چلی جاؤں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے نوکری چھوڑنی پڑے گی۔

☆بیٹی رضیہ!

یاحیی یا قیوم برحمتک استغیث



تمہاری نوکری ایسی ہے کہ تم نماز کی پابندی نہیں کر پاؤ گی لہٰذا بکثرت ورد میں مندرجہ بالا آیت رکھو۔ ہر وقت باوضو رہو اور اللہ سے مدد مانگتی رہو۔ وہ سب کی سنتا ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں جو پختہ ایمان اور یقین رکھتے ہیں۔ وظیفے کی مدت 2 ماہ ہے۔

رحمان خان۔ مردان۔

o بابا جی! آپ نے مجھے اس سے پہلے بھی جواب دیا تھا مگر میں وہ وظیفہ نہیں کرسکا۔ مجھے شدید قسم کا یرقان ہوگیا تھا۔ اب طبیعت بہتر ہے مگر کمزوری بے انتہا ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو وظیفہ اب شروع کردوں؟ میرے مالی مسائل اب بہت شدید ہوگئے ہیں۔

☆بیٹے رحمان! اللہ تمہیں شفا دے۔ دوسرا وظیفہ دے رہا ہوں، پابندی کے ساتھ کرو کیونکہ ابھی بیماری سے اٹھے ہو لہٰذا سہل وظیفہ کرو۔ نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۂ واقعہ پڑھو اور دعا کرو۔ اس کے علاوہ نہار منہ ایک مٹھی بھنے چنے ضرور کھالیا کرو، صحت کے لیے مفید ہیں۔ مجھے 3 ماہ بعد مطلع کرو۔

رفیع زمان۔ گوجرانوالہ۔

☆بیٹے رفیع! اگر تم سچے ہو تو تمہیں شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ معاملہ اللہ کے سپرد کرکے خاموش بیٹھے رہو۔ بے شک عزت مرد و عورت دونوں کی برابر اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ صرف نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد یاصمد کا بکثرت ورد کرو۔ کسی قسم کی بھی انتقامی کارروائی کی ضرورت نہیں۔ مجھے 21 دن بعد حالات سے مطلع کرو۔

حسن محمود۔ ملتان۔

o بابا جی! میری عمر 33 سال ہے اور میں ابھی تک بے روزگار ہوں۔ تعلیم بھی واجبی سی ہے لہٰذا نوکریاں بھی معمولی ملتی ہیں مگر بنا کسی وجہ کے ختم بھی ہوجاتی ہیں۔ میں پنج وقتہ نمازی ہوں۔ ہر برائی سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے والدین بھی میرے ساتھ ہی ہیں۔ ایک چھوٹی بہن اور ایک بڑا معذور بھائی بھی میری ہی ذمے داری ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ رزق اتنا تنگ کیوں ہے؟ وظیفہ ایسا عنایت کیجیے کہ میں آسانی سے کرسکوں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

☆بیٹے حسن! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ حالات کی سختی سے کبھی مت گھبرانا۔ بظاہر تو یہ پریشان کرتے ہیں مگر اصل میں یہ انسان کو بہت مضبوطی عطا کرتے ہیں۔ کوئی نوکری معمولی نہیں ہوتی، یہ کبھی مت سوچنا۔ جو کام بھی کرو، مکمل دیانت داری اور خلوص سے کرو۔ اچھے لوگوں کو کوئی نہیں چھوڑتا۔ نماز کے پابند ہو، بہت اچھی بات ہے۔ جس وقت سہولت سے پڑھ سکو 1200 بار پڑھو۔

یَاحُجتہُ القَائمُ

اول و آخر درود شریف 11-11 بار پھر دعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

نوید فاروقی۔ پشاور۔

o بابا جی! اللہ آپ کو صحت دے، زندگی دے۔ آپ اتنے آسان وظائف دیتے ہیں کہ ہر شخص وہ کرسکتا ہے ورنہ میں نے تو لوگوں کو اتنے مشکل وظائف بتاتے سنا ہے کہ اول تو وہ کرتا ہی بہت مشکل سے ہے اور اگر کسی طرح کر بھی لیں تو دہرانا ناممکن ہے۔ آپ کی وجہ سے بہت سے لوگ نماز کی پابندی کرنے لگے ہیں جن میں سے ایک میں بھی ہوں۔ بابا جی! میرا مسئلہ شدید نوعیت کا تو نہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ بنا بات بگڑے معاملہ حل ہوجائے۔ میری بچپن سے جہاں بات طے ہے، میں وہاں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ بابا جی! میرا تعلق فوج سے ہے اور میں ذات سے پٹھان ہوں مگر میں پٹھان لڑکی سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔ میری کوئی پسند بھی نہیں مگر

میں اپنی منگیتر سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اب اگر انکار کرتا ہوں تو حالات بہت خراب ہوں گے۔ ہمارے ہاں ایسے معاملات پر برسوں دشمنیاں چلتی ہیں اور مجھے یہ جہالت بالکل پسند نہیں۔ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔ لڑکی والے خود انکار کردیں۔ اگر آپ تعویذ بھیجنا چاہیں تو طریقہ بتادیں۔

☆ بیٹے نوید' آج کل کے تیز رفتار دور میں آسان اور سہل وظائف دینا ہی مناسب ہے تاکہ انسان کم از کم کرتو سکے۔ تم جو چاہتے ہو' تمہارا حق ہے۔ بدمزگی سے بھی بچنا چاہتے ہو' بڑوں کی ناراضی سے بھی خوف زدہ ہو۔ بیٹے' ناراضگی تو سہنی پڑے گی' باقی معاملات حد سے نہ گزریں' اس کے لیے میں تمہیں تعویذ تیار کردوں گا۔ مجھے اپنا پتا ارسال کرو۔ اس کے علاوہ جب جب یاد آئے' آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دم کرلیا کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

ماہم' لاہور۔ فرح' پنڈی۔ نسرین' پشاور۔

☆ بیٹی' تم سب کے مسائل کم وبیش ایک سے ہیں لہٰذا ایک ہی وظیفہ ارسال کررہا ہوں۔ نماز کی پابندی کے ساتھ کرو۔ بس یہ خیال رہے' نماز قضا نہ ہو۔ اس وظیفے کی ان تمام افراد کو اجازت ہے جن کے رشتوں میں رکاوٹ ہے۔

حَسبُنَا اللّٰہُ وَنِعمَ الوَکِیل

مندرجہ بالا آیت نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 1100-1100 بار پڑھو اول و آخر درود شریف 7-7 بار پھر دعا کرو۔ وظیفہ مکمل ہونے کے بعد حسب حیثیت رقم خیرات کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ مدت 41 روز ہے۔

صائمہ اقبال' واہ کینٹ۔

o بابا جی' آپ نے مجھے رزق میں برکت کے لیے وظیفہ دیا تھا' وہ میں نے بہت پابندی کے ساتھ مکمل کیا۔ درمیان میں صرف دو نمازیں قضا ہوئیں' وہ بھی اس لیے کہ خاندان میں موت ہوگئی تھی۔ حالات پہلے سے اب کچھ بہتر ہیں۔ مہینے کا خرچہ بھی نکل آیا اور کچھ قرض بھی ادا ہوا۔ اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں' کم ہے۔ آپ بتائیے کہ میں وظیفہ جاری رکھوں یا ترک کردوں؟ میں نے مدت پوری ہونے کے بعد بھی جاری رکھا ہوا ہے۔

☆ بیٹی صائمہ' اللہ تمہیں سکھی رکھے۔ وظیفہ پورے خشوع وخضوع کے ساتھ جاری رکھو' انشاء اللہ' حالات حق میں ہوں گے۔ بس کوشش کرو کہ اپنی ضرورتیں روک کر پہلے قرض ادا کرو۔ مجھے 41 دن بعد پھر مطلع کرو۔

لبنیٰ خٹک' نوشہرہ۔

o محترم بابا جی' خدا آپ کو خوش رکھے۔ (آمین!) بابا جی' میں اپنے مسائل لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے' آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ بابا جی' میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میں حد درجہ شرمیلی ہوں' مرد تو مرد' میں تو کسی عورت سے بھی کھل کر بات نہیں کرسکتی' خاص طور پر مردوں کے سامنے تو میری زبان بالکل گنگ ہوجاتی ہے۔ اگر ہمارے گھر کوئی رشتے دار آجائے تو میں اسے سلام تک نہیں کرسکتی بلکہ کمرے میں بند ہوجاتی ہوں۔ سب کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں مغرور ہوں حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں۔ بابا جی' میں بھی چاہتی ہوں کہ میں بھی دوسروں کی طرح سب سے کھل کر' ہنس کر بات کرسکوں لیکن میری کمزوری میری خواہش پر غالب آجاتی ہے۔ پلیز' بابا جی' آپ مجھے ایسا وظیفہ بتادیں کہ میں ہر ایک سے کھل کر بات کرسکوں۔ بابا جی' میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا قد بہت چھوٹا ہے جس کی وجہ سے میں احساس کمتری کا شکار ہوتی جارہی ہوں۔ پلیز بابا جی' آپ مجھے ایسا وظیفہ



بتادیں کہ میرا قد بڑھ جائے۔ بابا جی' میں آپ کو اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔

☆ بیٹی لبنیٰ' تم نے اپنی عمر تو لکھی ہی نہیں۔ بچیوں کا قد ایک خاص عمر تک بڑھتا ہے' اس کے بعد نہیں بڑھتا۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو تمہیں یہ احساس کمتری اور خوف اپنے اندر سے خود ختم کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اچھی کتب کا مطالعہ کرو۔ بزرگوں کی زندگی کے حالات پڑھو اور ان جیسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی کوشش کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت یاظاھر کا وِرد کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

الماس' کراچی۔

☆ بیٹی الماس' بھائی سے کہو' وظیفہ ترک کردے۔ صرف درود شریف بہت پڑھے' انشاء اللہ' جلد خیر ہوگی۔ تمہیں میں صرف یہی نصیحت کروں گا کہ نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ جن پڑھو لگاتار 14 دن۔ تمہارا خط مجھے ملا تھا اور میں نے جواب بھی دیا تھا۔ بہرحال مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

حمیدہ' کراچی۔

☆ بیٹی' تمہارا تفصیلی خط پڑھا' یہ جان کر دکھ ہوا کہ اس دور میں بھی لوگ ایسی خرافات پر یقین رکھتے ہیں۔ زندگی میں صرف دو چیزیں کام آتی ہیں' ایک عبادت' دوسری اس کی راہ میں صدقہ خیرات' باقی سب فضول ہے۔ تمہیں وظائف کی اجازت ہے۔ عشاء کے بعد کرو۔ اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگا کرو۔ صبح ورات 3-3 بار آیت الکرسی پڑھ کر ضرور اپنے اوپر اور شوہر کے اوپر دم کردیا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

ماجدہ۔ شجاح آباد۔

بیٹی ماجدہ' اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح یَا جَامِعُ کی پڑھو پھر اپنے والد پر ضرور دم کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

نریمان' کراچی۔

☆ بیٹی' وظیفہ نماز کی پابندی کے ساتھ کرنا بہت ضروری ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنی خواہش پوری تو کرنا چاہتے ہیں مگر نماز پابندی سے ادا نہیں کرتے۔ بہرحال تم نماز فجر اور عشاء کے بعد سورۃ کہف آیت 12۔ 99-99 بار پڑھو اور حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بھائی کو بھنے چنے بکثرت کھلاؤ' شوگر کے مرض میں بہت فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دن میں کسی بھی وقت 11 بار آیت الکرسی پڑھ کر پانی پر دم کرو اور یہ پانی بھائی کو پلا دو' افاقہ ہوگا۔ گھر میں کچھ نہیں ہے' یہ وہم دل سے نکال دو۔

دعا' حیدرآباد۔

☆ بیٹی دعا' اللہ تمہیں خوش رکھے۔ جو حالات تم نے تحریر کیے ہیں پھر تمہاری خواہش یہ بھی ہے کہ وظیفہ مختصر ہو تو بیٹی' بہتر یہی ہے کہ مجھ سے تعویذ منگوالو' اس کے لیے مجھے جوابی لفافہ خط کے ساتھ ارسال کرو۔ تمہارا مسئلہ بہت گمبھیر ہے لہٰذا جتنی دیر کروگی' اتنے ہی معاملات خراب ہوں گے۔

کمال دین' چکوال۔

o بابا جی' میں ایک عرصہ سے دبئی میں نوکری کررہا ہوں۔ اس بار جب وطن آیا تو کسی نے میرا پاسپورٹ چرا لیا۔ نئے پاسپورٹ پر ویزہ لگنا معطل ہے۔ برائے مہربانی کچھ ایسا پڑھنے کو دیں کہ میرا یہ مسئلہ حل ہوجائے۔ میں نہیں چاہتا کہ نئے پاسپورٹ پر ٹریجیکٹ ہوجاؤں۔

☆ بیٹے کمال' اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ہر نماز کے بعد 101 بار پڑھو نصر من اللہ فتح قریب پھر دعا کرو۔ اول و آخر درود شریف 7-7 بار پھر دعا کرو۔ انشاء اللہ' مشکل ضرور حل ہوگی۔

ثمرہ' کوٹ مومن۔

o بابا جی' میں بہت دکھی لڑکی ہوں' لوگ کہتے ہیں' میں خوش شکل بھی ہوں اور سگھڑ بھی۔ میرے والدین

نے مجھے اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز بھی دیا مگر پھر بھی میں اپنے شوہر کے دل میں جگہ نہیں بنا سکی۔ وہ میری طرف دیکھتے بھی نہیں۔ میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں مگر میں یہ سب کچھ آج تک کسی کو نہ بتا سکی۔ آپ میری مدد کریں' میرے والدین بھی بیمار رہتے ہیں' ان کے لیے بھی دعا کردیں۔

☆ بیٹی ثمرہ' اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بیٹی' بے شک تم بہت صبر اور ہمت سے وقت گزار رہی ہو۔ میں تمہارے لیے اور تمہارے والدین کے لیے دعا ضرور کروں گا۔ تم نماز فجر کی بعد سورۃ ملک 3 بار' سورۃ اخلاص 3 بار' سورۃ کافرون 3 بار اور آیت الکرسی 3 بار پڑھ کر تصور میں شوہر پر دم کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ معذوری کے دن شمار کر کے بعد میں پورے کرلینا۔

گل' سوات۔

o محترم بابا' اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے۔ میں بہت عرصہ سے آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں' سچ تو یہ ہے کہ آپ ہی کی وجہ سے میں نے نماز کی پابندی کی اور کوشش کرتی ہوں کہ حسد اور غیبت جیسی بری باتوں سے بچوں۔ بابا' میں یہ خط آپ کو ایک بہت پیچیدہ مسئلے کے لیے لکھ رہی ہوں' ہمارے ہاں شادی خاندان ہی میں ہوتی ہے۔ میں اپنی سگی پھوپھی کے گھر بیاہی ہوں' اسی طرح ان کی دوسری بہو چھوٹے بھائی کی بیٹی ہے۔ بابا' جب سے یہ شادی ہوئی ہے' گھر کا چین ختم ہوگیا ہے۔ بظاہر میری دیورانی بہت اچھی ہے مگر اس کے آنے کے بعد سے بھائیوں میں بہت دوریاں ہوگئی ہیں۔ میرا دیور اب والدین سے بھی اکھڑا اکھڑا رہتا ہے۔ ایک سرد سی جنگ محسوس ہوتی ہے۔ میرے تین بچے ہیں اور میرے میاں سرکاری ملازم ہیں جبکہ میری دیورانی کا ایک بیٹا ہے اور میرا دیور باہر کی کمپنی میں بہت اچھی جاب پر ہے۔ سسر بھی اپنا کام کرتے ہیں یعنی کوئی کسی کا محتاج نہیں لیکن اس کے باوجود ایک کھنچاؤ سا ہے۔ میری ساس بہت پریشان رہتی ہیں جس کی وجہ سے ان کا بی پی ہائی رہنے لگا ہے۔ یہ خط میں انہی کے کہنے پر آپ کو لکھ رہی ہوں' کہیں ایسا تو نہیں کہ میری دیورانی اپنے شوہر پر تعویذ کروا رہی ہو؟

☆ بیٹی گل' تمہارا طویل خط مختصر کر کے شائع کر رہا ہوں۔ اپنے انداز تحریر سے تم پڑھی لکھی لڑکی لگتی ہو۔ بجائے اس کے کہ تم اپنی ساس کو سمجھاؤ' تم ان کی ہاں میں ہاں ملا کر بہت غلط کر رہی ہو۔ آخر جو لڑکی تمہارے گھر بہو بن کر آئی ہے اور جس کو آئے ہوئے بہت عرصہ نہیں ہوا' وہ بیٹے کو والدین سے کیسے دور کرسکتی ہے اور اگر شادی کو بہت عرصہ بھی گزر جائے' تب بھی کوئی لڑکی ایسا نہیں کرسکتی۔ یہ بیٹے کی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ توازن نہیں رکھ پاتا لیکن وہ اپنا سارا بوجھ بیوی پر ڈال کر بری الذمہ ہوجاتا ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارے دیور کو نوکری پر کوئی دشواری ہو' صحت بہت اچھی نہ ہو اور بھی کئی مسائل ہوسکتے ہیں۔ جس شخص نے ایک نئی زندگی شروع کی ہے' اس کو بڑوں کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم لوگوں کو چاہیے کہ ان دونوں کو کچھ وقت دو' ان سے پوچھو کوئی پریشانی تو نہیں؟ بڑے ہونے کے ناتے کچھ تم آگے بڑھو' وہ بھی ضرور اپنا رویہ درست کریں گے۔ میں اپنے تمام پڑھنے والوں کو ان سطور کے ذریعے نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ رشتوں کو اتنا ناپائیدار مت جانیں کہ وہ ذرا سی میں ٹوٹ جائیں گے۔ منفی خیالات کے بجائے' مثبت سوچ رکھنا ہی عین عبادت ہے۔ اپنی تربیت' اپنے رشتے پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ صرف پابندی سے نماز ادا کریں اور اپنا وقت اچھے کاموں میں صرف کریں۔ ان باتوں میں پڑنے کے بجائے اگر اپنے اردگرد موجود لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں تو ہمارا معاشرہ مکمل اسلامی معاشرہ بن جائے۔

☆☆

یاد کے گہرے ساگر میں

# منیر نیازی

شعری سلطنت کا مغرور شہزادہ

عکاشہ سحر

منیر نیازی 9 اپریل 1928ء کو خان پور ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے تھے..... ابتدائی تعلیم ہوشیار پور میں ہی حاصل کی تھی جب کہ میٹرک جالندھر سے کیا تھا..... بہت آزاد منش اور سیلانی طبیعت کے مالک تھے' اِسی باعث جالندھر' سری نگر' بہاولپور اور لاہور کے کالجز میں پڑھتے ہوئے بی اے تک تعلیم پائی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے ساہیوال آ گئے تھے اور وہاں اُن کی دوستی مجید امجد سے ہو گئی تھی۔ آپ اَدب کا ذوق رکھتے ہیں تو یہ ناممکن ہے کہ مجید امجد کے نام اور کام (شاعری) سے ناواقف ہوں' اِسی طرح منیر نیازی نے بھی اُردو اور پنجابی شاعری میں ایسے قابلِ قدر اضافے کیے جن کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ ناقدینِ فن نے اُن کی شاعری سے نرگسیت' ایمائیت' دیومالائی علامات اور اُن کے پسِ پردہ محرکات کو دریافت کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ تنقیدی دبستانوں اور تنقیدی اصطلاحوں کی ذیل میں نہیں آیا۔ ''تیز ہوا اور تنہا پھول'' کے نام سے شعری سفر کا آغاز کرنے والے اس لہجے نے نہ صرف سب کو چونکا دیا بلکہ حیرتوں میں مبتلا کر دیا۔ منیر نیازی کا لہجہ نہایت منفرد تھا انہوں نے اپنی مثال شعری فضا اور بے مثال شعری نظام تخلیق کیا' جو اُن کی نہایت ہی منفرد شناخت کا باعث بنا تھا' اِس پر مستزاد اُن کا اختصار' جس نے لفظوں میں نئے معانی ہی نہیں انوکھے بھید بھی بھر دیئے۔

1950ء میں منیر نیازی نے ایک ہفت روزہ ادبی رسالے ''سات رنگ'' نکالا تھا جس میں منٹو سمیت بہت سے دیگر بڑے ادیبوں اور شعراء کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں مگر افسوس کہ..... ''سات رنگ'' تقریباً دو برس کے قریب قریب شائع ہوا تھا اور اِس کے بعد آپ نے ''ارژنگ'' کے نام سے مکتبہ قائم کیا اور کچھ معیاری اور نادر کتب شائع کیں' مگر اُن کے بہت سے خواب دُھندلا کے رہ گئے تھے۔

1953ء میں منیر نیازی لاہور آ گئے تھے اور

کالم نگاری شروع کی تھی جس دور میں آپ نے زمیندار' ملت اور مغربی پاکستان وغیرہ میں کالم نگاری شروع کی تھی اِس زمانے میں ریاض شاہد' علی سفیان آفاقی اور ظہورالحسن ڈار اُن کے ساتھی کالم نگار قرار پائے تھے..... اور پھر دوست احباب انہیں فلم نگری میں لے گئے تھے' جہاں آپ نے شہید' سسرال' اور تیرے شہر میں جیسی فلموں کے مقبولِ عام گیت لکھے تھے:

1۔ اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو..... (فلم "شہید")

2۔ جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا..... (فلم "سسرال")

3۔ جس نے میرے دل کو درد دیا اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں..... (فلم "سسرال")

4۔ کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آجاتے ہیں..... (فلم "تیرے شہر میں")

5۔ زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا..... (فلم "خریدار")

6۔ آگئی یاد شام ڈھلتے ہی..... (فلم "لہو پکارے گا")

اگرچہ آپ فلمی گیتوں کے حوالے سے بہت مشہور ہوئے تھے مگر فلم والوں سے اُن کی طبیعت نہیں ملی تھی لیکن انہوں نے اُن لوگوں کے درمیان اپنی شخصیت اور شناخت اپنے اِس شعر کے مطابق قائم رکھی تھی

مجھ میں ہی کچھ کمی تھی کہ بہتر میں ان سے تھا
میں شہر میں کسی کے برابر نہیں رہا

شہرِ سخن کے اِس شہزادے نے اپنے ناز و انداز سے جہاں ایک زمانے کو متوجہ اور متاثر کیا' وہاں حد درجہ خود پسندی کے باعث' وہ شہر کے باسیوں سے اکتائے ہوئے رہتے تھے' مگر لوگ پھر بھی اِس شہزادے کے ناز اُٹھاتے تھے۔

1970ء میں منیر نیازی نے اپنا اشاعتی ادارہ "المثال" قائم کیا تھا' لیکن اُن کا شاعرانہ مزاج کاروباری تقاضے پورے نہ کر سکا۔ یوں انہیں "المثال" بھی بند کرنا پڑا اور پھر وہ ٹی وی کے مختلف پروگرامز کی مشاورت کمیٹی میں اعزازی طور پر شامل رہے اور شعبہ اسکرپٹ بھی دیکھتے رہے۔

منیر نیازی کے شعری سفر میں یہ مجموعہ کلام مقبولِ عام ہوئے۔ تیز ہوا اور تنہا پھول، ماہِ منیر، جنگل میں دھنک، دشمنوں کے درمیان شام، ساعت سیار، چھ رنگین دروازے، پہلی بات ہی آخری تھی، ایک دعا جو میں بھول گیا تھا، آغاز زمستان میں دوبارہ، سفید دن کی ہوا اور سیاہ شب کا سمندر، اس بے وفا کا شہر، ایک مسلسل، سفر دی رات، چار چپ چیزاں اور رستہ دسن والے تارے..... جب کہ پنجابی ڈرامہ "قصہ دو بھراواں دا" بھی خاصے کی چیز ہے۔

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خاموشی سے گزر جائیں ہم تو کیا
کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آجاتے ہیں
اپنے اپنے غم کے فسانے ہمیں سنانے آجاتے ہیں

☆

نظمیں

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں' کچھ باتیں ان کہی رہنے دو
جس نے مرے دل کو درد دیا اِس شکل کو میں نے بھلایا نہیں
جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا' برسات' صحرا۔

منیر نیازی نے دو شادیاں کیں مگر وہ اولاد کی نعمت سے محروم رہے اور پھر مورخہ 26 دسمبر 2006ء والے روز شعری سلطنت کے اس مغرور شہزادے کی شمعِ حیات گُل ہوگئی تھی۔

.....☆☆.....



عائشہ عارف

# آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجا سکتے ہیں

## انتخاب

### تعلق اور تقرب

تلاشِ حقیقت' تلاشِ حق آگاہ' تلاشِ صاحبِ دلاں' تلاشِ امام زماں یا تلاشِ محرمِ اسرار کسی جغرافیائی سفر کا نام نہیں۔ سندباد کے سفر اور متلاشی حق کے سفر میں بڑا فرق ہے۔ حقیقت کے سفر کے لیے پہلے اپنے آپ میں اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنا چاہیے۔ آئینہء دل جتنا مصفی ہوگا' اتنا ہی آسانی سے جلوۂ حق قبول کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کا قرب' پیشانی کو سجدے میں رکھ کر حاصل ہوتا ہے۔ سجدہ یہاں ہے' تعلق وہاں! درود شریف یہاں ہے' منظوری وہاں! حاصل یہ کہ پہلے اپنی ہی اصلاح ہے۔ خود کو اس قابل بنانا ہے کہ جلوے کا مفہوم سمجھ آسکے۔ بوجہل کو دیدار سے قرب حاصل نہیں ہوسکتا۔ حضرت اویس قرنیؓ کو تقرب مکانی کے بغیر ہی دیدار حاصل ہوتا ہے۔ مخلصین کو ابتدائے سفر میں ہی منزلوں کا سلام آتا ہے۔

واصف علی واصف کی تصنیف "کرن کرن سوچ" سے اقتباس

انتخاب: عبدالعزیز جی آ۔ چکوال

### آزمائش

دین اخلاص کا نام ہے' محبت کا نام ہے۔ جیسے رگوں میں خون بھرا ہوتا ہے اور وہ ہمیں توانا رکھتا ہے۔ ویسے ہی ہمارے اندر دین کی حُب موجود ہوتی ہے جو ہمیں گمراہ نہیں ہونے دیتی۔ یہ حُب سکون دیتی ہے' دلی سکون! نبی دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم ہو گئے۔ آنکھ کھولی تو ماں نہ رہی۔ پیار و محبت لٹانے والے دادا بھی وفات پا گئے مگر شکر کیا' ہمیشہ شکر..... راضی بہ رضا رہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبرؐ ہیں۔ محبوبِ خدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیب ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے آزمائش اُن پر بھی ڈالی ہے۔ تو ہم تو اُن کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہیں۔ وہ والئی دو جہاں' "شعب ابی طالب" جیسی تنگ گھاٹی میں تین سال تک محصور رہے۔ زبان پر اُف تک نہ آئی۔ پیٹ پر پتھر باندھے مگر لبوں پر شکوہ نہیں' شکایت نہیں۔ قریشِ مکہ نے جینا مشکل کر دیا۔ پنڈلیاں لہولہان کر دیں۔ راہوں میں کانٹے بچھا دیے۔ قتل کے منصوبے بنائے مگر آپ مسکراتے رہے اور مکہ فتح ہو گیا تو سب کو معاف فرما دیا۔ چچا کا کلیجہ چبانے والی کو معاف کیا پنڈلیاں لہولہان کرنے والوں کو معاف کیا۔ اخلاص اسی کا نام ہے۔ ایمان کی روشنی نے پھر ہر چیز کی حقیقت واضح کر دی۔ اچھے برے کی تمیز ہو گئی۔ حق و باطل کی پہچان ہونے لگی۔ یہی

طریقہ ہے مرتے دم تک خود کو ایمان پر قائم رکھنے کا! ایمان کی آزمائش تو ہوتی ہے۔ جو اِس آزمائش پر پورا اترے، وہی سچا مسلمان!

ربیعہ منیر کی تصنیف ''میں اور امام بی بی'' سے اقتباس

انتخاب: سیدہ افشاں سحر۔ کراچی

## دریافت

انڈونیشیا کے سابق صدر سوئیکارنو کا قول ہے کہ 30 بہاروں کے بعد رَبر کا درخت اور بنتِ حوا کسی مصرف کے نہیں رہتے۔ جب کہ مرد کسی عمر میں حُسن سے مامون نہیں۔ ایسے مقولے کی تردید یا تائید ہمارے جیسے کا کام نہیں۔ سوئیکارنو تو بزرگِ مردم دیدہ و زن گزیدہ ہونے کے علاوہ صدارت کے صدمے بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم تو ان سے بھی محروم ہیں پھر یہ چھوٹے منہ کو بڑی بات زیب بھی نہیں دیتی۔ رَبر کے بارے میں ہم ابھی صرف اتنا دریافت کر پائے ہیں کہ غلطیوں کو مٹانے کے لیے خاصی کارآمد چیز ہے۔ رہی صنف نازک، سو اپنے محتاط و محدود مشاہدے کی بنا پر ہم کوئی خوب صورت جھوٹ نہیں بول سکتے۔ شیرنی کو کچھار میں کلیلیں کرتے دیکھنا اور بات ہے اور سرکس کے پنجرے میں بینڈ کی دُھن پر لوٹیں لگاتے دیکھنا اور بات! البتہ اپنے ہم جنسوں کے بارے میں بہت سے بہت کہہ سکتے ہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سائیں سائیں کرتا ریگستان جو راتوں رات جیتی جاگتی زمین کو نگلتا چلا جاتا ہے۔ لق و دق صحرائے اعظم جو سن رسیدہ سینوں میں دمادم پھیلتا رہتا ہے، وہ کسی بھی لمحے نمودار ہوسکتا ہے کہ دل آنکھ سے پہلے بوڑھے ہوجایا کرتے ہیں۔ اس ہُو کے صحرا میں گونج کے سوا کوئی صدا، کوئی ندا سنائی نہیں دیتی اور کیکٹس (Cactus) کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ مرزا اِس بنجر، بے رس، بے رنگ، بے اُمنگ دھرتی کو No Woman's Land کہتے ہیں جس کی ملی جلی سرحدیں صرف بائی نوکل سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ بڑھتے ہوئے سایوں اور بھینی بھینی یادوں کی سرزمین ہے جس کے باسی پیاس کو ترستے ہیں اور بے پیاس پیتے ہیں کہ انہیں ''اِس کا بھی مزہ یاد ہے، اُس کا بھی مزہ یاد!''

مشتاق احمد یوسفی کی تصنیف ''خاکم بدھن'' سے اقتباس

انتخاب: شرجیل اقدس۔ جیکب آباد

## دروغ گوئی

دراصل یہ زمانہ ''بھوت لکھاریوں'' کا ہے۔ (اُس شخص کو جو کسی دوسرے شخص کے لیے کتاب لکھے، اُسے انگریزی میں GHOST WRITER اور اردو میں ''بھوت لکھاری'' کہتے ہیں) بڑے بڑے سیاست دانوں، ایکٹروں، ایکٹریسوں، رئیسوں، صنعت کاروں کی خودنوشتیں دراصل ''بھوت نوشتیں'' ہوتی ہیں یعنی کسی بے مایہ بھاڑے کے مصنف کی جُگالی کا نتیجہ اور مجھے اُن قلم فروشوں سے ازلی بیر ہے۔ بے شک میں کوئی چرچل یا ہیمنگ رے بلکہ مس لیتھلین ولنسر بھی نہیں، بلکہ مس ولنسر کا تو ہم جنس بھی نہیں ہوں، تاہم بخدا، اِس کتاب کا ہر لفظ میں نے خود سوچا اور لکھا ہے۔ اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ، یہ مجھ پر اور میرے خدا پر چھوڑ دیں! جیسا کہ میں اشارہ کر چکا ہوں، نوے فیصد خودنوشتیں نوے فیصد افسانہ ہوتی ہیں اور صرف دس فیصد حقیقت! اگر ان خودنوشتوں کے ہیرو اپنے متعلق سب کچھ سچ سچ لکھ دیں تو ان کی سکونت کے لیے امریکا بھر میں کافی جیل نہ مل سکیں گے۔ دروغ گوئی امریکا کی بڑی صنعتوں میں سے ایک ہے۔

کرنل محمد خان کی تصنیف ''بدیسی مزاح'' سے اقتباس

انتخاب: عمران ہارون چھوٹانی۔ کراچی



# انمول خزانہ

## قابلِ غور باتیں

☆ قدم قدم پر معاشرے کی طرف دیکھنے والا درحقیقت کچھ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

☆ ہم ساری زندگی وہ کرتے رہتے ہیں جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے۔ وہ نہیں کرتے جو کرنا چاہیے۔

☆ قوانین اخلاقیات کی موت سے جنم لیتے ہیں۔

☆ جانوروں پر ظلم ہمیں اُن سے بڑا جانور بنا دیتا ہے۔

☆ جو چیز ایک دم مانگ پیدا کردے، اُس کی عمر انتہائی قلیل ہوتی ہے۔

☆ چھینی ہوئی چیز میں خوف چھپا ہوتا ہے۔

☆ رشتے دار اس لیے رشتے دار نہیں کہ وہ ہمارے کام آنے کے لیے بے قرار ہیں بلکہ ان کی مجبوری تو یہ ہے کہ وہ ہمارے رشتے دار ہیں۔

مرسلہ: کرن شبیر۔ کراچی

## نمکین باتیں

◀ عورت کی زبان قابو میں نہیں رہتی اور مرد کی؟..... آنکھ۔

◀ آج میں نے اُسے ڈرے بغیر صاف صاف کہہ دیا۔ ''کل سے میرے گھر نہ آنا۔'' بھلا کیسے؟..... اپنی ملازمہ کو۔

◀ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولے، بتایئے کیا..... انہیں کبھی دھوبھی لیا کرو، گندی!

◀ ماں کے پیر تلے جنت اور بیوی کے پیروں تلے؟..... عزت ہے۔

◀ محبت کرنے والی لڑکی شک میں مبتلا رہتی ہے اور مرد؟..... قرض میں۔

◀ پتھر دل انسان کو کیسے زیر کیا جاتا ہے؟..... اینٹ مار کے۔

مرسلہ: شعیب محی الدین۔ لاہور

## سنہری باتیں

☆ دوسروں کے سامنے اپنی تکالیف بیان کرنے سے پہلے سوچ لو کہ ان میں سے آدھے ایسے ہیں جنہیں تمہارے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں اور آدھے تمہاری تکالیف کو سن کر خوشی پاتے ہیں۔

☆ ہم دنیا کے بارے میں غلط اندازہ لگاتے ہیں اور بعد میں کہتے ہیں کہ اس نے ہمیں دھوکا دیا۔

☆ محبت مکمل زندگی ہے۔ اس کا نشہ انسان کو تمام عمر مدہوش رکھتا ہے۔

☆ دشمن کے حسن سلوک پر مت اعتماد کرو کیونکہ پانی کو جتنا اُبال دیا جائے، وہ آگ بجھا دیتا ہے۔

☆ غلام اگر سو رہا ہو تو اُسے مت جگاؤ۔ ہوسکتا ہے، وہ آزادی کا خواب دیکھ رہا ہو۔

☆ اپنی چاہت کی خاطر ہر کسی کے پیچھے مت دوڑو۔ خود کو ایسا بناؤ کہ تمہاری سیرت اور اخلاق مقناطیس کی طرح کشش رکھے۔

☆ دل ایک آئینہ ہے۔ اگر صاف ہو تو اس میں خدا بھی دکھائی دیتا ہے۔

☆ ضمیر کی عدالت سے بڑھ کر کوئی عدالت نہیں۔

☆ بوڑھے کا مشورہ، جوان کی قوتِ بازو سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔

☆ عقل مند اس وقت تک نہیں بولتا جب تک

خاموش نہیں ہو جاتی۔

مرسلہ: ملک صفدر عباس اعوان۔ خانیوال

## انمول موتی

◉ کسی دوست کو بار بار آزمائش میں مت ڈالو۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کی آزمائش پر پورا نہ اتر سکے اور آپ ایک اچھے دوست سے محروم ہو جائیں۔

◉ علم کی محبت اور استاد کی عزت کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

◉ خوش اخلاقی سے کچھ خرچ نہیں ہوتا' بلکہ یہ آپ کا وقار بڑھا دیتی ہے۔

◉ تمام لوگوں سے زیادہ حسد کرنے والے' رشتے دار اور ہمسائے ہوتے ہیں۔

◉ مضبوط ایمان' ہر مشکل کو آسان بنا دیتا ہے۔

مرسلہ: ثانیہ بھٹی۔ سیالکوٹ

## یاد رکھنے والی باتیں

☆ کوشش تو وہ ہے جو خدا کی اطاعت کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو عشقِ رسولؐ کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو نماز کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو نیکی کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو ظلم کو روکنے کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو بڑوں کے ادب کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو غریبوں کی مدد کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو سچی محبت کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو ایک سچے دوست کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو اچھی محفل میں بیٹھنے کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو بری محفل سے بچنے کے لیے کی جائے۔

☆ کوشش ہی تو وہ کشتی ہے جو منزل تک پہنچاتی ہے۔

فرید عالم۔ کراچی

## کام کی باتیں

⇦ بہت سے سُندر سپنے رات کو سنی ہوئی کہانیوں کی طرح بھول جاتے ہیں اور بہت سے خواب کہانی کے کسی ڈراؤنے کردار کی طرح یاد رہتے ہیں۔

⇦ خواب اتنے نہ دیکھو کہ اگر ان کی تعبیر ملے تو جیون کم پڑ جائے۔

⇦ خواہشوں کے سمندر میں خوابوں کے جزیرے ساحل سے دور لے جا سکتے ہیں۔

⇦ کسی کے عشق میں ایسے رات' رات بھر جاگنے سے فائدہ کہ پھر دن بھر بستر کی سلوٹوں میں اضافہ ہوتا رہے۔

⇦ سب کچھ دکھائی دے رہا ہے مجھے اپنی دیکھنے والی آنکھوں کے علاوہ۔

⇦ رات بھر سپنے دیکھتے رہتے ہیں بے سود اور پھر جب "اپنے" نظر آئیں تو آنکھ کھل جاتی ہے۔

⇦ ہم خواب کی تعبیروں کے عوض اپنی نیندیں بیچ دیتے ہیں۔

مرسلہ: یاسمین شمعون۔ کراچی

# ذرا مسکرائیے

## ندامت

بیگم آفتاب نے کہا: "تمہارے دوست کی بیوی فوت ہو گئی ہے اور تم تعزیت کے لیے بھی نہیں گئے؟"

پروفیسر آفتاب نے افسردگی سے کہا: "مجھے بار بار تعزیت کے لیے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں اُس کی تین بیویوں کے مرنے پر تین مرتبہ جا چکا ہوں جب کہ میں نے اُسے ایک مرتبہ بھی نہیں بلایا۔"

مرسلہ: عمران علی۔ کوئٹہ

## دولت

اسرائیلی حکومت نے اعلان کیا جو کوئی زندہ عرب فوجی کو اس کے حوالے کرے گا' اسے محکمۂ دفاع فی عرب فوجی بیس ہزار ڈالر ز ادا کرے گا۔

دو پروفیسر فوجیوں کی تلاش میں نکلے۔ ایک نخلستان میں سستانے بیٹھے تو نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دونوں نے دیکھا کہ 200 عرب فوجیوں نے اُن کو گھیر رکھا ہے۔ ایک یہودی پروفیسر خوشی سے چیخ پڑا۔ "اتنی دولت..... اتنی دولت!"

دوسرا یہودی پروفیسر کچھ نہ بولا کیونکہ وہ اپنے سامنے اتنی ساری دولت دیکھ کر خوشی سے مر گیا تھا۔

مرسلہ: سعد گھلو۔ حیدر آباد

## شرافت

ایک بڑے پروفیسر نے اپنے ملازم سے پوچھا: "کیوں میاں! تمہارے والد صاحب کیا کام کرتے تھے؟"

"جی! وہ جوتے بناتے تھے۔" ملازم نے ادب سے جواب دیا۔

پوفیسر موڈ میں تھے' کہنے لگے۔ "تو انہوں نے تمہیں موچی کیوں نہ بنا دیا؟"

ملازم بے چارہ بہت شرمندہ ہوا لیکن چپکا رہا۔ کچھ دیر ٹھہر کر اس نے یہی سوال پروفیسر سے کیا۔

"جناب! آپ کے والد صاحب کیا کام کرتے تھے؟"

پروفیسر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "وہ شریف آدمی تھے۔"

اس پر ملازم نے کہا: "تو پھر انہوں نے آپ کو شریف آدمی کیوں نہ بنا دیا؟"

مرسلہ: نواز۔ کراچی

## آسانی

ایک دیہاتی شہر آیا اور حلوائی کی دکان سے پانچ روپے کی برفی مانگی۔ دکاندار نے برفی کم تولتے ہوئے تھوڑی سی برفی دیہاتی کو دے دی۔ دیہاتی بولا۔ "یہ کیا' یہ تو بہت کم برفی ہے۔"

دکاندار: "کوئی بات نہیں' کھانے میں آسانی رہے گی۔"

دیہاتی بہت چالاک تھا۔ اُس نے بھی ایک روپیہ دکاندار کو دے دیا۔

دکاندار بولا۔ "یہ کیا' تم نے تو پانچ روپے کی برفی مانگی تھی۔ ایک روپیہ دے رہے ہو!"

دیہاتی بولا: "کوئی بات نہیں' گننے میں آسانی رہے گی۔"

مرسلہ: محمد عاقل۔ نواب شاہ

## علم

ڈاکٹر نے لڑکے سے کہا۔ "میں نے تمہارے والد صاحب کو بیماریوں کے بارے میں جو چند کتابیں پڑھنے کو دی تھیں' کیا ان سے انہیں اپنی بیماری کو سمجھنے میں مدد ملی؟"

لڑکا: "جی ہاں! بہت زیادہ۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے پہلے ان کا خیال تھا کہ انہیں ایک بیماری ہے لیکن کتابیں پڑھنے کے بعد انہیں علم ہوا کہ وہ

اٹھارہ بیماریوں میں مبتلا ہیں۔"

مرسلہ: بربناس۔کراچی

## انگور

سیاح، دکاندار سے: "یہ کیا ہیں؟"

دکاندار: "سیب ہیں۔"

"اتنے چھوٹے سیب۔ ہمارے ہاں تو سیب سیر سیر بھر کا ہے۔" پھر اس نے کیلے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کیا ہیں؟"

دکاندار نے بتایا کہ یہ کیلے ہیں۔

سیاح نے کہا: "کیلے ایسے ہوتے ہیں؟ ہمارے ہاں تو پانچ پانچ فٹ کے کیلے ہوتے ہیں۔" پھر اس نے تربوز کی طرف اشارہ کیا تو دکاندار جھنجھلا کر بولا۔ "یہ انگور ہیں جناب! انگور!"

مرسلہ: عبداللہ اقبال۔کراچی

## گدھا

ایک صاحب گھبرائے ہوئے گھر آئے اور بیوی سے بولے: "بیگم! میں دفتر سے گھر آرہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا....."

اتنے میں اُن کی ایک بچی بول اُٹھی۔ "امی! ثمینہ نے میری گڑیا توڑ دی۔"

"اچھا بیٹی! ہم تمہیں دوسرے لے دیں گے۔"

شوہر نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ہاں بیگم! میں کہہ رہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا....."

اتنے میں اُن کا لڑکا بول اٹھا۔ "امی! امی! مجھے گڈو نے مارا ہے۔"

بیوی چلا کر بولی۔ "بھئی، خدا کے واسطے، چپ ہو جاؤ۔ مجھے گدھے کی بات سننے دو۔"

مرسلہ: محمد عثمان۔لاہور

## نہلے پہ دھلا

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: "دال پتلی پکایا کرو۔ مہنگائی ہوگئی ہے۔"

دوسرے روز کھانا کھاتے ہوئے دال کی جانب بکھ کر اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ "میں نے دال پتلی پکانے کو کہا تھا، پانی کو تڑکا لگانے کے لیے نہیں کہا تھا۔"

مرسلہ: خاور اقبال۔اسلام آباد

# بزمِ آرائی

☆

جس کا عکس تک گنوا دیا
کبھی رُوبرو تھی میرے لیے
جسے نقش نقش بچھا دیا
کبھی چار سُو تھی میرے لیے
جو حد ہو اِس سے بھی دور ہے
کبھی کوبکو تھی میرے لیے
جو تپش ہے موجِ سراب کی
کبھی آب جو تھی میرے لیے
جسے "آپ" لکھتا ہوں خط میں اَب
کبھی صرف "تو" تھی میرے لیے
(محسن نقوی)

حسنِ انتخاب: قرۃ العین زینب۔ملتان

☆

اُس کی آنکھوں میں محبت کا ستارہ ہو گا
ایک دن آئے گا، وہ شخص ہمارا ہو گا
تم جہاں میرے لیے سیپیاں چنتی ہو گی
وہ کسی اور ہی دنیا کا کنارہ ہو گا
زندگی! اب کے مرا نام نہ شامل کرنا
گر یہ طے ہے کہ یہی کھیل دوبارہ ہو گا
جس کے ہونے سے مری سانس چلا کرتی تھی
کس طرح اس کے بغیر اپنا گزارہ ہو گا



☆

کون روتا ہے یہاں رات کے سناٹوں میں
میرے جیسا ہی کوئی ہجر کا مارا ہو گا
جو مری روح میں بادل سے گرجتے ہیں وصی
اُس نے سینے میں کوئی درد اتارا ہو گا
کام مشکل ہے مگر جیت ہی لوں گا اُس کو
میرے مولا کا وصی جونہی اشارہ ہو گا
(سید وصی شاہ)

حسنِ انتخاب: شانی خامان۔کراچی

☆

ہر قدم پرنت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ
کس لیے کیجئے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
اب تو مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ
شاعر اُن کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں، سنبھل جاتے ہیں لوگ
شمع کی مانند اہلِ انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ
(حمایت علی شاعر)

حسنِ انتخاب: سدرہ انور علی۔جھنگ

☆

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں، میرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں، مجھے ایک شام ادھار دو
مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں میرے خدوخال
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو، میرے سارے رنگ اتار دو
کسی اور کو میرے حال سے نہ غرض ہے نہ کوئی واسطہ
میں بکھر گیا ہوں، سمیٹ لو، میں بگڑ گیا ہوں، سنوار دو
تمہیں صبح کیسی لگی میرے خواہشوں کے دیار کی
جو بھلی لگی تو یہیں رہو، اِسے چاہتوں سے نکھار دو
(اعتبار ساجد)

حسنِ انتخاب: صدف آصف۔کراچی

☆

سارے لہجے ترے، بے زباں ایک میں
اس بھرے شہر میں رائیگاں ایک میں
وصل کے شہر کی روشنی ایک تو
ہجر کے دشت میں کارواں ایک میں
بجلیوں سے بھری بارشیں زور پر
اپنی بستی میں کچا مکاں ایک میں
مجھ کو فارغ دنوں کی امانت سمجھ
بھولی بسری ہوئی داستاں ایک میں
رونقیں، شور، میلے، جھمیلے ترے
اپنی تنہائی کا رازداں ایک میں
ایک میں اپنی ہی زندگی کا بھرم
اپنی ہی موت پر نوحہ خواں ایک میں
وہ نہیں ہے تو محسن یہ مت سوچنا
اب بھٹکتا پھروں گا کہاں ایک میں
(محسن نقوی)

حسنِ انتخاب: اشعر جواد۔کراچی

☆

مجھ سے بچھڑ کے خوش رہتے ہو
میری طرح تم بھی جھوٹے ہو
ایک دیوار پر چاند ٹکا تھا
میں یہ سمجھا، تم بیٹھے ہو
اُجلے اُجلے پھول کھلے تھے
بالکل جیسے تم ہنستے ہو
مجھ کو شام بتا دیتی ہے
تم کیسے کپڑے پہنے ہو
دل کا حال پڑھا چہرے سے
ساحل سے لہریں گنتے ہو

تم تنہا دنیا سے لڑو گے
بچوں سی باتیں کرتے ہو!
(ڈاکٹر بشیر بدر)

حسنِ انتخاب: فیصل عزیز۔ حیدر آباد

## نادان

میں جانتا ہوں
تم اپنی مجبوریوں کے پیشِ نظر
محبت کے راستوں پر
نہ چل سکو گی
میں مانتا ہوں
کہ میرے خوابوں کے سلسلے
تم سے ٹوٹنا ہیں
مجھے خبر ہے
کہ میری آنکھیں بھی
رائیگاں نیند سو رہی ہیں
مگر یہ سب جانتے ہوئے بھی
تمہیں میں اپنا سمجھ رہا ہوں
میں کتنا نادان بن رہا ہوں

حسنِ انتخاب: نعیم آکاش۔ حیدر آباد

## دلاسا

ہم اپنے دل کو تھپکتے ہیں
اور سوچتے ہیں
کہ تتلیوں کے پروں پر کہانیاں لکھ کر
بچائیں کیسے انہیں دھوپ کی تمازت سے؟
(نوشی گیلانی)

حسنِ انتخاب: مینا۔ اسلام آباد

## مکاں اور مکیں

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں
اپنے نام کی تختی والی ایک عورت
کتنے دُکھوں کی اینٹیں چن کر گھر بنتی ہے
پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو
میں نے بھی اِک گھر ہے بنایا
رنگوں، پھولوں، تصویروں سے اس کو سجایا
دروازے کی لوح پہ اپنا نام لکھایا
لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو!
(امجد اسلام امجد)

حسنِ انتخاب: رضوانہ کوثر۔ لاہور

## قاصد

خوشبو کی پوشاک پہن کر
کون گلی میں آیا ہے!
کیا یہ پیغام رساں ہے
کیا کیا خبریں لایا ہے
کھڑکی کھول کے باہر دیکھو
موسم میرے دل کی باتیں، تم سے کہنے آیا ہے!
(امجد اسلام امجد)

حسنِ انتخاب: آصف زیدی۔ کراچی

## مجرم

جاناں! تم بھی
ایک قاتل ہو!
تم نے میرے اندر کا
ایک ہنستا ہوا
انسان مار ڈالا ہے!
(وصی شاہ)

حسنِ انتخاب: سعد گھلو۔ حیدر آباد

.....☆☆.....





سرور شاذ۔ منچن آباد

## کچھ لوگ

کچھ لوگ ہماری سانسوں کی گرمائش جیسے ہوتے ہیں۔ سانس کی طرح ہمارے ساتھ رہتے ہیں لیکن جب ہم اُن کے ساتھ رہنے کا سوچتے ہیں تو یہ ہمارے نہیں رہتے۔ کچھ لوگ ہماری صبح ہوتے ہیں، شام ہوتے ہیں لیکن رات نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ ہمارے من کی دھرتی کے آسمان پر چمکتے چاند، ستارے ہوتے ہیں۔ سورج ہوتے ہیں لیکن روشنی نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ ہمارا پہلا وعدہ ہوتے ہیں۔ ہمارا آخری وعدہ ہوتے ہیں لیکن درمیان میں کچھ نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ قسمیں ہوتے ہیں۔ قول و اقرار ہوتے ہیں لیکن پہلے جھوٹ کی طرح ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ہماری ڈائریاں، ہمارے خط، ہماری غزلیں، نظمیں، کہانیاں، ہمارے افسانے ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری سوچیں، ہمارے جذبات نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ باہر سے بڑے خوب صورت لیکن اندر سے بدصورت اور کچھ لوگ باہر سے بدصورت لیکن اندر سے بڑے خوب صورت ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ پہلے ہم جیسے ہی ہوتے ہیں۔ میلے کچیلے کپڑے والوں، دو وقت کی روٹی بڑی مشکل سے کھانے والے لیکن جب وہ کچھ امیر ہو جاتے ہیں، کار میں بیٹھ جاتے ہیں تو اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کچھ وقت کے لیے سیاست ہوتے ہیں، جلسے جلوس ہوتے ہیں، نعرے ہوتے ہیں، غریبوں کے غمگسار ہوتے ہیں، ان کے دُکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ غریبوں کی بات سنتے ہیں، ان سے پیار کرتے ہیں۔ ان سے جھک کر ملتے ہیں اور جب جیت جاتے ہیں تو بڑی بڑی گاڑیوں میں ہوتے ہیں۔ لاہور، اسلام آباد ہوتے ہیں اور کچھ لوگ قبروں جیسے ہوتے ہیں۔ سب کے لیے سانجھے، سب کے دکھ سنتے ہیں۔ سب کو بانٹتے ہیں، سب کے ساتھ ایک جیسا رویہ رکھتے ہیں۔ سب کے آنسوؤں کو خود میں جذب کرتے ہیں لیکن قبروں جیسے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ہماری آنکھوں جیسے ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہمیں ان کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہماری آنکھیں صرف ان کو دیکھتی ہیں اور ان کو روز پتہ نہیں کتنی آنکھیں دیکھتی ہیں اور یہ بھی چوری چوری ان کو دیکھ لیتے ہیں اور کچھ لوگ ہمارے دل میں چوری چوری داخل ہوتے ہیں جو کچھ چرانا ہوتا ہے، چراتے ہیں اور چوری چوری ہی نکل جاتے ہیں۔ ہم ان کے پیچھے دور تک جاتے ہیں لیکن یہ ہمیں نہیں ملتے۔ کچھ لوگ پہلا گناہ کر کے بڑا پچھتاتے ہیں اور بعد میں تو پچھتانا ہی بھول جاتے ہیں۔ ان کا نفس ان کے اندر گناہوں کی بھٹی لگا دیتا ہے اور یہ بھٹی پھر مرنے کے بعد ہی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ ہمارے منہ پر صاف لفظوں میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں تم سے کوئی محبت نہیں صرف ہمدردی ہے۔ کچھ لوگ میرے ایک دوست "پہلو" کی طرح کے ہوتے ہیں جو محبت کے سوا اس دنیا میں کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کرتے جس سے محبت کرتے ہیں، اس کی خاطر سب کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ماں، باپ، بہن بھائی، رشتے دار، دوست یار دنیا ان کو پتا نہیں کیا کیا کہتی ہے لیکن یہ کسی کو کچھ نہیں کہتے، بس چپ رہتے ہیں۔ کچھ لوگ دوسروں کی بہنوں کو چھیڑتے ہیں، ان کو بری نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کے گھر میں اپنی بھی بہنیں ہوتی ہیں اور ان کے اس فعل کی وجہ سے دوسرے بھی ان کو چھیڑتے ہیں۔ ان کو بری نظر سے دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ دوسروں کی بہنوں کو بری نظر سے نہیں دیکھتے کہ اپنی بہنوں کے چہرے سامنے ہوتے ہیں لیکن ان کی بہنوں کو سب بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ ہمیں صرف اس لیے نہیں ملتے کہ وہ دوسروں کو مل جاتے ہیں اور کچھ لوگ.....! اور کچھ لوگ.....! اگر

اس دنیا میں یہ کچھ لوگ نہ ہوتے تو یہ دنیا کیا ہوتی؟ کیسی ہوتی؟ شاید اس دنیا کی کوکھ بانجھ ہوتی۔ ویرانیاں ہوتیں، چٹیل میدان ہوتے۔ انسان کے لیے خدا نے اتنا کچھ اس لیے بنایا کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ انسان اس کے لیے کیا کرتا ہے؟ کیا بناتا ہے؟ دیکھ لیں انسان نے خدا کے لیے کیا کیا؟ اور کیا کر رہا ہے؟ اس کے پاس آج سب کچھ ہے، بس ایک خدا نہیں ہے۔ خدا کیوں نہیں ہے؟ اس لیے نہیں ہے کہ ان کے پاس جھوٹ، ریاکاری، منافقت، وٹے سٹے کی سیاست، دھرنے، لانگ مارچ، ناانصافی، بارود، بم دھماکے، جسم کو چھلنی کرنے والی گولیاں، لاقانونیت، روپے پیسے کی ہوس، ایوان، وزارتوں کی ہوس کے سوا ہے ہی کیا؟ خدا اب ان کے دل میں نہیں اپنے دل میں رہنے لگا ہے۔ آخر وہ خدا ہے، انسان تو نہیں.....!!

## حد ہوتی ہے

ارباب قربان علی ایری۔ بلوچستان

دنیا بدل چکی ہے لیکن ہم خود کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ ہماری خوشیوں کی کل بھی کوئی حد نہیں تھی اور ہم آج بھی جب خوشیوں میں مگن ہوتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں..... اور جب..... غم، دکھ، تکلیف میں ہوتے ہیں تو تمام ضروری کام کاج چھوڑ چھاڑ کر صرف دکھ، تکلیف کے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خوشیاں ملتی ہیں تو بے حد خوش ہوتے ہیں اور جب غم ملتے ہیں تو حد سے بڑھ کر افسوس کرتے ہیں۔ آخر ہم کب خوشی اور غم کو زندگی کا حصہ سمجھیں گے اور آخر ہم کب سمجھیں گے کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے!!

## ایک احساس

عائشہ صدیقہ ضمیر۔ کراچی

رات رفتہ رفتہ ڈھل رہی ہے۔ میں کمرے میں تنہا کسی گہری سوچ میں غرق ہوں ہاں قریب ہی میز پر ایمرجنسی لائٹ کی پراسرار روشنی میری تنہائی کو دور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ باہر ہر طرف تاریکی اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر ہر طرف سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ ہوا درختوں میں سیٹی بجا رہی تھی۔ یکا یک ہواؤں کا شور بڑھ گیا۔ بارش شروع ہو گئی تھی اور..... میں نے محسوس کیا۔ ایک نغمہ ایک ساز فضا میں گونج رہا ہے۔ جو بارش کے ننھے قطرے، نہیں بلکہ بوندوں اور ہواؤں کا مرہون منت تھا۔ میں جھوم اٹھی ایک انجانی کیفیت سے..... بارش خدا کی وہ رحمت ہے جو مردہ زمین کو بھی زندگی بخشتی ہے اور..... پس مردہ احساسات کو بھی حیات بخشتی ہے۔

## مجھے کہنے دو

زوبیہ شاذ۔ منچن آباد

عظیم مفکر خلیل جبران نے کہا تھا: ''آزادی کی راہ میں مرنا غلامی کے سائے میں جینے سے بہتر ہے۔'' ایک عرصہ بیت گیا آزاد ہوئے مگر غلامانہ ذہنیت سے ہم ابھی تک چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قوم میں وہ جذبہ ہی مفقود ہو کے رہ گیا ہے جو نئی نئی راہوں و منزلوں کا متلاشی تھا۔ زندگی کا مقصد جیسے فوت ہو گیا ہو۔ عجب نفسانفسی کا دور ہے۔ خود غرضی، حرص و طمع عروج پر ہے وہ جو مقدس جذبات تھے، کہیں میٹھی نیند جا سوئے۔ ہم دن بدن تنزلی کا شکار ہیں۔ کبھی پانی، کبھی بجلی، کبھی گیس کے لیے ہم سراپا احتجاج ہیں مگر ہمارے کرپٹ حکمرانوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہماری بے ایمانی ''ابلیس'' کو بھی مات دے رہی ہے۔ ہم مہنگائی کے عذاب میں دھنسی ہوئی قوم ہیں۔ کبھی ہم آٹا، چینی کے لیے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ہماری خودی کو زوال آ گیا ہے۔ کرپٹ حکمرانوں نے ہمیں یوں مہنگائی کے پنڈال میں لا پھینکا ہے کہ ہم کولہو کے بیل کی طرح اس کے گرد اگرد ہی گھوم رہے ہیں۔ ہمارے وہ ادارے جو فخر و غرور کا باعث تھے، آج ماتم گریہ زاری



کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پی آئی اے، ریلوے، اسٹیل ملز، کہاں کہاں کرپشن نہیں۔ آرمی جس پر ناز تھا، وہ بھی خالی ڈھول ثابت ہو رہی ہے۔ کوئی آتا ہے، اپنی مرضی سے آپریشن کر جاتا ہے۔ ہمارے ہی رکھوالوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ ڈرون حملے ہماری ملکی سلامتی کے خلاف اعلانِ جنگ ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ہم آزاد اور خود مختار ہیں۔ ہم یہ مان کیوں نہیں لیتے کہ ہم آج بھی غلام ہیں۔ ہم دشمن کو اپنا دوست سمجھ بیٹھے ہیں۔ ان کے کلچر کو اپنا رہے ہیں۔ ہمارے پرائیویٹ چینلز کر کیا رہے ہیں! ہم ہندو یلغار کو روکنے میں ناکام ہیں۔ ہم ان کی نقالی کر کے خود کو تہذیب یافتہ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ قومی و ملی یکجہتی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ حادثات ہمیں یکجا کرتے ہیں اور پھر حادثے کے بعد ہم منتشر نظر آتے ہیں، ہماری گردنوں میں جو غلامی کے طوق ہیں، ہم انہیں مزید مضبوط کر رہے ہیں۔ ریمنڈ ڈیوس، جاسوس اور سفاک قاتل کو ہم باعزت رہا کر سکتے ہیں۔ ہماری پہچان کیا ہے؟ ہمارے فلسفی، ادیب، شاعر کہاں ہیں۔ ہم چربہ سازی میں کیوں پڑ چکے ہیں؟ کیا ہمارے اذہان بنجر ہو چکے ہیں کہ ہم کچھ بھی اچھا تخلیق کرنے کے قابل نہیں رہے اور نقل آسان ذریعہ شہرت اپنا لیا ہے۔ کچھ تو سوچو، کچھ تو اپنا رہنے دو۔ اس ملک کی عظمت، وقار کس طرزِ زندگی میں ہے، کچھ تو فکر کرو۔ اس درخت (پاکستان) کی جڑیں یوں نہ کاٹو کہ پھر کوئی پودا، درخت، کونپل ہی نہ پھوٹ پائے۔ کچھ تو سوچو اس وطن کے لوگو!!

## بدحالی اور غربت

شفق شیکی۔ سیالکوٹ

غربت کی ماری زندگی بھی ایک بڑے عذاب اور بھیانک عفریت سے کم نہیں ہوتی۔ مرتی زندگی، بڑھتی افلاس، بھوک، بدحالی، بنیادی سہولیات کی قلت، بھرپور بیماریاں، سوکھے بدن، چاروں جانب پھیلی مجبوریاں اور گہری تاریکی..... کچے ذہنوں کی ناخواندگی..... حد سے بڑھتا ظلم..... ہر طرف بکھری ہوئی ننگی بھوک اور اندھیری غربت..... بکھری لاشیں..... ہماری معاشی بدحالی، جو گندے ڈھیر کی طرح ہر جگہ نظر آتی ہے..... ہمارے معاشرے میں، بدحالی بھوک اور حد سے تجاوز کرتی غربت کیوں لافانی ہے؟؟..... کیا بدمست ایوان کے ہاتھیوں کو یہ تڑپتی غربت نظر نہیں آتی.....؟؟

## انعام

عائشہ خورشید انور۔ کراچی

صبر و استقلال پر ثابت قدم رہنے کا انعام کیسے ملتا ہے، یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہمارے سامنے فلیٹ میں صبر کی صورت بنی ایک ایسی خاتون ایسی بہو اور ایسی ہی سب گھر کی اچھی بھابی اچھی بیوی ہونے کا ثبوت دینے والی جس نے بارہ سال تک اپنی کوکھ سے جنم دینے والے بچے کی راہ تکی جو بارہ سال کے بعد اس کے گلشن میں پھول بن کر آیا، زندگی میں خوشیوں کی بہار لایا۔ اس خاتون نے ایک یتیم بچے کی جو اس کی ساس کا بھتیجا تھا۔ دس ماہ کی عمر میں اپنے والد کے سائے سے محروم ہو گیا..... گھریلو نامساعد حالات کی بناء پر اس بچے کی پھوپی بچے کو اپنے ساتھ گھر لے آئیں اور اپنی بہو کی جھولی میں ڈال دیا اور رب کے آگے اپنا دامن بھی پھیلا دیا کہ اس یتیم بچے کی پرورش کے صدقے میں میری بہو کی گود ہری کر دے۔ اس بچے کی پرورش اس خاتون کی بہو نے بلکہ سب گھر والوں نے جی جان سے کی۔ اس بچے کو آنکھ کا تارا بنا کر رکھا۔ وہ ماں جس کی اپنی گود خالی تھی اس بچے کو پا کر اور اپنی سونی گود کو بھول کر اس بچے میں مگن ہو گئی اور اس کی پرورش میں دن رات ایک کر دیا۔ ایک ماں سے بڑھ کر اس کی خدمت و دیکھ بھال کی اس کا ہر طرح سے خیال رکھا اور آج اللہ نے پورے بارہ سال کے بعد اس کی سونی گود ہری

کردی۔ ایک ایسا انعام جو عورت کو دنیا میں معتبر کرتا ہے۔ اس کو رب تعالیٰ نے عطا کیا۔ یہ ایک جیتا جاگتا آنکھوں دیکھا اپنے رب کا عطا کیا ہوا انعام میں نے دیکھا ہے ایسے کتنے ہی انعامات سے وہ اپنے بندوں کو نوازتا ہے کہ بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں اس کا قرب اور اس کا انعام پانے کے لیے بندے کو صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھنا ہے۔ یہی میرے رب کا حکم ہے جو آج انعام کی صورت میں سامنے والی بھابی کو ملا۔

## دوستی کا رشتہ

کرن شبیر۔ کراچی

جب کوئی دوست بنتا ہے تو زندگی خوب صورت اور کتنی پیاری لگتی ہے! دوست ہمارے دکھ درد بانٹتا ہے۔ ہماری خوشیوں میں شامل ہو جاتا ہے اور جینے کی راہ دکھاتا ہے۔ دوست تو دن بنائے بھی بن جاتے ہیں لیکن ایسا دوست ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا جو اپنوں کی طرح چاہنے لگے' پیار دے کیونکہ دوستی' خلوص' پیار' محبت اور اعتماد کی پیاس ہوتی ہے لیکن جب کوئی دوستی کی آڑ میں کسی کو دھوکا دیتا ہے اور اعتماد کو ٹھیس پہنچاتا ہے تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟ جی ہاں! دل پھول کی طرح مُرجھا جاتے ہیں۔ یاد رکھو! جب تم کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ' کسی کو اپنا بناؤ تو اس کے دکھ بانٹ لو۔ اسے اپنی ہر خوشی میں شامل رکھو۔ اتنا پیار دو کہ دوستی جیسے مقدس رشتے پر کوئی آنچ نہ آئے کیونکہ دوستی کا رشتہ خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

## یادیں

محمد ناصر۔ کراچی

یاد بھی قبر کی مانند ہوتی ہے جس میں ماضی دفن ہوتا ہے۔ یہ بھی کیا عجیب شے ہوتی ہے۔ جب یہ وارد ہوتی ہے تو خون کے آنسو رلاتی ہے اور یہی یادیں اسے زندہ رہنے پر مجبور بھی کرتی ہے۔ انسان کا نام ان سے ایسا منسلک ہو کر رہ جاتا ہے جیسے پھول سے خوشبو' دیئے سے روشنی' آنکھ سے آنسو اور ہونٹوں سے آہیں! ان یادوں کے شکنجے میں انسان کی شخصیت محصور ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب بچھڑے دوست کی یاد ستاتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے واقعی کچھ کھویا ہے اور پلکوں سے اشک اٹھانا محال ہو جاتا ہے۔ انسان کو اپنی ہر خواہش دم توڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کی کیفیات یکسر بدل جاتی ہیں۔ بچھڑے ہوئے دوست کی یاد کبھی تو روشنی کے دیپ بن کر راتوں کو منور کرتی ہے اور کبھی اس سے بچھڑنے کا احساس ناقابل برداشت ہو جاتا ہے اور انسان اس آس پر وقت کی دہلیز پر بانہیں کھولے کھڑا ہوتا ہے کہ شاید..... شاید وہ بچھڑا دوست پھر سے آن ملے مگر یہ ممکن ہی کہاں ہوتا ہے۔ وقت بھی کتنا ظالم ہے کہ گزرتا ہی چلا جاتا ہے اور اتنا انا پرست بھی کہ پلٹ کر دیکھنا اسے کسی طور پر بھی گوارہ نہیں ہوتا۔ وقت کو ان یادوں سے کیا مطلب؟ وہ دردِ دل کو کہاں محسوس کرتا ہے۔ پھر اچانک ایک ایسا موڑ آتا ہے کہ انسان وقت کا مرہم اپنی روح پر رکھ کر پھر خود ہی اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ شاید وقت کی بارش نے تمام راستے بند کر دیے ہیں اور میرا بچھڑا دوست میری طرف آنے والے ہر ایک راستے کو بھول گیا ہے۔ وہ بچھڑ کر بھی میرے ساتھ رہے گا ایک یاد بن کر تا زیست میری روح کو تڑپانے کے لیے۔ انسان بھی کتنی بے بس شے ہے۔ یادوں کے بلند و بالا حصار میں اس کی شخصیت مقید ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان بچھڑے دوست کی گفتگو' دلنواز باتوں کو یاد کر کے تڑپتا ہے۔ انسان پچھتاتا ہے کہ ایک بے وفا ہی کیوں اس کا انتخاب تھا۔ پھر وہ بچھڑے دوست کی یاد میں دنیا سے چھپ چھپ کر تنہائی میں اشک بہاتا ہے۔

☆☆



# اے زندگی.....!

رضیہ ناز

اے زندگی.....!
کہیں تو مل
کبھی تو مل
دیکھنا چاہتی ہوں
تو کتنی خوبصورت ہے
کتنی حسین ہے
لوگ کہتے ہیں
بلکہ
سارا زمانہ کہتا ہے
تو بڑی ہی حسین ہے
کومل سی' نازک سی
جبھی تو
سب تیرے دیوانے ہیں
تجھے چاہتے ہیں
سب پاگل ہیں' دیوانے ہیں
لیکن
میں نے تجھے
بہت قریب سے دیکھا ہے
نا..... نا..... گھبراتی کیوں ہے؟
سن میرے دل کی آواز
تری اصلیت کیا ہے؟
تو بڑی بھیانک ہے
بڑی ظالم ہے
بڑی ہی بے درد ہے
تو لوگوں سے
کھیلتی ہے
اُن کو تڑپاتی ہے
رُلاتی ہے
اور دور کھڑی
اُن کی بے بسی پر
مسکراتی ہے
اے زندگی.....!!
تُو موت سے بھی
زیادہ بھیانک
اور
ظالموں سے زیادہ ظالم ہے
بڑی خود غرض ہے
موت کو دیکھتے ہی
اپنی راہ سے ہٹ جاتی ہے
اُس کو راستہ بتاتی ہے
کہ وہ
لوگوں کا دل
نکال کر لے جائے
اور
تُو کھڑی دیکھتی رہے
ہنستی رہے
لیکن
اے زندگی.....!
ایک دن
یہ مکافاتِ عمل
تیرے ساتھ بھی ہونا ہے
اور تیری دوست کے ساتھ بھی
موت کو بھی موت آنا ہے
اور تجھے بھی!
پھر
اے زندگی.....!
تجھے چھپنے' بھاگنے کا
کوئی راستہ نہ ملے گا
آج اور کل' فرق ہی کیا ہے

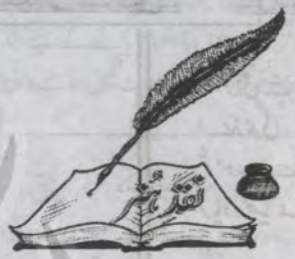


## گمشدگی

میں مسکراتی آنکھوں سے
دنیا میں
زندگی ڈھونڈتا ہوں
مگر نہ جانے کیوں؟
مرا دل
غموں میں کھو جاتا ہے
کہیں گم سا ہو جاتا ہے

اشعر جواد۔ کراچی

## مکڑی

لڑکیاں تو مکڑی جیسی ہوتی ہیں
ذرا سا آسرا ملے
کہیں بھی کونا ملے
جھٹ خواب بننے لگتی ہیں
بُن کر ارد گرد خوابوں کے ہالے
کچے دھاگوں کے جالے
خوش ہوتی ہیں
کمزور بنا ہوں میں
خود کو مضبوط سمجھتی ہیں
جالوں کے، خوابوں کے بھروسے
زندہ رہتی ہیں
لڑکیاں مکڑی جیسی ہوتی ہیں

صفیہ سجل شاہ۔ لاہور

## خدا کرے

چل مان لیا
میری وفا
فریب تھی
دھوکہ تھی
میری وفا پہ خاک ڈال
تجھ سا ہی کوئی
باوفا
تجھ کو ملے
خدا کرے!

ثانیہ بھٹی۔ سیالکوٹ

## تقدیر

یہ شکوہ، یہ شکایت!
کیوں ہے، اَب ہر گھڑی!
میں تو اپنی تقدیر سے
بار بار ہوں لڑی!

روما محمود۔ اسلام آباد

## گہرائی

دل کی گہرائی میں اُتر کر دیکھا
خیالوں کے صحرا سے گزر کر دیکھا
سوچوں کے نہاں خانوں میں بکھر کر دیکھا
خواہشوں کے جنگل میں سفر کر کے دیکھا
آسمان کی وسعتوں کو نظر بھر کے دیکھا
لیکن.....
ماں کی ممتا جیسی گہرائی
مجھے کہیں نظر نہ آئی

جاوید عثمان زندانی۔ کراچی

## اوس

سنو!
ہمدم!
تم
اداس نہ ہوا کرو
کہ
اس طرح
میرے مَن کی زمین پہ
غم کی اوس
گرتی رہتی ہے

زوبیہ شاذ۔ منچن آباد

## عادت

اب تو عادت سی ہو گئی ہے
کہ تجھے بھولنے کی آرزو میں
مسلسل یاد کیے جا رہا ہوں

کرن شبیر۔ کراچی

## آباد

وہ مجھے یاد نہیں کرتا
ہاں مگر!
یہ بھی سچ ہے کہ.....
اس کے خیالوں میں
آباد ہوں میں!!

ماریہ جلال۔ کراچی

## ملاقات

رات ڈھل چکی ہے
ستارے جاگ رہے ہیں
چاند نکل رہا ہے
تم
ملنے سے گریزاں نہیں
دُور
بہت دُور
بہت دُور ہو
شاید اس لیے
میں خیال میں
تمہارے سراپا کو
بانہوں میں چھپائے
سینے سے لگائے
خود سے
مل رہا ہوں

سرور شاذ۔ منچن آباد

# پسند اپنی اپنی

## قارئین کے پسند کردہ اشعار' ادبی ذوق کے آئینہ دار

ملک صفدر عباس اعوان..... جہانیاں
دور رہ کر بھی ہے ہر سانس میں خوشبو تیری
میں مہک جاؤں جو تو پاس بلا لے مجھ کو
ثوبیہ قیوم..... گلشن اقبال' کراچی
کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے' اتنا ہی وہ خاموش ہے
عمران ہارون چھوٹانی..... کراچی
بیٹھ جاتا ہوں خاک پر اکثر
اپنی اوقات اچھی لگتی ہے
کرن شبیر..... کراچی
جرم آدم نے کیا اور نسلِ آدم کو سزا
کاٹنا ہے زندگی بھر میں نے جو بویا نہیں
بشیر احمد بھٹی..... بہاول پور
ہر سانس' ہر قدم موت کی جانب ہے گامزن
سالگرہ منانے کے موت کی قربت کا جشن مناتے ہیں لوگ
محمد آصف ریاض..... جھنگ صدر
عشق کے بھی اصول ہوتے ہیں
روٹھ جاؤ' نہیں منائیں گے
نسیم سکینہ صدف..... ڈسکہ
ٹوٹا ہوں اتنی بار تیرے ہجر میں یہاں
اب تو لبوں پہ کوئی دُعا بھی نہیں رہی
ماہم علی..... کوئٹہ
خیالوں میں وہ جب رہتا بہت تھا
یہ دل اُس وقت بھی تنہا بہت تھا
کوثر اسلم..... اسلام آباد
محبت لائے اب سوغات کوئی
بدل دے صورتِ حالات کوئی

محبِ انتظار..... حیدر آباد
دراڑیں پڑ گئیں چہرے پہ کتنی
کہا تو تھا تمہیں اتنا نہ سوچو
ایم سعید انور سعید..... پنجاب
کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا
کوثر سعید..... لاہور
کتنا دشوار تھا سفر دل کا
تجھے پانے کو جاں سے گزری ہوں
آسیہ نزاکت..... لاہور
جواز ٹوٹ گیا ہے مگر تعلق کا
اک اہتمام وضع داریوں میں رکھا ہے
نادیہ طارق..... کراچی
جب لوگوں کو مل کر رہنا آئے نہیں
بیچ سے آنگن اور گھر کاٹنے پڑتے ہیں
زین ظہور..... کراچی
ہم اپنے اپنے تذبذب کے ساتھ زندہ ہیں
سو زہر بانٹ رہے ہیں نئی دواؤں کے ساتھ
صبیحہ بانو..... چیچہ وطنی
میرا دشمن بھی مرے دل میں اتر سکتا ہے
اپنے اندر کوئی دیوار اٹھاتا نہیں میں
تمثیلہ لطیف..... بلوچستان
آدمی تھا' خدا بنا دیا ہے
عشق نے کیا سے کیا بنا دیا ہے
صفیہ سلطانہ..... جیکب آباد
جھڑتے نہیں پھول اب لبوں سے
رُت آئی ہے کیسی مفلسی کی



اظہر حبیب..... کراچی
جانے کس لمحہ تسخیر میں تُو مجھ سے ملا
اب تو جس شے کو بھی چھولوں' تیری مہکار آئے
سلطانہ فہیم..... کراچی
وہ بھی چپ' میں بھی چپ' گفتگو بھی مبہم
ایک ہی راہ پر ہم چلے ہیں الگ
اظہر خان..... لاہور
سچ کے ہر آئینہ خانے میں قدم رکھنا ہے
ہم جو زندہ ہیں تو ہونے کا بھرم رکھنا ہے
سفیر..... وزیر آباد
پرندے لوٹ رہے ہیں نشیمنوں کی طرف
اور انتظار میرا کر رہی ہے گھر کی شام
بدر سعید..... لاہور
سیاہ رات کے آنچل پہ شبنمی بوندیں
حیات پھر سے کہیں سوگوار ہے شاید
عادل گلزار..... فیصل آباد
جو سائبان کے نیچے کھڑا ہو بارش میں
وہ تیز دھوپ میں جینے کا درس کیا دے گا
راشدہ اعجاز..... کراچی
ہوا چلے گی تو خوشبو میری بھی پھیلے گی
میں چھوڑ آئی ہوں پیڑوں پہ اپنے ہاتھ کے رنگ
زبیدہ اکرام..... کراچی
میں اس سے روٹھنا چاہوں بھی کیسے
کہ وہ میرے لیے مجھ سے لڑا ہے
راحت خان..... ایبٹ آباد
وفا سرشت ہوں' دوری میں بھی محبت ہے
اکیلے رہنے میں لیکن بڑی اذیت ہے
سائرہ زین..... کراچی
سایہ نہیں ہے دور تک سائے میں آئیں کس طرح
ہم آ گئے ہیں کس طرف تم کو بتائیں کس طرح

رابیل حنا..... رانی پور
محاذِ ہجر پہ ہم دونوں تندہی سے لڑے
سو ایک مارا گیا' ایک مرنے والا ہے
نیہا..... کراچی
ہماری دوستی بھی اثر رکھتی ہے فراز
یاد آئیں گے بہت ذرا بھولو تو سہی
صدف آصف..... کراچی
میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں
صائمہ ظہیر..... شاہ فیصل' کراچی
آپ اپنے رقیب ہوتے ہیں
اہلِ دل بھی عجیب ہوتے ہیں
رخسانہ..... کراچی
نہ دعا نہ سلام' کیوں انجان ہیں آنکھیں
لگتا ہے غیروں پہ مہربان ہیں آنکھیں
روبی..... کوئٹہ
یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا
دیبک..... پنڈی
پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو
نیلم رانی..... سرگودھا
نہ غبار میں نہ گلاب میں مجھے دیکھنا
مرے درد کی آب و تاب میں مجھے دیکھنا
سونیا اقبال..... کراچی
ہوا کو ہم سفر لکھا' نصیب اپنا سفر لکھا
مقدر لکھنے والے نے کہاں کب مختصر لکھا

.....☆☆.....

نوٹ: اب شعر کے ساتھ شاعر کا نام لکھنا ضروری نہیں۔ اچھے اور معیاری اشعار ارسال کریں۔

# آپ کی خبر

## محفلِ میلاد

☆ ہمارے دوست قاری اسماعیل بٹ نے ۲۴/ جنوری ۲۰۱۳ء کو سالانہ محفلِ میلاد کا انعقاد کیا۔ اس نُورانی محفل میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور رُوحانی فیوض و برکات حاصل کیے۔ بعد نمازِ ظہر خواتین کی محفل نورِ محل، ٹوکے والا چوک پر ہوئی جس میں ۸/ عدد واشنگ مشینیں بھی قرعہ اندازی کے ذریعے حاضرین میں تقسیم کی گئیں جبکہ مردوں کی محفل بعد نمازِ عشاء ناظم آباد میں منعقد ہوئی۔

## سانحۂ ارتحال.....

◆ ہماری رائٹر نصرت سرفراز کے خالو محمد عامل ۱۲/ فروری ۲۰۱۳ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے۔ قارئین سے بھی خصوصی گزارش ہے کہ حسبِ توفیق دُرود شریف پڑھ کر مرحوم کو ایصالِ ثواب کریں۔

◆ ہمارے دیرینہ ساتھی ایم سعید انور سعید کی ہمشیرہ کی ساس صاحبہ قضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل اور اس پر اجرِ عظیم عطا کرے۔ (آمین!) قارئین سے بھی دُعا کی خصوصی درخواست ہے۔

◆ ہمارے ادارے کے اکاؤنٹنٹ طاہر صدیقی کی دادی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ غم کی ان گھڑیوں میں ہم سب اپنے اس کولیگ کے ساتھ ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل دے۔

## کتاب خبر.....

📖 ہماری دوست لکھاری فوزیہ احسان رانا کا خوبصورت افسانوی مجموعہ ''موسم کو بدلنے دو'' خزینۂ علم و ادب کے تحت شائع ہو چکا ہے۔ اس اچیومنٹ پر ہم فوزیہ کو تہہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں اور ان کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہیں۔

## سالگرہ مبارک .....

☆ کوثر سعید کے بھانجے احمد کی سالگرہ 14 فروری، بھتیجے محمد سلیم کی یکم جنوری اور بھتیجی فائزہ کی چار جنوری کو منائی گئی۔ ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن تینوں بچوں کو صحت و سلامتی اور خوشیوں کے ساتھ لمبی عمر عطا کرے۔ (آمین!)

## مبارک باد.....

☆ پچھلے دنوں ہماری بہت پیاری لکھاری و قاری تحسین جونیجو کی بہن شائستہ جبیں جونیجو کی منگنی طارق زمان جونیجو سے ہوئی۔ خوشی کے اس موقع پر ہم جونیجو سسٹرز کو ڈھیروں مبارک باد دیتے ہیں اور دُعا گو ہیں کہ جلد ہی یہ جوڑا نکاح کے مقدس بندھن میں بندھ جائے۔ (آمین!) شائستہ جبیں 11 اپریل کو اپنی سالگرہ بھی منا رہی ہیں، اس کے لیے بھی بہت بہت مبارک باد۔

☆ ہمارے دیرینہ دوست محمد سلیم خان اور بیگم سعدیہ سلیم کی صاحب زادی مریم سلیم کا داخلہ ماما پارسی گرلز سیکنڈری اسکول میں ہوا ہے۔ ہماری دُعا ہے کہ شاہراہِ علم پر سفر کرتے ہوئے اِس ذہین و فطین بچی کو ہمیشہ کامیابیاں ملتی رہیں۔ (آمین!)

☆ ہمارے پیارے دوست، ساتھی اور ادارے کے اسسٹنٹ منیجر مارکیٹنگ بوبی کے ہاں 11 فروری 2013ء کو ایک خوبصورت بیٹے کا جنم ہوا ہے۔ نومولود کا نام سبحاش مہشوری رکھا گیا ہے۔ خوشی کے اس موقع پر ہماری طرف سے بوبی کو ڈھیروں ڈھیر مبارک باد۔ دعا ہے کہ خدا اس بچے کو صحت و سلامتی اور خوشیوں کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے۔



## شادی مبارک.....

ہماری سینئر رائٹر اور ادارہ ''سچی کہانیاں'' کی دیرینہ ساتھی رضیہ زمان صاحبہ کی پوتی شرمین خان کی شادی خانہ آبادی گزشتہ دنوں خانِ عالم کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اس خوشیوں بھرے موقع پر ہم رضیہ زمان صاحبہ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ اِس نئے نویلے جوڑے کو زندگی کی تمام خوشیاں عطا فرمائے۔ (آمین!)

دلہن شرمین خان اور دولہا خانِ عالم اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ

## شادی مبارک.....

14 فروری 2013ء کو کوثر سعید کی بھانجی کی شادی کی خوشیوں بھری تقریب ہوئی۔ اس پُرمسرت موقع پر نئے نویلے جوڑے کو اپنی زندگی کی نئی شروعات کرنے پر ہماری طرف سے ڈھیروں مبارک باد قبول ہو۔

## دعائے صحت.....

☆ ہمارے ساتھی ایم سعید انور سعید کے کزن طارق محمود گردوں کے امراض میں مبتلا ہیں۔ ہر تین دن بعد ان کا ڈائلیسز کیا جاتا ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ ان کو اپنی خصوصی دُعاؤں میں یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت عطا فرمائے۔

☆ ہماری بہت پیاری ساتھی کوثر سعید کی بھابھی ہیپاٹائٹس جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا انجیکشن کا کورس جاری ہے، تمام قارئین سے مریضہ کی صحت کاملہ کے لیے خصوصی دُعا کی گزارش ہے۔

.....☆☆.....

# قدرت کی فیاضی

قدرت نے جس فیاضی کے ساتھ ہماری ارضِ وطن کو مختلف نعمتوں سے مالا مال کیا ہے' اس کے لئے ہم جتنا بھی رب جلیل کا شکر ادا کریں' کم ہے۔ اس نے ہمیں زمین دی ہے تو زرخیز۔ پہاڑ دیئے ہیں تو معدنیات کے خزانوں سے معمور۔ صحرا عطا فرمائے ہیں تو قسم قسم کے ذخائر سے بھرپور اور دریا زمینوں کو سیراب کرنے والے۔ مختصر یہ کہ ارضِ وطن کی کوکھ سے سونا' تانبا' کوئلہ' تیل اور گیس بھی برآمد کی جارہی ہے اور زیرِ کاشت زمینوں سے ہر قسم کی اجناس بھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وطن عزیز میں ان محنت کش ہاتھوں کی بھی کمی نہیں جو زمین کا سینہ چیرنے' سمندری لہروں سے نبرد آزما ہونے اور دریاؤں کی روانی پر قابو پانے کے مشاق ہیں۔ یہی وجہ ہے اس خطہء زرخیز میں وعدوں کی کاشت بھی خوب زوروں پر ہے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ حکمرانوں کو اپنے وعدوں پر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا ملک ہو جو وعدوں کی پیداوار میں خود کفیل ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا تاکہ میرے علم میں بھی اضافہ ہو۔

سہام مرزا مرحوم نے یہ اداریہ ماہنامہ دوشیزہ میں نومبر 1994ء میں لکھا؟ یہ اداریہ یہ سوچ موجودہ دور کا عکاس نہیں؟